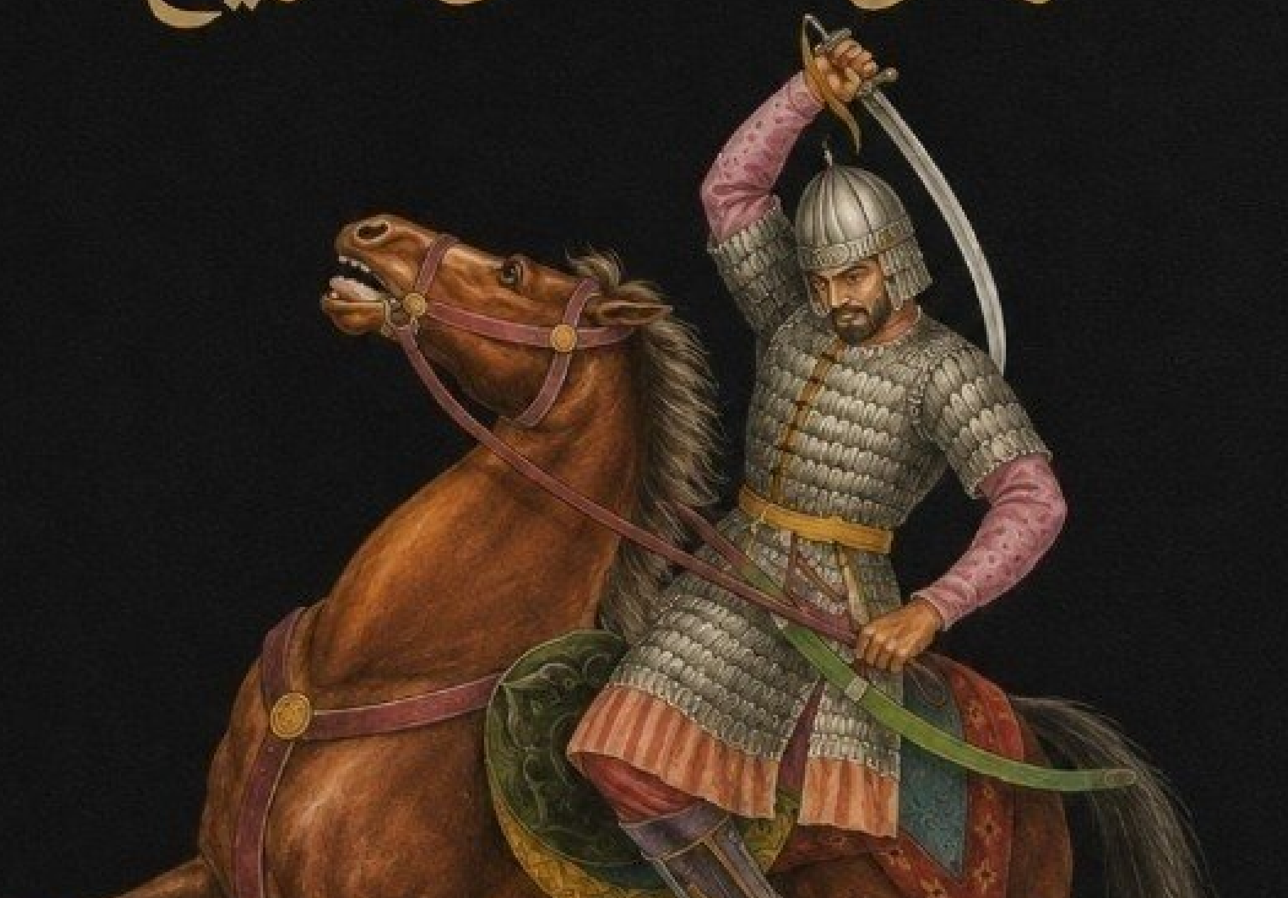
HISTORY OF THE

LODI SULTANS

OF DELHI AND AGRA

دہلی اور آگرہ کے

لودھی افاغنہ کی تاریخ



A HALIM

مترجم

نادیہ عنبر لودھی

دہلی اور آگرہ کے لودھی سلاطین کی تاریخ

(HISTORY OF THE LODI SULTANS OF DELHI AND AGRA)

By

Dr Abdul Halim

مترجم

نادیہ عنبر لودھی

سو پشت سے ہے پیشہ آباء سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

غالب

یہ کتاب ڈاکٹر عبد الحلیم (ڈھاکہ بنگلہ دیش) کا پی۔ایچ۔ڈی کا تھیسز ہے۔ جس کا میں نے اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

HISTORY OF THE LODI SULTANS OF DELHI AND AGRA

دہلی اور آگرہ کے لودھی سلاطین کی تاریخ

مصنف: عبد الحلیم، ایم۔ اے، پی-ایچ-ڈی

ادارہ ادبیاتِ دہلی ۲۰۰۹، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶ انڈیا

ادارہ ادبیاتِ دہلی ۲۰۰۹، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی۔ ۶ انڈیا

دوبارہ اشاعت: دہلی، ۱۹۷۴ء

قیمت: ۴۰.۰۰ روپے

ہندوستان میں شائع ہوئی

مترجم

نادیہ عنبر لودھی، ایم اے اردو: پنجاب یونی ورسٹی لاہور

ملازمت: خبریں مانچسٹر یو کے ۲۰۱۶ تا حال

تصنیفات: شب غم کا جوش

تعاقب میں خواب

گمراہ اور دوسری کہانیاں

معاصر اردو شاعرات

زیر طبع کتب

خاک دان ناول

اردو کی خواتین ناول نگار

معاصر اردو شاعرات حصہ دوم

اے حقیقت منتظر تصوف

رہائش: راولپنڈی، پاکستان

اشاعت: جون، ۲۰۲۶

انتساب

اپنے مرحوم اور شفیق والد مولوی عبدالحی کی یاد کے نام جنہوں نے
اس کتاب کی تیاری میں میری مدد کی اور مجھے حوصلہ بخشا۔

عبدالحلیم، پی۔ایچ۔ڈی اسکالر

فہرست

تمہید

لفظ لودھی پشتو زبان کے دو الفاظ "لوئے" (جس کے معنی بڑا/ عظیم ہیں) اور "دھا" (جو دھا/ دا سے مشتق ہے) سے مل کر بنا ہے. ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے "لوئے دھا" سے "لودی" اور پھر "لودھی" بنا. یہ پشتون/ افغانوں کا ایک مشہور قبیلہ ہے. لودھی کے لغوی معنی "بڑا شخص" یا "اعلیٰ شخصیت" کے ہیں۔ تاریخی تناظر میں، یہ پٹھانوں (افغانوں) کے ایک بہادر فرقے یا قبیلے کا نام ہے، جس نے ہندوستان پر حکومت کی۔

ایک تحقیق کے مطابق پٹھان/ افغان بنی اسرائیل کا گمشدہ بارہواں قبیلہ ہے۔ جو چراگاہوں کے کی تلاش میں اور معاش کے حصول کے لیے ہجرت کرتے کراتے کوہ سلیمان افغانستان میں جا کر آباد ہو گیا۔ اس تحقیق کے لیے وہ زبان کو بھی بنیاد بناتے ہیں پشتو زبان میں عبرانی زبان کے کافی الفاظ ہیں۔ افغانستان چونکہ بے آب و گیاہ علاقہ ہے۔ لہذا یہ لوگ ہندوستان کا رخ کرنے لگے۔ جہاں تجارت کی بڑی وسیع منڈیاں تھیں۔ یہ افغان مختلف ذیلی قبیلوں جن کے نام خلجی، سوری، برکی شیروانی، لودھی، نیازی، خاکوانی، بارکزئی، ملے زئی، غلے زئی، اورکزئی، یوسفزئی، آفریدی، خٹک، مہمند، درانی، ترین، اردو، بنگش، قزلباش، کاکڑ، سدوزئی، تنولی وغیرہ وغیرہ کے ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ بی بی متو کو لودھی پٹھان/ افغان کی والدہ کہا جاتا ہے۔ بی بی متو کی اولاد میں سے ہی بڑے پشتون قبیلے بنے۔ جن کی ان کو مادرِ امجد (ماں) مانا جاتا ہے۔ بی بی متو پشتونوں کے جدِ امجد قیس عبدالرشید کے بیٹے بٹن (یا بیٹ بابا) کی بیٹی تھیں۔ شاہ حسین غوری جو مہمند غوری پشتون پٹھان تھا۔ وہ غور سے آیا تو اس نے ایک قبیلہ بٹنی میں پناہ لی۔ اس کی شادی مہاجرت کے دوران شیخ بیٹ بابا کی بیٹی سے ہوئی۔ جس سے دو فرزند غلجی اور لودھی پیدا ہوئے۔

تو ان سے دو قبیلے۔ غلجیؒ و لودھی بنے۔

میری تحقیق کے مطابق سلطان بہلول لودھی کا سلسلہ نسب حضرت یعقوب کے صاحبزادے اور حضرت یوسف کے بھائی حضرت بن یامین سے جا ملتا ہے۔ آپ کا نسب نامہ ۶۰ پشتوں بعد حضرت یعقوب سے جا ملتا ہے۔

لودھی حکمرانوں میں سکندر لودھی عالم دین، شاعر، مدبر، سیاستدان، عادل حکمران ہونے کے ساتھ ساتھ خدا ترس انسان اور رعایا کا نگہبان تھا۔ سکندر لودھی فارسی زبان میں شاعری کیا کرتا تھا۔ سکندر لودھی کا تخلص گل رخی تھا ہندو مورخ رام ناتھ شرما اپنی تصنیف ہسٹری آف ایجوکیشن ان انڈیا میں لکھتا ہے کہ سکندر لودھی خاندان لودھی کا دوسرا اور سب سے کامیاب حکمران تھا وہ ایک فارسی شاعر بھی تھا اور اس نے نو سو اشعار پہ مشتمل اپنا فارسی کا دیوان مکمل کیا۔

سکندر لودھی علم و ادب کا رسیا تھا۔ اس نے حکام کا انتخاب ذاتی قابلیت کی بنا پہ کیا۔ لہذا اعلی مناصب کے حصول کے لیے ہندوؤں نے فارسی زبان سیکھنا شروع کر دی۔ سکندر لودھی کے کتب خانے کا ہر طرف چرچا تھا علم طب پر سنسکرت اور عربی زبان کی مشہور کتابیں ترجمہ کروا کے کتب خانے میں رکھی گئی۔ اس کے علاوہ بھی مملکت میں بے شمار کتب خانے بنائے گئے۔ سکندر لودھی کی علم و ادب سے محبت کی وجہ سے آگرہ شیراز ہند کہلانے لگا ۔چودھویں اور پندرہویں صدی میں ہندو اور فارسی کا اتحاد موجودہ اردو کا نقطہ آغاز تھا۔ جس میں ایک بڑا حصہ اس وقت کے حکمران سکندر لودھی نے ڈالا تھا۔

یہ (تھیسز) چند برس قبل میری نظر سے گزرا تھا۔ یہ میں نے ہندوستان کی مشہور زمانہ ادبی ویب سائٹ ریختہ پر دیکھا تھا۔ اس کا مطالعہ کیا تھا۔ اس وقت یہ ارادہ کیا تھا کہ اگر زندگی نے مجھے مہلت دی۔ تو میں اس کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ کروں گی۔ الحمد للہ اس کوشش میں اللہ نے کامیابی دی اور یہ ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ کتاب تھیسز ہونے کے باوجود خاصی دلچسپ ہے۔ڈاکٹر عبدالحلیم نے اسے بہت محنت سے لکھا ہے۔ مواد کی دستیابی کے لیے انہوں نے بے شمار کتب کا مطالعہ کیا ہے۔ جن کے حوالے کتاب میں جگہ جگہ پر موجود ہیں۔ تاریخ ہمیشہ سے میرا پسندیدہ مضمون رہا ہے۔

قرۃالعین حیدر کی سوانح عمری کار جہاں دراز ہے کی دوسری جلد میں پٹھانوں سے متعلق تعریفی جملے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ انہوں نے پٹھانوں کی شجاعت کو شیروں سے تشبیہ دی ہے۔ قرۃالعین حیدر کا افسانہ حسب نسب پٹھان / افغان قوم کی عادات، مزاج، رسوم ورواج پر بہت اچھی تحریر ہے۔ اسلاف کی روایات آج کے دور میں اہم نہیں رہی ہیں۔ پیسے کی ہوس اور جدت کا اتباع انسانی زندگی کو بہت تبدیل کر چکا

ہے۔ہر شخص وقت کی کمی کا رونا روتا ہے۔ایسے میں جب کتاب سے ہی رشتہ کمزور ہو چکا ہے۔تو اسلاف کے کارنامے پڑھنے کا کس کے پاس وقت ہے۔اس امید کے ساتھ کہ یہ ترجمہ اردو زبان و ادب پڑھنے والوں کے لیے مفید ثابت ہو گا۔

آپ کے آراء کی منتظر

نادیہ عنبر لودھی

ریذیڈنٹ ایڈیٹر

خبریں مانچسٹر یو کے

nadiaumberkhanlodhi@gmail.com

مقالہ نگار کا تعارف

ڈاکٹر عبدالحلیم (۱۹۰۵-۱۹۷۲) مورخ اور ماہر موسیقی تھے۔ وہ کومیلا ضلع کے داؤد کنڈی کے گاؤں غازی پور میں 1905 میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اور دادا دونوں ہی فارسی زبان کے ماہر تھے اور ڈھاکہ شہر میں زبان کی تدریس میں مصروف تھے۔ڈاکٹر عبدالحلیم نے 1921 میں ڈھاکہ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔انہوں نے ۱۹۲۳ میں ڈھاکہ انٹرمیڈیٹ کالج سے آئی اے کا امتحان پاس کیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی سے تاریخ میں آنرز (1926) میں اور ایم اے (1927) میں کرنے کے بعد عبدالحلیم نے 1928 میں اسی کالج میں بطور لیکچرار ملازمت کی۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔انہوں نے ۱۹۳۸ میں سرجادوناتھ سرکار (۱۸۷۰-۱۹۵۸) کی نگرانی میں اپنا مقالہ دہلی اور آگرہ کے لودھی پٹھان سلطانوں کی تاریخ پر لکھا۔ ۱۹۴۷ میں تقسیم ہندوستان کے بعد ڈاکٹر عبدالحلیم نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت کرلی۔عبد الحلیم ایک ممتاز قرون وسطیٰ کے ماہر تھے۔ ان کی کتاب ہسٹری آف لودھی سلطانز آف دہلی اینڈ آگرہ (ڈھاکا یونیورسٹی) کے عنوان سے ہے۔جو کہ ابتدائی قرون وسطی کی تاریخ کے لیے ایک اہم دستاویز ہے۔اے حلیم کلاسیکی موسیقی کے قابل اسکالر تھے۔ ان کی ہند پاک موسیقی کی مختصر تاریخ موسیقی کی تاریخ میں ایک اہمیت کی حامل کتاب ہے۔۔۔

ڈاکٹر آئی۔ ایچ قریشی کا لکھا ہوا پیش لفظ

یہ اے حلیم صاحب کا تھیسز کا مقالہ ہے۔ جس پر انہیں تاریخ کے مضمون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔ اے حلیم علی گڑھ یونیورسٹی سے لیکچرار کی حیثیت سے وابستہ تھے۔ یہ مقالہ انہوں نے ۱۹۳۸ میں علی گڑھ یونی ورسٹی میں سر جودھے ناتھ سرکار کی نگرانی میں تیار کیا۔ یہ مقالہ اے حلیم نے اپنے والد کے نام انتساب کیا ہے۔ جو کہ فارسی زبان کے ماہر تھے۔ مقالے کے موضوع کے انتخاب کی ترغیب اے حلیم کو ان کے والد نے دی تھی۔ اے حلیم نے اس مقالے کو لکھنے کے لیے فارسی سیکھی اور مخطوطات سے بھی مدد لی۔ اے حلیم ڈھاکہ یونی ورسٹی سے تاریخ کے استاد کی حیثیت سے وابستہ رہے۔

لودھی خاندان کو مورخین نے خاطر خواہ اہمیت نہیں دی۔ حالانکہ اس خاندان نے تاریخ میں بہت بڑا حصہ ڈالا ہے۔ غیاث الدین تغلق کی حکومت کے زوال کے بعد اور تیمور کے حملے کے بعد، دہلی کی سلطنت تقریباً تباہ ہو چکی تھی۔ خانہ جنگیوں، بغاوتوں، کمزور حکمرانوں اور غیر ملکی حملوں کی وجہ سے مضبوط سلطنت کمزور ہو گئی تھی۔ سید حکمران اس انتشار کو روکنے میں مکمل طور پر ناکام رہے۔ ہندو سرداروں نے کمزور حکومت کا فائدہ اٹھایا اور اپنے علاقوں میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کرلی۔ ہندوراجپوتوں نے راجپوتانہ سلطنت بنانے کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ سلطان کا قانون دیہاتوں میں نافذ العمل نہیں رہا تھا۔ ٹیکس صرف فوج کو بھیج کر وصول کیا جاتا تھا۔ گاؤں والوں نے حکومت کے قانون پر عمل چھوڑ دیا تھا۔ چونکہ سلطان کسانوں کی حفاظت کرنے سے قاصر تھا۔ کسانوں نے بھی لگان دینا چھوڑ دیا تھا_۔ ان کے خیال میں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بہلول لودھی کے حکومت میں آنے کے چند سال بعد حالات بہتر ہونے لگے۔ اس نے اپنی سلطنت میں امن و امان بحال کیا اور طاقتور شرقی خاندان شرقی خاندان Sharqi Dynasty شمالی ہند میں ایک خود مختار اسلامی ریاست، سلطنتِ جونپور پر حکومت کرنے والا خاندان تھا(۱۳۹۴ء۱۴۷۹ء)۔ اس کی

بنیاد خواجہ جہان ملک سرور نے رکھی تھی۔ جو دہلی سلطنت کے ماتحت تھا اور انہیں ملک الشرق ("مشرق کا حکمران") کا لقب ملا تھا۔ یہ خاندان فن تعمیر، تعلیم اور موسیقی کے لیے مشہور ہوا۔ جس کا سب سے اہم حکمران ابراہیم شاہ شرقی تھا) اس خاندان کو شکست دی۔ بہلول لودھی کے دور حکومت میں حالات بہتر ہونے لگے۔ سکندر لودھی جب اقتدار میں آیا تو حکومت بہترین طریقے سے کام کر رہی تھی۔ اچھی حکومت اور امن وامان نے تعلیم، فن تعمیر اور شاعری میں نئی راہ متعین کی۔ سلطنت نے ایک بار پھر اندرونی اور بیرونی طور پر اپنی دھاک بٹھادی۔ مرکزی حکومت مضبوط ہوئی اور لوگ ایک بار پھر سے پہلے کی طرح سلطان کی اطاعت کرنے لگے۔ اگر ابراہیم لودھی بھی معاملہ فہمی کا مظاہرہ کرتا اور نرمی سے پیش آتا تو وہ باغی اور خود مختار افغان امراء کو قابو کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ وہ اپنی خامیوں اور بے پرواہ طرز حکومت کے باوجود ترقی کر رہا تھا۔ جب اس نے ظہیر الدین بابر سے لڑنے کے لیے پانی پت کی طرف کوچ کیا تو اس کے پاس بہت بڑی فوج تھی حالانکہ بہت سے اہم افغان سردار ابرہیم لودھی کے خلاف بغاوت کر چکے تھے بابر کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دی بھی شمال مغربی سرحد کے پٹھان گورنر نے دی تھی۔ یہ وہی افغان جو پانی پت کی پہلی جنگ میں شکست کھا گئے تھے۔ بعد میں قنوج (یہ لڑائی دراصل مغلوں کو ہندوستان سے نکالنے اور افغان حکمرانی دوبارہ قائم کرنے کی جنگ تھی۔ جو شیر شاہ سوری کی قیادت میں لڑی گئی تھی۔ جون ۱۵۳۹ کو شیر شاہ سوری کی قیادت میں فوج نے چوسہ کی جنگ میں مغل افواج کو تباہ کر دیا جن کی قیادت ہمایوں کر رہی تھی۔ مغل شہنشاہ ہمایوں نے گنگا میں چھلانگ لگاتے ہوئے فرار ہو کر کسی طرح اپنی جان بچائی۔ چوسہ کی جنگ میں ہار کر ہمایوں شیر شاہ سوری کو دوبارہ چیلنج کرنے کے لیے اپنے بھائیوں سے مدد مانگ کر آگرہ واپس آیا۔ اس کے ایک بھائی ہندل مرزا نے ہمایوں کو اپنی فوج کا ساتھ دینے کی یقین دہانی کرائی۔ لیکن ہمایوں کا دوسرا بھائی کامران مرزا اپنی فوج بھیجنے پر رضامند نہیں ہوا۔ کیونکہ فوج پر تو ہمایوں کی کمان تھی - جب کہ کامران مرزا تخت پر خود قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد کامران اپنے بھائی ہمایوں کے اقتدار پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہو

سکا اور اپنی فوج کو ساتھ لے کر لاہور چلا گیا۔ پھر بھی ہمایوں نے شیر شاہ سوری کے خلاف لڑنے کے لیے کافی طاقت جمع کر لی تھی۔ چوسہ کی جنگ میں فتح کے ساتھ شیر خان (شیر شاہ سوری) نے خود کو سلطان قرار دیا) اس طرح افغانوں نے اپنا بدلہ لیا۔ کئی سالوں کی بدامنی کے بعد پٹھان نے ایک مضبوط سلطنت بنانے میں کامیاب ہو گئے جو ابتدائی مغل دور میں بھی قائم رہی۔ اگر لودیھوں نے افراتفری اور انتشار پر قابو نہ پایا ہوتا تو شمالی ہندوستان میں مسلم حکمرانی بڑے خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ لودھیوں کے بغیر، شیر شاہ سوری اور اکبر جیسے حکمران ہندوستان پر حکومت قائم نہیں کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر آئی ایچ قریشی
ڈائریکٹر سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ، کراچی
وائس چانسلر
کراچی یونی ورسٹی

ڈاکٹر اے حلیم کا لکھا ہوا پیش لفظ

یہ مقالہ، دی ہسٹری آف دی لودھی سلطانز آف دہلی اینڈ آگرہ، اس وقت لکھا گیا۔ جب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ میں ایک نوجوان لیکچرار تھا۔ یہ میرے سپروائزر سر جادوناتھ سرکار کی رہنمائی میں تیار کیا گیا تھا، جنہوں نے کمال مہربانی سے مقالے کو جانچا اور مجھے رہنمائی بھی مہیا کی۔ یہ مقالہ ۱۹۳۸ میں پیش کیا گیا تھا، اور میں نے اسی سال ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ تاہم اسے شائع نہیں کیا گیا کیونکہ علی گڑھ میں کوئی موزوں ناشر نہ مل سکا۔ میں نے ۱۹۴۸ میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں بطور پروفیسر اور شعبہ تاریخ کے سربراہ کی حیثیت سے شمولیت اختیار کرنے کے بعد میں نے اس مقالہ پر مکمل نظر ثانی کی۔ ۱۹۵۲ میں یونیورسٹی نے اسے عام حالات میں شائع کرنے پر اتفاق کیا۔ پھر بھی، مجھے کئی سال انتظار کرنا پڑا۔ کیونکہ ڈھاکہ یونیورسٹی کا نیا پرنٹنگ پریس اس وقت تک قائم نہیں ہو سکا تھا۔ مجھے اپنی باری کے لیے کافی انتظار کرنا پڑا۔ ۱۹۵۹ میں مقالے کی پرنٹنگ شروع ہو گئی۔ مگر یہ تاخیر کا شکار ہوتا رہا کیونکہ جامعہ کو دیگر اہم کاغذات کی پرنٹنگ کا کام پہلے کرنا تھا جامعہ کو دیگر اہم کاغذات کی پرنٹنگ کا کام پہلے کرنا تھا۔ ایک اہم وجہ میری مصروفیت بھی تھی کہ میں وقت نہیں دے پایا اور انہماک سے مسودہ چیک نہیں کر پایا۔ اس لیے کتاب میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں- میں ان کی پوری ذمہ داری لیتا ہوں۔ یہ کتاب میں نے اپنے والد کے نام انتساب کی ہے جو ڈھاکہ میں فارسی کے مشہور عالم تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۴۴ میں ہوا۔ میرے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مکمل کرنے کے تقریباً چھ سال بعد۔ میں نے ان سے فارسی زبان سیکھی اور اسی نے ادق متن کو سمجھنے میں میری مدد کی۔ اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے پر میں اپنے محترم دوست ڈاکٹر آئی ایچ قریشی، سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کراچی کے ڈائریکٹر اور جامعہ کراچی کے وائس چانسلر کا بے حد مشکور ہوں۔ میں اپنے طلباء کا بھی شکر گزار ہوں ۔ جو اب میرے ساتھی ہیں۔ جن میں جناب عبدالمومن چودھری اور جناب ناصر الدین احمد

ہیں۔اس مقالے کے انڈیکس کی تیاری کے لیے میرے طالب علم انعام الحق نے پانی پت کی جنگ کے نقشے اور تفصیلات تیار کرنے میں میری مدد کی۔اس کتاب کی چھپائی کے دوران ڈھاکہ یونیورسٹی پریس میں تین منیجر تھے۔میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔خاص طور پر جناب مصباح الدین چودھری کا، جنہوں نے کمال صبر سے میری اصلاح اور رہنمائی فریضہ سرانجام دیا۔میں ڈاکٹر اے ایچ دانی (ایم اے، پی۔ایچ۔ڈی لندن) کا ان کی مفید تجاویز کے لیے بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جو میرے ہم منصب اور ہم رتبہ ہیں - ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے سٹاف میں میں اہم پوزیشن پر ہیں۔جب تک میں اپنی نصف بہتر یعنی شریک سفر مسز سارا حلیم کا تذکرہ نہ کروں تب تک میری بات مکمل نہیں ہو پائے گی۔انہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔میرے ساتھ تعاون کیا۔گھریلو امور کی ذمہ داریاں انہوں نے خود اٹھائیں اور مجھے ان سے بری الذمہ کر دیا ہے۔

ملک بہلول لودھی

بہت قدیم زمانے سے یہ رواج تھا کہ کوہِ سلیمان (کوہِ سلیمان ایک اہم پہاڑی سلسلہ ہے۔ جو بنیادی طور پر افغانستان (جنوبی ہندوکش) سے شروع ہو کر پاکستان کے سرحدی علاقوں بلوچستان، خیبر پختونخوا اور پنجاب تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی سب سے بلند چوٹی تختِ سلیمان ہے) میں رہنے والے قبائل باقاعدگی سے دریائے سندھ کے قریب میدانی علاقوں میں آکر رہا کرتے تھے۔ کبھی یہ قیام عارضی آبادکاری کے لیے ہوتا اور کبھی کبھار مستقل نوعیت کا ہوتا تھا۔ جب سلطنت غزنویہ قائم ہوگئی (سلطنت غزنویہ ۹۷۶ء سے ۱۱۸۶ء تک قائم ایک حکومت تھی جس کا دارالحکومت افغانستان کا شہر غزنی تھا۔ اس کا سب سے مشہور حکمران محمود غزنوی تھا۔ جس نے ہندوستان پر ۱۷ حملے کیے اور سومنات پر حملہ کرکے بطور بت شکن خود کو تاریخ میں امر کردیا)۔ سلطنت غزنویہ نے پنجاب پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت اس طرح کے آمدورفت مزید بڑھ گئی۔ جب تغلق سلطنت کمزور ہونے لگی۔ تو ان میں تیزی آگئی۔ اس خطے کے لوگ جنہیں یہاں کے افغان اور بلوچ باشندے "روہ" کہتے ہیں، "روہ" (یا "کوہ") کا مطلب پہاڑ ہے، اور لفظ "روہیلا" کا مطلب ہے پہاڑ پر رہنے والا یا کوہ پیما ہے۔ زیادہ تر بنجاروں کی زندگی گزارتے تھے۔ گرمیوں میں یہ خانہ بدوش پہاڑیوں کی طرف چلے جاتے تھے اور سردیوں میں وہ میدانی علاقوں میں اتر آتے تھے۔ میدانی علاقوں میں رہتے ہوئے انہوں نے کام کی تلاش، اپنے جانوروں کے لیے چارے کی طلب کے لیے زمین کی ضرورت یا تجارت کے مواقع کی تلاش میں کثرت سے کئی جگہوں کا سفر کیا۔ انہوں نے اپنے خاندانوں اور مویشیوں کے ساتھ دریائے سندھ تک سفر کیا۔ وہاں پہنچ کر ان افراد نے اپنے خاندانوں کے ساتھ کچھ مردوں کو خیموں میں چھوڑ دیا۔ جب کہ باقی مرد تجارت کی غرض سے سامان لے کر دریائے سندھ پار کرگئے۔ تجارت کے بعد یہ لوگ تجارتی سامان لے کر اپنے گھر والوں کے

پاس لوٹ گئے۔ کوہ سلیمانی پر رہنے والے یہ پٹھان قبائل (لودھی) میدانوں کی طرف اپنے مویشیوں کو چرانے لاتے۔ ان میں زیادہ تر تاجر تھے۔ جو گھوڑوں اور دیگر اشیا کی تجارت کرتے تھے۔ یہ لوگ موسم گرما شروع ہونے سے پہلے ہندوستانی سامان یا تجارت سے حاصل ہونے والی رقم واپس پہاڑیوں پر لے جاتے تھے۔ ایسے تاجروں کو "پاوندہ" (لفظ "پاوندہ" کہتے ہیں۔ یہ لفظ فارسی سے آیا ہے۔ جس کا مطلب ہے "سامان کا گٹھا" یا یہ ایک پشتو لفظ ہے۔ جس کا مطلب ہے "جانور چرانا"۔ یہ تاجر اکثر لوگوں اور جانوروں کے بڑے گروہوں کے ساتھ سفر کرتے تھے) کہا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ افغان تجارت کے لیے چینی ترکستان اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک کا سفر کرتے تھے۔ چودھویں صدی کے آخر میں ملک بہرام نامی ایک افغان سردار جس کا تعلق لودھی قبیلے کی سہو خیل شاخ سے تھا۔ سہو خیل قبیلہ غلزئی افغان قوم کا حصہ تھا۔ ملک بہرام ایک جنگجو تاجر کی حیثیت سے اپنے بھائیوں کے ساتھ بلوٹ (ڈیرہ اسماعیل خان ضلع کا ایک گاؤں) سے ملتان تک کا سفر کیا کرتا تھا۔

اس کا کاروبار زیادہ منافع بخش نہیں تھا۔ اسکا جب اپنے بھائیوں کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تو وہ ملتان میں رہنے لگا۔ ایسے جھگڑے اس وقت جو قبائلی گروہوں میں عام تھے۔ ملتان میں سردار بہرام لودھی ملک مردان دولت کے پاس ملازم ہو گیا۔ جو ملتان کا گورنر تھا۔ پٹھان اپنی بہادری کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ ملک بہرام لودھی نے ملتان میں پٹھانوں کو متحد کرنا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے تغلق سلطنت مسلسل کمزور ہوتی گئی۔ پٹھانوں نے بہادر اور ہنر مند سپاہیوں کے طور پر ایک مضبوط شہرت حاصل کر لی۔ وہ شاہی فوج اور سرکاری خدمات میں بہت با اثر ہو گئے۔ ملک بہرام پٹھان سپاہیوں کے ایک گروپ کا رہنما بن گیا جسے اس نے ایک قبائلی جنگجو کے طور پر منظم کیا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے پانچ بیٹے ملک سلطان شاہ لودھی، ملک کالا لودھی، ملک فیروز لودھی، ملک محمد لودھی اور ملک خواجہ لودھی ملتان

میں ہی مقیم رہے۔ خضر خان نے ملک بہرام لودھی کے بیٹے ملک سلطان شاہ لودھی کو سرہند کا گورنر بنا دیا اور اسلام خان کا خطاب دیا۔ یہ لودھی حکمرانوں کا نقطہ آغاز تھا۔ اس دوران ملتان کی گورنری تیزی سے ایک سے دوسرے حکمران میں تبدیل ہوتی گئی۔ ملک مردان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ملک شیخ ملتان کا گورنر بنا۔ ان کی وفات کے فوراً بعد ملک مردان کے لے پالک بیٹے ملک سلیمان گورنر بن گئے۔ ملک سلیمان کے انتقال کے بعد، اس کا بیٹا خضر خان۔ جس نے بعد میں سید خاندان کی بنیاد رکھی۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے حکم سے ملتان کا وائسرائے بن گیا۔ ۱۳۸۸ء میں فیروز شاہ کے انتقال کے بعد دہلی سلطنت تیزی سے زوال پذیر ہوئی۔ تیمور کے حملے نے حالات مزید خراب کر دیے۔ خضر خان نے تیمور کی حمایت کی اور بدلے میں تیمور نے اسے ملتان اور پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ ملک بہرام کے بیٹے اور افغان سپاہیوں کے نئے سردار سلطان شاہ لودھی نے بڑی وفاداری اور بہادری کے ساتھ خضر خان کی خدمت کی۔ اس نے ۱۴۰۵ عیسوی میں اجودھن کی جنگ کے دوران ملّو اقبال خان کو شکست دینے اور پھانسی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ جو دہلی کے حقیقی حکمران اور کمزور کٹھ پتلی حکمران محمود تغلق کے محافظ تھا۔ ملک بہرام لودھی کے بیٹے اور سلطان شاہ لودھی کے بھائی ملک کالا لودھی کی شادی اس کے چچا کی بیٹی سے ہوئی –ملک کالا کی بیوی امید سے تھی– کہ اس پر دیوار گر گئی اس کے پیٹ کو چاک کر کے بچہ نکال لیا گیا–جو کہ تاریخ میں بہلول لودھی کے نام سے مقبول ہوا۔ ملک کالا نیازیوں کے ساتھ لڑائی میں مارا گیا۔ بہلول کو اس کے چچا ملک سلطان شاہ لودھی نے پالا –ملک بہلول لودھی اپنے چچا کا بہت لاڈلا تھا– جب بہلول عرف بھلو جوان ہوا–تو اس کی شادی ملک سلطان شاہ لودھی کی بیٹی شمس خاتون سے کر دی گئی۔ ۱۴۳۳ ویں میں دہلی کی حکومت ملک اللہ داد کالا لودھی کو دے دی گئی –ملک بہلول لودھی اس وقت فوج میں خدمات انجام دے رہا تھا– بہلول لودھی نے ۱۳۰۰ ٹینک اپنی جیب سے خرید کر فوج میں داخل کیے ملک سلطان شاہ

لودھی نے اسے اپنا جان نشیں مقرر کر دیا۔اور بارہ ہزار افغانی اس کے تحت ہو گئے۔ملک سلطان شاہ لودھی کے بیٹے قطب خان لودھی کو تخت سے محرومی بہت ناگوار گزری پھر کچھ عرصہ بعد قطب خان نے بھی صلح کر لی۔قطب خان بہلول لودھی کے ساتھ شامل ہو گیا ۔اس سے بہلول کو بہت طاقت ملی۔اس نے ۱۴۳۶عیسوی میں سرہند فتح کر لیا۔محمد شاہ نے حسام خان کو بہلول لودھی کے خلاف لڑنے بھیجا۔لڑائی میں حسام خان کو شکست ہوئی اور وہ جان بچا کر دلی بھاگ گیا۔بہلول لودھی نے دلی کے سلطان کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے خط لکھا۔بہلول کو سرہند جاگیر کے طور پر عطا کر دیا گیا۔۱۴۴۰میں سلطان محمود شاہ بہلول کی لڑائی میں شجاعت سے بہت متاثر ہوا اور بہلول کو خانی خانان کا لقب دیا۔ساتھ ہی لاہور اور دیپالپور کی حکومت بھی دے دی۔لودھی خاندان کا بانی بہلول لودھی کم عمری میں ہی یتیم ہو گیا تھا۔اس کے والدین دونوں فوت ہو چکے تھے۔ اس کے بعد ان کی دیکھ بھال ان کے چچا ملک سلطان شاہ لودھی نے سرہند میں کی۔ سلطان شاہ بچے سے بہت پیار کرتا تھا اور اس کے شرارتی رویے کو برداشت کرتا تھا حالانکہ اس کی بیوی بہلول سے نالاں رہتی تھی۔اس کی شکایتیں کرتی رہتی تھی۔پٹھان اس لڑکے کو طنزیہ انداز میں "بھلو" کہتے تھے۔لیکن جب وہ بڑا ہوا تو ہونہار پروا کے چکنے چکنے پات ظاہر ہونے لگے۔سلطان شاہ نے اپنی بیٹی شمس خاتون کی شادی اس سے کر دی۔تاریخ داؤدی نامی کتاب میں کہا گیا ہے کہ بہلول گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا اور انہیں محمد شاہ سید کو پیش کرتا تھا۔اس کے بدلے میں اسے زمینیں (پرگنہ) ملی۔جن پر اس وقت کے سلطان کا قبضہ ختم ہو گیا تھا۔اور رفتہ رفتہ لاہور کا زیادہ تر حصہ بہلول کے قبضے میں آگیا۔مگر دوسرے مورخین اس کہانی کی تصدیق نہیں کرتے اور اسے واضح طور پر مسترد کرتے ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ لاہور دہلی کے قبضے میں رہا۔ یہاں تک کہ ۱۴۳۳ عیسوی میں اس پر ملک الٰہداد کالالودھی، ملک سکندر تحفا، اور عماد الملک جیسے حکام کی حکومت تھی۔

بہلول نے سپاہی کے مقدس اور منافع بخش پیشے کا انتخاب کیا۔ اپنے چچا اور چند ساتھیوں کے ساتھ سید آبان نامی صاحب کشف و کرامات سے ملاقات اور تعظیم کے لیے وہ سب سمانا (ہندوستان کی ریاست پنجاب کے ضلع پٹیالہ میں واقع ایک تاریخی شہر) گئے۔

ایک فقیر نے بہلول لودھی سے دہلی کا تخت خریدنے کے لیے ۲۰۰۰ ٹنکے (سکے) مانگے۔ بہلول نے اپنے پرس سے ۱۳۰۰ ٹنکے نکالے۔ فقیر نے اسے مبارکباد دی اور پیشن گوئی کی کہ وہ ایک دن دہلی کا حکمران بنے گا۔

بہلول کے ساتھی اس پر ہنستے تھے اور اتنی رقم دینے پر اس کا مذاق اڑاتے تھے لیکن اس واقعے نے اس پر گہرا اثر ڈالا اور اس کے اندر حکومت کا ولولہ جاگا۔ اپنی موت سے پہلے بہلول کے چچا اور سسر ملک سلطان شاہ لودھی، نے بہلول کو اپنی تمام جائیداد اور عہدے کا وارث بنایا اور اس کے ماتحت ۱۲,۰۰۰ افغان فوجی کیے۔ وہ ان سب کا کمانڈر بن گیا تھا۔ اس کا اپنا ایک بالغ بیٹا قطب خان لودھی تھا۔ اس کے باوجود اس نے ایسا کیا۔

مارچ ۱۴۳۱ء میں سلطان شاہ کے انتقال کے بعد افغان تین گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ نے قطب خان لودھی کی حمایت کی۔ دوسرے نے بہلول کی حمایت کی۔ اور تیسرے نے ملک فیروز کی حمایت کی - جو محمد شاہ سید کے ماتحت کام کرتے تھے۔

بہلول نے سمجھداری سے ملک فیروز کو اپنے ساتھ شامل ہونے پر آمادہ کیا۔ قطب خان لودھی بہلول کو شکست نہ دے سکا۔وہ دہلی گیا اور محمد شاہ سید سے مدد مانگی۔ اور سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ افغانوں کو ہٹا دے۔ یہ پٹھان سرہند میں بہت طاقتور ہو چکے ہیں۔

اس کے بعد سلطان نے ملک سکندر طوفا، اور جسرتھ کھوکھر کی قیادت میں ایک فوج بھیجی۔ محمد شاہ سید کی فوج نے افغانوں کو شکست دی اور انہیں پہاڑیوں میں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

ملک فیروز کو سکندر طوفا اور جسرتھ کھوکھر نے دھوکے سے پکڑ لیا حالانکہ انہوں نے اسے محفوظ راستہ اور معافی کا وعدہ کیا تھا۔

ملک فیروز کے بیٹے شاہین خان نے اپنے خاندان کی خواتین کی حفاظت کرتے ہوئے بہادری سے جان دی۔ بہلول لودھی بحفاظت فرار ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ شاہین خان کا سر ملک فیروز کے سامنے لایا گیا تاکہ وہ اس کی شناخت کر سکے۔ فیروز نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا -جب تک اسے بتایا نہ گیا کہ اس نوجوان نے بہت بہادری سے مقابلہ کیا ہے۔تب فیروز نے جواب دیا کہ بہلول جو کہ بحفاظت فرار ہو گیا ہے اس سے اس جرم کا بدلہ لے گا۔

جسرتھ کے پنجاب کی طرف لوٹنے کے بعد بہلول چھپ کر باہر آیا۔ بڑی مشکل میں بھی اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے اپنے وفادار حامیوں سے پیسے ادھار لے کر اپنی بکھری ہوئی فوج کو دوبارہ بنایا اور پنجاب کے بیرونی علاقوں پر حملے اور لوٹ مار شروع کر دی۔ بہلول نے دل کھول کر قبضہ شدہ مال اپنے پیروکاروں کے ساتھ بانٹ دیا۔ اس کی وجہ سے بہت سے افغان اور مغل اس کی فوج میں شامل ہو گئے۔

بعد میں ملک فیروز جسے قیدی بنا کر دہلی لے جایا گیا تھا۔ فرار ہو کر بہلول سے جا ملا۔ کچھ عرصے کے بعد قطب خان لودھی نے بھی اپنی غداری پر افسوس کیا اور بہلول کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس مضبوط حمایت سے بہلول نے اپنے دشمنوں پر دوبارہ حملہ کرنے کی تیاری کی۔

سرہند پر ۸۴۰ ہجری (۱۴۳۶) میں قبضہ ہو گیا۔ محمد نے حسام خان کو بہلول کے خلاف لڑنے کے لیے بھیجا۔ خضروہ تخت کسی ایسے شخص کو سونپنا چاہتے تھے۔جو لوگوں کی جان ومال کا محافظ ہو۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق سلطان محمد شاہ اتنا خوفزدہ ہو گیا کہ اس نے دہلی سے بھاگنے کا سوچا- سلطان محمد کو ایک بڑی جنگ جیتنے میں بھی اعتماد کی کمی تھی اور اسے شکست کے نتائج کا اندیشہ تھا-اس لیے اس نے امن کی تجاویز پیش کیں-جنہیں محمود خلجی نے بخوشی قبول کر لیا۔ امن معاہدے کے بعد جب مالوہ کی فوج واپس آرہی تھی۔ بہلول نے ان پر حملہ کیا۔انہیں شکست دی اور بڑی مقدار میں فوجی سامان اور خزانہ اپنے قبضے میں لے لیا۔

آباد (کارا) میں حسام خان کو شکست ہوئی اور وہ واپسی پر مجبور ہو گیا۔ بہلول نے اپنی وفاداری اور خلوص پر زور دیتے ہوئے دہلی کے سلطان کو خط لکھا اور اس سے درخواست کی کہ وہ حسام خان کو پھانسی دے۔جسے اس نے دربار میں خراج عقیدت پیش کرنے میں رکاوٹ قرار دیا تھا- اور حامد خان کو وزارات سے نوازا تھا۔ بدقسمت سلطان نے نتائج کے بارے میں سوچے بغیر اس کے مطابق عمل کیا۔ بہلول نے عدالت سے سمجھوتہ کیا اور سرہند کو جاگیر بنانے کی اجازت دی گئی۔اس طرح اپنے اختیار کو قانونی بنیادوں پر رکھتے ہوئے بہلول نے اپنی پوزیشن مضبوط کرنا شروع کی اور نئے موقع کی تلاش میں رہا۔ سال ۸۴۴ (۱۴۴۰)اس کی زندگی کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔وہ تخت کسی ایسے شخص کو سونپنا چاہتے

تھے۔جو لوگوں کی جان ومال کا محافظ ہو۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق سلطان محمد شاہ اتنا خوفزدہ ہو گیا کہ اس نے دہلی سے بھاگنے کا سوچا۔ لیکن اس کے وفادار امیروں نے اسے روک دیا اور اسے سرہند سے بہلول کو بلانے کا مشورہ دیا۔

جب مالوہ کی فوج دہلی سے ۲۰ میل کے اندر آئی تو دونوں فوجیں آمنے سامنے ہو گئیں۔ محمود خلجی نے متانت سے کام کیا اور یہ جان کر کہ سلطان محمد خود دہلی کی افواج کے ساتھ موجود نہیں ہے۔اس نے ذاتی طور پر اپنی فوج کی قیادت نہیں کی۔ اس کے بجائے اس نے شہزادوں غیاث الدین اور قادر خان کو کمان سونپی۔

پہلے دن طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک جنگ جاری رہی اور کسی فریق کو فتح حاصل نہ ہوئی۔ اگلی صبح محمود خلجی امن چاہتے تھے کیونکہ اس نے خواب دیکھا تھا کہ مالوہ کے دارالحکومت مانڈو میں بغاوت شروع ہو گئی ہے۔ اسی وقت خبر پہنچی کہ گجرات کے سلطان احمد شاہ نے مالوہ پر حملہ کر دیا ہے۔

سلطان محمد کو ایک بڑی جنگ جیتنے میں بھی خدشات تھے ۔اسے شکست کے نتائج کا اندیشہ تھا۔اس لیے اس نے امن کی تجاویز پیش کیں۔ جنہیں محمود خلجی نے بخوشی قبول کر لیا۔ امن معاہدے کے بعد جب مالوہ کی فوج واپس آرہی تھی۔ بہلول نے ان پر حملہ کیا، انہیں شکست دی اور بڑی مقدار میں فوجی سامان اور خزانہ اپنے قبضے میں لے لیا۔

سلطان محمد بہلول سے بہت خوش ہوا۔ اس نے اسے "خانِ خانان" کا خطاب دیا، اس کے ساتھ بیٹے جیسا سلوک کیا، اور لاہور اور دیپالپور کو اپنی زمینوں میں شامل کیا۔

محمد شاہ کی حکومت کے بعد کے سالوں میں دہلی سلطنت کی عمل داری بہت کمزور ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ دہلی سے صرف ۴۰ میل دور رہنے والے رئیسوں نے بھی سلطان کی اطاعت کرنا چھوڑ دی۔ اس صورت حال نے بہلول کے لیے اچھا موقع پیدا کر دیا۔ ۱۴۴۱ میں جب اسے باغی جسرتھ کھوکھر پر قابو پانے کے لیے بھیجا گیا-تو جسرتھ نے صلح کی بجائے اسے دہلی سلطنت کی کمزور اور ذلت آمیز حکمرانی کو ختم کرنے کی ترغیب دی۔ تاریخ تانوں نے اسے مملکت کی خواہش قرار دیا۔بادشاہی کی خواہش بہلول کے دماغ میں بیٹھ چکی تھی۔ اس نے ہندوستان کے مختلف حصوں سے افغانوں کو اکٹھا کیا اور لاہور، دیپالپور، سنام، حصار فیروزہ اور دیگر مقامات پر بغیر کسی وجہ کے قبضہ کر لیا۔ اس نے کمزور سلطان کے احتجاج کو نظر انداز کیا اور دہلی کو گھیر لیا۔

جب وہ شہر پر قبضہ کرنے میں ناکام ہو گیا- تو وہ سرہند واپس آیا اور کھلم کھلا بغاوت کا اعلان کر دیا اس نے خود کو سلطان بہلول قرار دیا۔ البتہ اس نے سکے جاری کرنے میں تاخیر سے کام لیا مگر جمعہ کا خطبہ اس کے نام سے پڑھا جانے لگا-- جب تک کہ وہ دہلی پر وہ قابض نہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک نئ فوج تیار کی اپنی طاقت اور قوت میں اضافہ کیا۔

کچھ عرصے بعد ۱۴۴۵ء میں سلطان محمد شاہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بیٹے علاؤالدین نے اس کی جگہ لے لی اور عالم شاہ کا لقب اختیار کیا۔ وہ فطرت کے لحاظ سے نرم خو اور مہذب تھا- وہ اپنے والد سے بھی زیادہ سہل پسند اور کم فہم تھا۔

جب وہ سلطان بنا تو بہلول کے علاوہ تمام امراء نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ مگر جب ان پر شاہ عالم کی خامیاں واضح ہو گئیں تو ہر طرف بغاوت ہونے لگی۔ امراء آزاد ہو گئے۔

سلطان کا اقتدار صرف دہلی اور تقریباً ۲۰ میل کے اندر موجود چند قریبی دیہاتوں تک رہ گیا۔ اس کمزوری کی وجہ سے لوگوں نے مذاق میں کہا۔ شہنشاہ شاہ عالم صرف دہلی سے پالم تک حکومت کرتے تھے۔ دہلی اور بدایوں کے علاوہ کوئی چیز سلطان کے قبضے میں نہ رہی۔ تیمور کے ہندوستان پر حملے کے فوراً بعد گجرات، مالوہ، دکن اور بنگال پہلے ہی آزاد ہو چکے تھے۔ ملک کے باقی حصوں پر آزاد مقامی سرداروں کا کنٹرول تھا۔

مہرولی شریف سے لڈو سرائے تک کا علاقہ احمد خان میواتی کے زیر کنٹرول تھا۔ دریا خان لودھی نے سنبھل کو دہلی کے قریب خواجہ خضر کے قلعے تک قابو کر لیا تھا۔ ترک کے بیٹے عیسیٰ خان نے کول (علی گڑھ) اور جلالی پر حکومت کی - جبکہ یسین خان کے بیٹے قطب خان نے راپری پر حکومت کی۔ مین پوری کے چوہان سردار، جن کے آباؤاجداد اتر پردیش کے مین پوری ضلع میں مسلمانوں کے دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد منتقل ہو گئے تھے، پٹیالی، کمپالا اور بھاولو کو کنٹرول کیا تھا۔ یہ خان اوہدی کے ماتحت تھے۔ بہلول لودھی نے پانی پت تک سرہند، لاہور، سنام اور حصار فیروزہ کے اضلاع پر حکومت کی۔

بہلول نے ۱۴۴۷ عیسوی کے آس پاس دوبارہ دہلی پر حملہ کیا لیکن ایک بار پھر ناکام رہا۔ ۱۴۴۸ء تک عالم شاہ نے دہلی چھوڑ دیا اور بدایوں میں مستقل طور پر رہنے لگا۔ بدایوں منتقلی سے پہلے اس نے دہلی میں اپنے دو بہنوئیوں کو مقرر کیا۔ ایک کو پولیس کا سربراہ اور دوسرے کو پبلک ورکس کا سپرنٹنڈنٹ بنا دیا۔

عالم شاہ نے اپنے وزیر (وزیر) حسام خان کو ہٹا دیا کیونکہ وزیر نے سلطان کے احمقانہ فیصلوں پر کھل کر تنقید کی۔ ایک جھوٹی افواہ کی بدولت سے کہ سلطان ابراہیم شرقی حملہ کر رہا ہے - سلطان بیانا سے دہلی واپس آیا۔ دوسری بار ۱۴۴۷ عیسوی میں سلطان نے بدایوں کو اپنا دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ اسے اس کی آب و ہوا پسند ہے۔ مگر وہ حسام خان کو دہلی سے ہٹانے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔

کچھ عرصے بعد سلطان کے دونوں بہنوئی آپس میں لڑ پڑے۔ان میں سے ایک مارا گیا۔ حسام خان نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اس نے ہوشیاری اور مکاری سے اہلیان دہلی کو قاتل کو مارنے کی ترغیب دی اور خود تقریباً دہلی کا حقیقی حکمران بن گیا۔

بدقسمت سلطان علاؤالدین نے قطب خان، عیسیٰ خان اور رائے پرتاپ نامی مشیروں سے اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے مشورہ طلب کیا۔ یہ لوگ شاہ کے وفادار نہیں تھے۔ انہوں نے سلطان کو اپنے وزیر اعلیٰ حامد خان کو گرفتار کرنے کا مشورہ دیا اور وعدہ کیا کہ اس کے بعد بہت سے اضلاع شاہی کنٹرول میں آجائیں گے۔ سلطان راضی ہو گیا۔ رائے پرتاپ خاص طور پر بدلہ لینا چاہتے تھے -کیونکہ حامد خان کے والد نے اپنے ہی باپ کو جنگ میں مار کر اس کی ماں کو چھین لیا تھا۔ اس نے سلطان کو ۴۰ پراگنہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔چونکہ سلطان کا صرف بدایوں اور چند دیہاتوں پر کنٹرول تھا- اس لیے اس پیشکش پر وہ راضی ہو گیا۔ لیکن حامد خان اپنے بھائیوں کی مدد سے جیل سے فرار ہو کر دہلی چلا گیا۔ اس کا محافظ ملک جمال محمد اس کا پیچھا کرتا رہا لیکن حامد خان نے اس پر قابو پا کر اسے مار ڈالا۔ حامد خان نے پھر حسام خان سے گٹھ جوڑ کر لیا مگر حسام خان جلد ہی مارا گیا۔حامد خان دہلی کا اختیار سنبھال لیا۔ ۱۴۵۰ء میں حامد خان نے دہلی کے قلعے پر قبضہ کر لیا ۔اس کے بعد اس نے سلطان کی بیویوں اور بیٹیوں کو بغیر پردے کے باہر نکال دیا اور شاہی خزانہ پر قبضہ کر لیا۔ سلطان علاؤالدین نے اس ذلت کو خاموشی سے قبول کیا اور بدلہ لینے میں تاخیر سے کام لیا۔

ایک تو حامد خان جنگجو نہیں تھا۔اس لیے خود کو غیر محفوظ محسوس کرتا تھا۔ دوسرا اس نے اپنے حکمران کے خلاف بغاوت کی تھی اور شاہی خاندان کی توہین کی تھی۔اس لیے اس کے دل میں سزا کا خوف تھا۔

اس کے علاوہ مالوہ اور جون پور کی طاقتور سلطنتیں تخت دہلی پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ مالوہ پر محمود خلجی اور جون پور پر محمود شاہ شرقی کی حکومت تھی۔ یہ دونوں بہت طاقتور طاقتور حکمران تھے۔

حامد خان نے محمود شرقی سے یہ سوچ کر تعلقات نہیں بڑھائے کہ ان کا تعلق سلطان علاؤالدین سے تھا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ مالوہ بہت دور ہے۔ اس کے بجائے اس نے ملک بہلول کو سرہند سے بلایا۔ کیونکہ وہ قریب ہی تھا اور اور اس کے لیے کم خطرہ تھا۔

بہلول ایک مضبوط فوج کے ساتھ دہلی آیا اور حامد خان سے معاہدہ کر کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ کسی کو بھی معاہدے کی صحیح شرائط کا علم نہیں ہو سکا لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ طاقت کی شراکت کے بارے میں ہو۔ بعض مورخین کے مطابق بہلول نے دہلی میں داخل ہونے کے فوراً بعد سلطان کا لقب اختیار کر لیا۔ مگر اس کی طاقت اس وقت صرف نام پر تھی۔ حامد خان نے سول انتظامیہ کو اپنے زیر اثر رکھا ہوا تھا اور حقیقت میں زیادہ مضبوط تھا کیونکہ اس نے بہلول کو تخت پر بٹھانے میں مدد کی تھی۔

بہلول نے وقتی طور پر کمزور پوزیشن کو قبول کیا اور صبر اور تحمل سے بہتر موقع کا انتظار کرنے لگا۔ اسی دوران اس نے بدایوں میں سلطان علاؤالدین کو خط لکھا اور یہ کہانی گڑی کہ وہ صرف باغی حامد خان کو سزا دینے آیا ہے۔

بہلول حامد خان کے ساتھ بھی نہایت انکساری سے پیش آیا۔ وہ اکثر چند ساتھیوں کے ساتھ احتراماً اس کی عیادت کرنے دربار جاتا تھا۔ ایک دن ایک دعوت کے دوران بہلول نے اپنے افغان ساتھیوں کو مضحکہ خیز حرکات کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ حامد خان افغانوں کو اجڈ اور بے ضرر دیہاتی سمجھے۔ کچھ افغانوں نے اپنے جوتے کمر سے باندھے۔ کچھ نے جوتے بالکونیوں میں رکھے تاکہ انہیں چوروں سے بچایا جا سکے۔ کچھ نے

اپنے بچوں کے لیے ٹوپیاں بنانے کے لیے مہنگے قالین مانگے۔ عطر لایا گیا تو کچھ نے اسے چاٹ لیا اور کچھ نے گلاب کی پتیاں چبا لیں۔ جب پان کے پتے پیش کیے جاتے تو وہ پہلے چونا کھاتے اور پھر عجیب و غریب طریقے سے پان کھاتے۔ حامد خان ان کے عجیب و غریب حرکتوں پر حیران ہوا۔ بہلول نے بتایا کہ وہ سادہ لوح دیہاتی ہیں۔ تہذیب سے نا آشنا ہیں۔ جاہل اور گنوار ہیں۔ یہ سوائے کھانے اور مرنے کے کچھ نہیں جانتے تھے۔ حامد خان نے ہنستے ہوئے افغانوں سے ڈرنا چھوڑ دیا۔

اس دوران بہلول نے خفیہ طور پر مزید افغانوں کو دہلی میں جمع کیا۔ پھر ایک اور دعوت میں اس نے اچانک ایک منصوبہ بنایا۔ وہ ایک ہزار مسلح افراد کے ساتھ حامد خان کے دربار میں داخل ہوا۔ اندر داخل ہونے کے بعد افغانوں نے زبردستی اندر جانے کے لیے کہا کہ وہ بھی حامد خان کے ملازم ہیں ایسے ہی ایک جشن میں بہلول ایک ہزار پٹھانوں کو اپنے ساتھ محل میں لے گیا۔ افغان سرداروں کو بہلول کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ ان کو بھی بہلول جیسا مقام اور مرتبہ دیا جاتا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئے تو حامد خان کے ہر خادم کے پاس دو دو افغان فوجی کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد قطب خان لودھی زنجیریں لے کر آیا اور حامد خان کو ہتھکڑیاں لگاتے ہوئے کہا: ”تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم کچھ عرصے کے لیے سبکدوش ہو جاؤ۔ میں تمہیں قتل نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں تم سے ملنے والی نعمتوں کی ناشکری نہیں کرنا چاہتا۔“ حامد خان کو شہر سے باہر تیار کی گئی خصوصی جیل میں بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ شاید جیل میں ہی مر گیا ہو گا۔ اس طرح بہلول لودھی نے حامد خان کو اقتدار سے ہٹا دیا۔ -اس کے ہتھیاروں اور خزانوں پر قبضہ کر لیا اور ۱۷ ربیع اول، ۸۵۵ ہجری (۱۹ اپریل ۱۴۵۱) کو اس نے اپنے آپ کو مبارک گھڑی میں بادشاہ قرار دے دیا۔ اس نے بہلول شاہ کا لقب اختیار کیا۔ اپنے نام کے سکے جاری کیے اور خطبہ جمعہ پڑھنے کا حکم دیا۔

اس کے بعد بھی وہ آرام سے نہیں بیٹھا–دیپالپور واپس آنے کے بعد غالباً ایک نئی فوج جمع کرنے کے لیے اس نے بدایوں میں سلطان علاؤالدین کو ایک سفارتی خط لکھا۔ بہلول لودھی نے لکھا: "جب سے تمہارے باپ نے مجھ

مجھے بیٹے کی طرح پالا ہے، میں تمہارا نائب بن کر ریاست کے امور جو تباہی کا شکار ہو چکا ہے، سنبھالوں گا، میں تمہارا نام خطبہ سے نہیں ہٹاؤں گا۔"

بہلول نے خطبہ میں اپنے نام کے ساتھ سلطان علاؤالدین کے نام کا ذکر جاری رکھا۔ اس نے علاؤالدین کو بدایوں کے آس پاس کے پہاڑیوں اور دریائے گنگا کے درمیان خیر آباد تک پر امن طریقے سے حکومت کرنے کی اجازت دی - یہاں تک کہ علاؤالدین ۱۴۷۸ء میں وفات پا گیا۔

یہ اپنی سلطنت ہاتھ سے جانے کے بعد معمولی سا درجہ تھا- مگر علاؤالدین کے پاس صورت حال کو قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے بہلول کو جواب میں لکھا میں لکھا:

"چونکہ میرے والد نے تمہیں اپنا بیٹا کہا ہے۔اس لیے میں تمہیں اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں، میں بادشاہی کا معاملہ تمہارے ہاتھ میں چھوڑتا ہوں اور صرف بدایوں کی حکومت پر ہی راضی رہوں گا۔"

اس طرح بہلول نے تخت سنبھالنے کے لیے قانونی قبولیت حاصل کر لی۔

جس وقت بہلول لودھی نے دہلی پر قبضہ کیا اس کے دس بیٹے تھے:

ببر ک شاہ، نظام خان، مبارک خان، عالم خان (بعد میں سلطان علاؤالدین)، خواجہ بایزید، جمال خان، میاں یعقوب، راستہ خان، میاں موسیٰ اور جلال خان۔

سلطان بہلول لودھی

جب بہلول لودھی بادشاہ بنا تو اس کا صرف دہلی اور پنجاب کے کچھ علاقوں پر تسلط قائم ہوا۔ اپنی تاجپوشی کے فوراً بعد اس نے اپنے بڑے بیٹے شہزادہ بایزید کو چند رئیسوں کے ساتھ دہلی کا گورنر بنا دیا اور خود ۱۴۵۱ء میں ملتان کی طرف کوچ کیا۔ اس وقت ملتان شیخ بہاؤالدین کی اولاد میں سے شیخ یوسف قریشی کے ماتحتی سے آزاد ہو چکا تھا۔ بہلول دو اہم وجوہات کی بنا پر ملتان کو فتح کرنا چاہتا تھا: ملتان تصویری / کلیدی طور پر بہت اہم تھا کیونکہ اس پر ہندوستان میں داخل ہونے والا مرکزی دروازہ تھا۔

اگر ملتان آزاد اور خود مختار رہتا تو اس سے پنجاب میں لودھیوں کے پایہ تخت کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ سلطان بہلول لودھی کا بھی ماننا تھا کہ ملتان کا براہ راست پایہ تخت دہلی سلطنت سے تعلق ہے۔ جب وہ دیپالپور میں ملتان کی طرف کوچ کرنے کی تیاری کر رہا تھا تو اسے خبر ملی کہ جون پور کے بادشاہ محمود شاہ شرقی نے دہلی پر حملہ کر دیا ہے۔ چنانچہ بہلول کو فوراواپس ہونا پڑا۔

سلطان علاؤالدین کے بعض رئیسوں نے جن کا تعلق محمود شرقی سے تھا۔ محمود کو دہلی پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔ نتیجے کے طور پر ۱۴۵۲ عیسوی میں محمود شرقی نے ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ مارچ کیا۔ دہلی کو گھیر لیا۔ اور شہزادہ بایزید کو دہلی کے قلعے میں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد محمود نے قلعہ کا گھیراؤ کر لیا۔

چونکہ دہلی کے اندر بہت کم سپاہی تھے۔ بی بی متو۔ سلطان شاہ لودھی کی بیوہ اور بہلول کی ساس تھی۔ اس نے شاہی حرم کی افغان خواتین کو مردوں کے لباس پہنا کر قلعے کی دیواروں پر کھڑا کر دیا۔ اس تدبیر سے اس نے دشمنوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ قلعے میں بہت سے محافظ ہیں۔ محاصرہ دن بدن تنگ ہوتا گیا۔ دہلی کے افغان محافظ ہتھیار ڈالنے کے لیے تقریباً تیار تھے۔ اس وقت شرقی فوج کے

کمانڈر دریا خان لودھی کو اپنے افغان رشتہ داروں سے رشتہ داری یاد دلائی گئی۔ اس کے بعد اس نے خفیہ طور پر لودھیوں کی حمایت شروع کر دی۔

دریا خان نے قلعہ پر قبضہ کرنے میں دانستہ تاخیر کی اور محمود شرقی کو مشورہ دیا کہ اگر بہلول کی فوج کو پہلے روک کر شکست دی جائے تو قلعے والے خود ہی ہتھیار ڈال دیں گے۔ اس مشورے کے بعد محمود نے ہرات کے راستے دریا خان لودھی کو ۳۰,۰۰۰ گھڑ سوار سپاہیوں اور ۳۰ ہاتھیوں کے ساتھ پانی پت کی طرف بہلول لودھی کے ساتھ مقابلے کے لیے روانہ کر دیا۔

اس دوران دہلی کے محاصرے کی خبر سن کر بہلول نے ہندوستان اور روہ بھر کے افغان سرداروں کو پیغامات بھیجے۔ اس نے انہیں خبردار کیا کہ افغان قوم خطرے میں ہے اور ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ اس کے ساتھ شامل ہو جائیں تو ہندوستان میں انکو زرخیز زمینیں اور جاگیریں عطا کی جائیں گی۔

بہت سے افغانوں نے پرجوش جواب دیا اور بڑی تعداد میں اس کی حمایت کے لیے آ گئے۔ اس کمک کے ساتھ ساتھ بہلول نے دہلی کی طرف کوچ کیا اور دہلی سے تقریباً ۱۷ میل دور نریلا کے مقام پر شرقی فوج سے ملاقات کی۔

جنگ کے آغاز میں پٹھانوں نے شرقی فوج کے مویشیوں کو کو قبضے میں لے لیا۔ بہلول نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر کے حملہ کر دیا۔ قطب خان، سلطان شاہ لودھی کے بیٹے اور ایک ماہر تیر انداز نے دشمن کے حملے کی قیادت کرتے ہوئے ہاتھی کو زخمی کر دیا۔ ہاتھی شرقی افواج کے کمانڈر انچیف پات خان ہروی کو لے جا رہا تھا۔

قطب خان لودھی نے دریا خان لودھی سے بات کی اور کہا۔

"تمہاری مائیں اور گھر والے قلعے کے اندر پھنسے ہوئے ہیں، کیا تمہارے لیے یہ درست ہے کہ دشمن کی طرف سے لڑو اور اپنے خاندان کی عزت بچانے کی فکر نہ کرو؟"

یہ سن کر دریا خان لودھی اس شرط پر میدان جنگ سے نکل گیا کہ کوئی اس کا پیچھا نہیں کرے گا۔

دریا خان کے اچانک اور بے ایمانی سے پیچھے ہٹنے کی وجہ سے شرقی فوج کو شکست ہوئی۔ فتح خان پکڑا گیا۔ کھور کے رائے کرن نے اپنا سر کاٹ دیا کیونکہ فتح خان نے پہلے رائے کرن کے بھائی رائے پتھورا کو پھانسی دی تھی۔

بچی کچی شرقی فوج نے بھاگ کر سلطان محمود کو شکست کی خبر پہنچائی -جو دہلی کے قلعے کا محاصرہ کرنے میں مصروف تھا۔ جب سلطان نے سنا کہ اس کی فوج مشکل میں ہے اور اسے دھوکہ دیا گیا ہے تو وہ خوفزدہ ہو گیا، اپنا کیمپ باندھا اور جونپور واپس چلا گیا۔

دہلی پر شرقی حملے کی ناکامی ہندوستانی تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا۔ دہلی سلطنت کو کسی اور خاندان کے قبضے سے بچا لیا گیا۔ بہلول کی پوزیشن بھی بہت مضبوط ہو گئی اور وہ دہلی پر شرقی قبضے کے خوف سے آزاد ہو گیا

۔

اب چونکہ وہ خطرے سے محفوظ تھا- بہلول کو اب صرف اپنے دفاع کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے ان علاقوں کو واپس لانے کی کوشش شروع کی جو دہلی سلطنت کے ہاتھوں کھو چکے تھے اور تقریباً آزاد سرداروں کے زیر کنٹرول تھے۔

سب سے پہلے اس نے میوات کے خلاف مارچ کیا۔ اس کے سربراہ احمد خان میواتی نے سات پرگنوں (اضلاع) کو چھوڑ کر اور اپنے چچا مبارک خان کو یرغمال بنا کر بہلول کا اختیار قبول کر لیا۔ احمد خان کو اپنی باقی زمینیں رکھنے کی اجازت دی گئی۔

میوات سے بہلول باران گئے۔ سنبھل کے گورنر دریا خان لودھی نے ان کے سامنے عرض کیا اور سات پرگنہ بھی پیش کیا۔

پھر بہلول نے کول، علی گڑھ کی طرف کوچ کیا، جس پر عیسیٰ خان ترک بچاچہ کی حکومت تھی۔ عیسیٰ خان ترک بچاچہ نے اطاعت کی درخواست کی اور بہلول نے اسے اپنا علاقہ رکھنے کی اجازت دی۔

اس کے بعد بہلول نے مرہاڑہ کے قریب برہان آباد پر حملہ کیا۔ اس نے اسے ساکت کے گورنر مبارک خان کے کنٹرول میں دے دیا۔

اس کے بعد، وہ بھو گاؤں گئے، جہاں چوہان حکمران رائے پرتاپ نے ان کا اختیار قبول کر لیا۔

پھر بہلول نے رپری کی طرف کوچ کیا - حسن خان کے بیٹے قطب خان کا محاصرہ کر لیا جس نے قلعہ کے اندر پناہ لی تھی۔ قلعہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ تاہم، خان جہاں کی سفارش پر قطب خان کو معاف کر دیا گیا اور اس کی جاگیر واپس دے دی گئی۔

بہلول اس کے بعد اٹاوہ چلا گیا - بہلول کی اٹاوہ کی فتح، جس کے گورنر نے شرقی حکمرانوں کی حمایت کی، دہلی اور جونپور کے درمیان تنازعہ کا باعث بن گئی۔ جب سلطان محمود شرقی کو اٹاوہ پر قبضے کی خبر ملی تو اس نے وہاں سے بہلول کے خلاف جنگ کے لیے کوچ کیا۔

پہلے دن (۱۴۵۵ کے لگ بھگ) غیر فیصلہ کن جنگ ہوئی - دوسرے دن قطب خان لودھی اور رائے پرتاپ کی کوششوں سے امن قائم ہوا۔

معاہدے میں لکھا گیا:

"جو علاقے دہلی کے سلطان مبارک شاہ کے تھے وہ بہلول کے ہوں گے۔

جو علاقے جونپور کے سلطان ابراہیم کے تھے وہ سلطان محمود شرقی کے تھے۔

بہلول نریلا کی جنگ میں قید ہوئے سات ہاتھیوں کو واپس کر دے گا۔

ساون کے بعد شمس آباد جونا خان کے قبضے سے لے لیا جایا جائے گا- جو محمود شرقی کے مقرر کردہ گورنر تھے۔اور بہلول کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

دونوں حکمرانوں نے ان شرائط کو قبول کیا اور اپنے اپنے دارالحکومتوں کو واپس چلے گئے۔

بارش کے بعد بہلول نے جونا خان کو شمس آباد کو بہلول کے منتخب افسر رائے کرن کے حوالے کرنے کا حکم دے دیا۔ جونا خان نے انکار کر دیا۔ لہذا، ۱۴۵۶ کے لگ بھگ، بہلول نے شمس آباد کی طرف مارچ کیا، جونا خان کو طاقت کے ذریعے ہٹا دیا گیا اور شہر رائے کرن کو دے دیا۔

جونا خان نے پھر جونپور کی عدالت سے مدد مانگی۔ سلطان محمود نے شمس آباد کے بارے میں پہلے کے معاہدے پر افسوس کرتے ہوئے معاہدہ توڑ دیا اور وہاں رائے کرن پر حملہ کر دیا۔

قطب خان اور دریا خان لودھی نے رات کو شرقی فوج پر حملہ کیا۔ لڑائی کے دوران قطب خان کا گھوڑا توازن کھو بیٹھا - قطب خان کو پکڑ کر جونپور بھیج دیا گیا- جہاں وہ سات ماہ تک قید رہا۔

بہلول نے شہزادوں جلال خان اور سکندر کو شمس آباد کے دفاع کے لیے رائے کرن کی مدد کے لیے چھوڑ دیا- جب کہ اس نے خود سلطان محمود کے خلاف مارچ کیا۔

اس وقت، سلطان محمود وبا کی لپیٹ میں آگیا اور اچانک بیمار ہو گیا - اس کے نتیجے میں وہ ۱۴۵۷ میں انتقال کر گیا۔

ان کی وفات کے بعد محمود شرقی کی بیوہ بی بی راجی نے اپنے بیٹے بھائی خان خان کو تخت پر بٹھا دیا۔ شہزادہ بھائی بھائی خان کو اہم امراء کی حمایت سے بادشاہ بنایا گیا۔ نئے حکمران نے محمد شاہ کا لقب اختیار کیا۔ بہلول کے ساتھ جنگ دونوں طرف کے امراء کی ایماء پر صلح کرنے پر ختم ہو گئی۔ پھر ایک معاہدہ ہوا: محمود شرقی کے زیر کنٹرول زمینیں محمد شاہ کی ہوں گی، جب کہ سلطان علاؤالدین عالم شاہ کی زمینیں بہلول کے قبضے میں رہیں گی۔ اس کے بعد دونوں بادشاہ اپنے اپنے دارالحکومتوں کو لوٹ گئے۔ جب بہلول دہلی واپس آ رہا تھا تو اس کی بیوی شمس خاتون نے اسے سخت پیغام بھیجا تھا۔ اس نے کہا جب تک میرا بھائی قطب خان قیدی رہے گا - سلطان کو سکون سے آرام کرنے کا کوئی حق نہیں۔ بہلول اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ دہلی جانے کے بجائے، وہ دہلی سے تقریباً ۳۴ میل مشرق میں ڈنکور سے واپس پلٹا اور محمد شاہ کے خلاف جنگی محاذ رائی کی۔ محمد شاہ نے حملے کی توقع رکھتے ہوئے رائے کرن کو شمس آباد سے بھگا دیا

تھا اور خود قصبہ جونا خان کو دے دیا تھا۔ رائے پرتاپ جو بہلول کی حکومت میں تھا- وہ بھی محمد شاہ کے ساتھ شامل ہو گیا کیونکہ اسے اپنی زمین کی گرانٹ (جاگیر) سے محروم ہونے کا خدشہ تھا۔ محمد شاہ نے تیزی سے سرستی کی طرف کوچ کیا، جبکہ بہلول نے راپری کے قریب ڈیرے ڈالے۔ دونوں فوجوں کے درمیان کئی دنوں تک چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں- لیکن کوئی بھی فریق واضح کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ اس وقت تک محمد شاہ، اپنے ظلم وبربریت اور غرور و تکبر کی وجہ سے مقبولیت کھو چکا تھا- اس نے اپنے کیمپ سے جونپور کے کوتوال (شہر کے گورنر) کو اپنے بھائی شہزادہ حسن خان اور قطب خان لودھی کو قتل کرنے کا حکم دے کر بھیجا - - یہ دونوں اس کی قید میں تھے۔ کوتوال نے کہا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے - کیونکہ بی بی راجی ان کی حفاظت کر رہی تھیں۔ اس کے بعد محمد شاہ نے اپنی والدہ کو خط لکھا- اس سے کہا کہ وہ حسن خان کے ساتھ امن پر بات کرنے کے لیے ان سے ملیں۔ اس نے بہانہ کیا کہ وہ حسن خان کو سلطنت کا حصہ دینا چاہتا ہے۔ لیکن جب وہ قنوج پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ شہزادہ حسن خان پہلے ہی مارا جا چکا ہے۔ وہ جلدی سے جونپور واپس آئی اور قطب خان کو اپنی حفاظت میں لے کر بچا لیا۔ - محمد شاہ نے ظالمانہ طور پر اپنی والدہ کو لکھا، اس سے کہا کہ ایک ایک کر کے شہزادوں کا ماتم نہ کریں کیونکہ جلد ہی دوسرے کا بھی وہی انجام ہو گا۔ اس نے بدلہ لینے کا عزم کر لیا۔ خفیہ طور پر اس نے شہزادوں حسین خان اور جلال خان کو پیغامات بھیجے کہ وہ محمد شاہ کی فوج کو چھوڑ کر جونپور آجائیں۔ یہ بہانہ کر کے کہ بہلول رات کو حملہ کر سکتا ہے- حسین خان ۳۰,۰۰۰ گھڑ سواروں اور ۳۰ ہاتھیوں کے ساتھ محمد شاہ سے الگ ہو گیا اور دریائے جھرنا کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ اس نے جلال خان کو وہاں اپنے ساتھ شامل ہونے کو کہا۔ لیکن بہلول نے اس منصوبے کا پتہ لگا لیا اور چپکے سے اپنے سپاہی وہاں بٹھا دیے۔ جس کے نتیجے میں جلال خان قابو میں آ گیا۔ اسے دہلی بھیجا گیا اور قطب خان لودھی کو اس کے بدلے میں ں یرغمال بنا کر رکھا گیا۔ اپنے بھائی کی حمایت کھونے کے بعد محمد شاہ ہمت ہار گیا اور میدان جنگ سے بھاگ گیا۔ بہلول نے دریائے گنگا تک اس کا پیچھا کیا۔ جب حسین خان جونپور پہنچا تو بی بی راجی نے اسے حسین شاہ کے لقب سے ۱۴۵۷ء میں تخت پر

بٹھایا۔ حسین شاہ نے پھر محمد شاہ کے خلاف فوج بھیجی۔ یہ سن کر محمد شاہ مشرق کی طرف بھاگا، لیکن وہ راجگیر فورڈ کے قریب پکڑا گیا۔ وہ تقریباً ایک سو سواروں کے ساتھ ایک باغ میں بھاگا۔ بعد میں، محمد شاہ کے زرہ بردار کو بی بی راجی نے رشوت دی اور خفیہ طور پر اس کی دھاتی زرہ اتار دی۔ شہزادہ بھائی خان کو اہم امراء کی حمایت کے بعد بادشاہ بنایا گیا۔ نئے حکمران نے محمد شاہ کا لقب اختیار کیا۔ بہلول لودھی کے ساتھ جنگ دونوں طرف کے امراء کی ایماء پر صلح پر منتج ہوگئی۔ پھر ایک معاہدہ ہوا۔ جس میں لکھا گیا کہ "محمود شرقی کے زیر کنٹرول زمینیں محمد شاہ کی ہوں گی - جب کہ سلطان علاؤالدین عالم شاہ کی زمینیں بہلول کے قبضے میں رہیں گی۔ اس کے بعد دونوں بادشاہ اپنے اپنے دارالحکومتوں کو لوٹ گئے۔ جب بہلول دہلی واپس آرہا تھا– تو اس کی بیوی شمس خاتون نے اسے سخت پیغام بھیجا تھا۔ اس نے کہا جب تک میرا بھائی قطب خان قیدی رہے گا – سلطان کو سکون سے آرام کرنے کا کوئی حق نہیں۔ بہلول اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ دہلی جانے کے بجائے، وہ دہلی سے تقریباً ۳۴ میل مشرق میں ڈنکور سے واپس پلٹا اور محمد شاہ کے خلاف جنگی محاذ رائی کی۔ محمد شاہ نے حملے کی امید کرتے ہوئے رائے کرن کو شمس آباد سے بھگا دیا تھا اور خود قصبہ جونا خان کو دے دیا تھا۔ رائے پرتاپ جو بہلول کی رعیت میں تھا– وہ بھی محمد شاہ کے ساتھ شامل ہو گیا کیونکہ اسے اپنی زمین کی گرانٹ (جاگیر) سے محروم ہونے کا خدشہ تھا۔ محمد شاہ نے تیزی سے سرستی کی طرف کوچ کیا۔ جبکہ بہلول نے راپری کے قریب ڈیرے ڈالے۔ دونوں فوجوں کے درمیان کئی دنوں تک چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں لیکن کوئی بھی فریق واضح کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ اس وقت تک محمد شاہ اپنے ظلم و بربریت اور غرور و تکبر کی وجہ سے مقبولیت کھو چکا تھا۔ اس نے اپنے کیمپ سے جونپور کے کوتوال (شہر کے گورنر) کو اپنے بھائی شہزادہ حسن خان اور قطب خان لودھی کو قتل کرنے کا حکم دے کر بھیجا۔ یہ دونوں اس کی قید میں تھے۔ کوتوال نے کہا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ بی بی راجی ان کی حفاظت کر رہی تھیں۔ اس کے بعد محمد شاہ نے اپنی والدہ کو خط لکھا– اس سے کہا کہ وہ حسن خان کے ساتھ امن پر بات کرنے کے لیے ان سے ملیں۔ اس نے بہانہ کیا کہ وہ حسن خان کو سلطنت کا حصہ دینا چاہتا

ہے۔ لیکن جب وہ قنوج پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ شہزادہ حسن خان پہلے ہی مارا جا چکا ہے۔ وہ جلدی سے جونپور واپس آئی اور قطب خان کو اپنی حفاظت میں لے کر بچا لیا۔ محمد شاہ نے ظالمانہ طور پر اپنی والدہ کو لکھا- اس سے کہا کہ " ایک ایک کر کے شہزادوں کا ماتم نہ کریں کیونکہ جلد ہی دوسرے کا بھی وہی انجام ہوگا"۔ اس نے بدلہ لینے کا عزم کر لیا۔ خفیہ طور پر اس نے شہزادوں حسین خان اور جلال خان کو پیغامات بھیجے کہ وہ محمد شاہ کی فوج کو چھوڑ کر جونپور آجائیں۔ یہ بہانہ کر کے کہ بہلول رات کو حملہ کر سکتا ہے۔ حسین خان ۳۰,۰۰۰ گھڑ سواروں اور ۳۰ ہاتھیوں کے ساتھ محمد شاہ سے الگ ہو گیا اور دریائے جھرنا کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ اس نے جلال خان کو وہاں اپنے ساتھ شامل ہونے کو کہا۔ لیکن بہلول نے اس منصوبے کا پتہ لگا لیا اور چپکے سے اپنے سپاہی وہاں بٹھا دیے۔ جس کے نتیجے میں جلال خان قابو میں آ گیا۔ اسے دہلی بھیجا گیا اور قطب خان لودھی کو اس کے بدلے میں میں یرغمال بنا کر رکھا گیا۔ اپنے بھائی کی حمایت سے محروم ہونے کے بعد محمد شاہ ہمت ہار گیا اور میدان جنگ سے بھاگ گیا۔ بہلول نے دریائے گنگا تک اس کا پیچھا کیا۔ جب حسین خان جونپور پہنچا۔ تو بی بی راجی نے اسے حسین شاہ کے لقب سے ۱۴۵۷ء میں تخت پر بٹھایا۔ حسین شاہ نے پھر محمد شاہ کے خلاف فوج بھیجی۔ یہ سن کر محمد شاہ مشرق کی طرف بھاگا، لیکن وہ راجگیر فورڈ (راجگیر قلعہ قنوج سے تقریباً ۳ میل جنوب مشرق میں دریائے کنارے ہے) کے قریب پکڑا گیا۔ وہ تقریباً ایک سو سواروں کے ساتھ ایک باغ میں بھاگا۔ بعد میں، محمد شاہ کے زرہ بردار کو بی بی راجی نے رشوت دی اور خفیہ طور پر اس کی دھاتی زرہ اتار دی۔ اس کے بعد حسین شاہ نے بہلول لودھی سے صلح کر لی۔ انہوں نے جنگ بندی پر اتفاق کیا۔ یعنی دونوں فریقوں نے ایک دوسرے پر حملہ کرنے یا ایک دوسرے کی زمین پر ایک مقررہ وقت تک قبضہ نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے قیدیوں کو بھی رہا کیا اور امن کے مظاہرے کے سلسلے میں تحائف کا تبادلہ کیا۔ لیکن امن معاہدہ ختم ہونے سے پہلے ہی بہلول لودھی نے معاہدہ توڑ دیا۔ اس نے شمس آباد پر حملہ کر دیا۔ اس کے گورنر کو ہٹا دیا۔ اور علاقہ رائے کرن کو دے دیا۔ جب حسین شاہ واپس لڑنے کے لیے آیا تو بہلول کے بہت سے

ساتھی اسے چھوڑ کر حسین شاہ کے ساتھ مل چکے تھے۔ اس کی وجہ سے بہلول لودھی لڑنہ سکا اور دہلی کی طرف پسپائی اختیار کرلی۔ اس فتح نے حسین شاہ کو مزید طاقتور بنادیا۔ مشرقی علاقوں میں بہلول کے کچھ گورنر خوف زدہ ہو کر حسین شاہ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس کی وجہ سے شرقی سلطنت پہلے سے کہیں زیادہ دہلی اور آگرہ کے قریب پھیل گئی۔ اس کے بعد بہلول نے پنجاب اور ملتان کی طرف توجہ کی۔ ۱۴۵۱ میں اس نے یوسف کو سزا دینے کے لیے ملتان کی طرف کوچ کیا۔ جس نے خود کو خود مختار قرار دے دیا تھا۔

رائے صحار نامی ایک رہنما نے ۱۴۵۲ء میں ملتان میں حکومت کا تختہ الٹ کر اپنے آپ کو سلطان قطب الدین لانگا کہا۔ اس نے شیخ یوسف کو قید کر لیا- لیکن یوسف بعد میں فرار ہو کر دہلی چلا گیا- جہاں بہلول نے اس کا استقبال کیا اور اسے ایک اہم سیاسی حلیف کے طور پر رکھا۔

بہلول نے بھی اپنی بیٹی کی شادی شیخ یوسف کے خاندان سے کر کے تعلقات کو مضبوط کیا۔ اس اتحاد نے سیاسی طور پر ان کی مدد کی، اور ان کی اولادیں بعد میں دہلی کی اہم مذہبی اور سیاسی شخصیات بنیں۔

بہلول کا نواسا جو کہ بہلول کی بیٹی سے پیدا ہوا تھا۔ - شیخ رکن الدین کہلایا۔ بعد میں وہ سکندر لودھی کے دور حکومت میں دہلی کے شیخ الاسلام (اعلیٰ مذہبی اسکالر) بنا۔ ان کے بیٹے کا نام ابوالفتح نعمت اللہ چشتی تھا- جو سکندر لودھی کے زمانے تک حیات رہا۔

شیخ یوسف کا انتقال ۱۴۹۷ میں سکندر لودھی کے دور میں ہوا۔ ان کا مقبرہ۔ جسے شیخ علاؤالدین گنج شکر نے تعمیر کیا تھا- دہلی میں کھر کی مسجد کے قریب واقع ہے۔

تاریخ لودھی میں لکھا ہے کہ بہلول نے شیخ یوسف کے ساتھ بہت عزت سے پیش آیا - کیونکہ وہ حسب نسب میں قبیلہ قریش کے سادات ہونے کا دعویٰ دار تھا۔ بہلول نے شیخ عبداللہ کو بھی "شاہ عبداللہ" کا اعزازی لقب استعمال کرنے کی اجازت دی۔

۱۰۷۱میں چارلس پولٹاوا میں جنگ ہارنے کے بعد ترکوں کے ساتھ رہے۔ شیخ یوسف نے بہلول کی مسلسل حوصلہ افزائی کی کہ وہ اسے دوبارہ اقتدار میں لانے میں مدد کریں۔ چونکہ اب ان کے درمیان قرابت داری کا رشتہ تھا-اس لیے بہلول نے اس کی مدد کرنا اپنا اولین فرض سمجھتا تھا۔

اس سب کے دوران بہلول لودھی لگاتار اور شرقی حکمرانوں کے خلاف جنگوں میں مصروف رہا- - اس لیے وہ فوری مدد نہ کر سکا۔ سلطان قطب الدین لانگا کی موت کے بعد بہلول نے بالآخر ملتان کی طرف کوچ کیا۔ جانے سے پہلے اس نے قطب خان لودھی اور خان جہاں کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا۔

لیکن بہلول ابھی سفر پر ہی تھا کہ اسے خبر ملی کہ حسین شاہ شرقی نے ایک بار پھر اس کے علاقوں پر حملہ کر دیا ہے۔ بہلول شرقیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جلدی سے دہلی واپس چلا گیا۔

چندر کے مقام پر دونوں فوجوں نے خونریز جنگ لڑی- لیکن کسی بھی فریق کو واضح فتح حاصل نہیں ہوئی۔ اس کے بعد دونوں طرف کے امرا نے مزید تین سال کی جنگ بندی کا فیصلہ کیا۔ معاہدے نے پرانی سرحدوں کو قائم رکھا۔

جنگ بندی کے بعد حسین شرقی جونپور واپس آ گئے اور بہلول بھی پیچھے ہٹ گیا۔

شہزادہ بھائی خان کو اہم امراء کی حمایت کے بعد بادشاہ بنایا گیا۔ نئے حکمران نے محمد شاہ کا لقب اختیار کیا۔

بہلول لودھی کے ساتھ جنگ دونوں طرف کے امراء کی ایماء پر صلح پر منتج ہو گئی۔ پھر ایک معاہدہ ہوا- جس میں لکھا گیا کہ

"محمود شرقی کے زیر کنٹرول زمینیں محمد شاہ کی ہوں گی، جب کہ سلطان علاؤالدین عالم شاہ کی زمینیں بہلول کے قبضے میں رہیں گی۔ اس کے بعد دونوں بادشاہ اپنے اپنے دارالحکومتوں کو لوٹ گئے۔

جب بہلول دہلی واپس آ رہا تھا۔ تو اس کی بیوی شمس خاتون نے اسے سخت پیغام بھیجا تھا۔ اس نے کہا جب تک میرا بھائی قطب خان قیدی رہے گا- سلطان کو سکون سے آرام کرنے کا کوئی حق نہیں۔ بہلول اس کی

باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ دہلی جانے کے بجائے، وہ دہلی سے تقریباً ۳۴ میل مشرق میں ڈنکور سے واپس پلٹا اور محمد شاہ کے خلاف جنگی محاذ رائی کی۔

محمد شاہ نے حملے کی امید کرتے ہوئے رائے کرن کو شمس آباد سے بھگا دیا تھا اور خود قصبہ جونا خان کو دے دیا تھا۔ رائے پرتاپ جو بہلول کی رعیت میں تھا وہ بھی محمد شاہ کے ساتھ شامل ہو گیا کیونکہ اسے اپنی زمین کی گرانٹ (جاگیر) سے محروم ہونے کا خدشہ تھا۔

محمد شاہ نے تیزی سے سرستی کی طرف کوچ کیا۔ جبکہ بہلول نے راپری کے قریب ڈیرے ڈالے۔ دونوں فوجوں کے درمیان کئی دنوں تک چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں لیکن کوئی بھی فریق واضح کامیابی حاصل نہ کر سکا۔

اس وقت تک محمد شاہ اپنے ظلم و بربریت اور غرور و تکبر کی وجہ سے مقبولیت کھو چکا تھا۔ اس نے اپنے کیمپ سے جونپور کے کوتوال (شہر کے گورنر) کو اپنے بھائی شہزادہ حسن خان اور قطب خان لودھی کو قتل کرنے کا حکم دے کر بھیجا۔ یہ دونوں اس کی قید میں تھے۔ کوتوال نے کہا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ بی بی راجی ان کی حفاظت کر رہی تھیں۔

اس کے بعد محمد شاہ نے اپنی والدہ کو خط لکھا۔ اس سے کہا کہ وہ حسن خان کے ساتھ امن پر بات کرنے کے لیے ان سے ملیں۔ اس نے بہانہ کیا کہ وہ حسن خان کو سلطنت کا حصہ دینا چاہتا ہے۔ لیکن جب وہ قنوج پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ شہزادہ حسن خان پہلے ہی مارا جا چکا ہے۔ وہ جلدی سے جونپور واپس آئی اور قطب خان کو اپنی حفاظت میں لے کر بچا لیا۔

محمد شاہ نے ظالمانہ طور پر اپنی والدہ کو لکھا، اس سے کہا کہ ایک ایک کر کے شہزادوں کا ماتم نہ کریں کیونکہ جلد ہی دوسرے کا بھی وہی انجام ہو گا۔ اس نے بدلہ لینے کا عزم کر لیا۔

خفیہ طور پر اس نے شہزادوں حسین خان اور جلال خان کو پیغامات بھیجے کہ وہ محمد شاہ کی فوج کو چھوڑ کر جونپور آ جائیں۔ یہ بہانہ کر کے کہ بہلول رات کو حملہ کر سکتا ہے، حسین خان ۳۰,۰۰۰ گھڑ سواروں اور

۳۰ہاتھیوں کے ساتھ محمد شاہ سے الگ ہو گیا اور دریائے جھرنا کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ اس نے جلال خان کو وہاں اپنے ساتھ شامل ہونے کو کہا۔

لیکن بہلول نے اس منصوبے کا پتہ لگا لیا اور چپکے سے اپنے سپاہی وہاں بٹھا دیے۔ جس کے نتیجے میں جلال خان قابو میں آ گیا۔ اسے دہلی بھیجا گیا اور قطب خان لودھی کو اس کے بدلے میں میں یرغمال بنا کر رکھا گیا۔

اپنے بھائی کی حمایت سے محروم ہونے کے بعد محمد شاہ ہمت ہار گیا اور میدان جنگ سے بھاگ گیا۔ بہلول نے دریائے گنگا تک اس کا پیچھا کیا۔

جب حسین خان جونپور پہنچا تو بی بی راجی نے اسے حسین شاہ کے لقب سے ۱۴۵۷ء میں تخت پر بٹھایا۔ حسین شاہ نے پھر محمد شاہ کے خلاف فوج بھیجی۔ یہ سن کر محمد شاہ مشرق کی طرف بھاگا، لیکن وہ راجگیر فورڈ (راجگیر قلعہ قنوج سے تقریباً ۳ میل جنوب مشرق میں دریائے کنارے ہے) کے قریب پکڑا گیا۔ وہ تقریباً ایک سو سواروں کے ساتھ ایک باغ میں بھاگا۔ بعد میں، محمد شاہ کے زرہ بردار کو بی بی راجی نے رشوت دی اور خفیہ طور پر اس کی دھاتی زرہ اتار دی - اس کے بعد حسین شاہ نے بہلول لودھی سے صلح کر لی۔ انہوں نے جنگ بندی پر اتفاق کیا، یعنی دونوں فریقوں نے ایک دوسرے پر حملہ کرنے یا ایک دوسرے کی زمین پر ایک مقررہ وقت تک قبضہ نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے قیدیوں کو بھی رہا کیا اور امن کے مظاہرے کے سلسلے میں تحائف کا تبادلہ کیا۔

لیکن امن معاہدہ ختم ہونے سے پہلے ہی بہلول لودھی نے معاہدہ توڑ دیا۔ اس نے شمس آباد پر حملہ کر دیا - اس کے گورنر کو ہٹا دیا۔ اور علاقہ رائے کرن کو دے دیا۔ جب حسین شاہ واپس لڑنے کے لیے آیا تو بہلول کے بہت سے ساتھی اسے چھوڑ کر حسین شاہ کے ساتھ مل چکے تھے۔ اس کی وجہ سے بہلول لودھی لڑ نہ سکا اور دہلی کی طرف پسپائی اختیار کر لی۔ اس فتح نے حسین شاہ کو مزید طاقتور بنا دیا۔ مشرقی

علاقوں میں بہلول کے کچھ گورنر خوف زدہ ہو کر حسین شاہ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس کی وجہ سے شرقی سلطنت پہلے سے کہیں زیادہ دہلی اور آگرہ کے قریب پھیل گئی۔

اس کے بعد بہلول نے پنجاب اور ملتان کی طرف توجہ کی۔ ۱۴۵۱ میں، اس نے یوسف کو سزا دینے کے لیے ملتان کی طرف کوچ کیا، جس نے خود کو خود مختار قرار دے دیا تھا۔

غالباً اسی عرصے کے دوران میں بہلول نے ایک فوجی مہم پرنس بربک شاہ اور تاتار خان لودھی گورنر پنجاب کی قیادت میں ملتان کی طرف بھیجی جب کہ دوسری مہم میواڑ کی طرف روانہ کی۔

ملتان کا بادشاہ اور قطب الدین لانگاہ (سلطان قطب الدین لنگاہ (جسے عموماً قطب الدین لانگاہ بھی لکھا جاتا ہے) ۱۵ویں صدی کے دوران برصغیر کے خطۂ پنجاب میں قائم ہونے والی 'لنگاہ سلطنت' کے بانی اور پہلے حکمران) کا بیٹا حسین شاہ لانگاہ ملتان کا بے حد قابل اور طاقتور حکمران تھا۔ بادشاہ بننے کے بعد اس نے قریبی علاقوں کو فتح کرنا شروع کر دیا۔ اس نے تیموری شہزادوں اور ان کے حامیوں سے شورکوٹ، چنیوٹ اور کرور پر قبضہ کر لیا اور دریائے سندھ پر دھن کوٹ کے قلعے کا بھی محاصرہ کر لیا۔

اسی وقت حسین شاہ کے بھائی نے کلور کوٹ میں اس کے خلاف بغاوت کی۔ اس بغاوت نے بہلول کی مدد کی۔ جب حسین شاہ اپنے بھائی سے لڑنے میں مصروف تھا، لودھی کی فوج نے اچانک ملتان شہر پر حملہ کر دیا۔ اس سے پہلے کہ لودھی شہر پر قبضہ کر پاتے، حسین شاہ نے اپنے بھائی کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ پھر رات کے وقت دریائے سندھ کو عبور کیا اور صبح سویرے ملتان کے قلعے میں پہنچ گیا۔ وہ ۱۲,۰۰۰ سواروں کے ساتھ باہر آیا۔ اس نے سب سپاہیوں کو گھوڑوں سے نیچے اترنے کا حکم دیا اور ہر سپاہی کو تین تیر دیئے۔ اس نے ان سے سپاہیوں کہا کہ دشمن پر ایک کے بعد ایک تیر مسلسل چلائیں۔ پہلے حملے نے دشمن کو پریشان کر دیا۔ دوسرے حملے نے ان کی صفیں توڑ دیں اور تیسرے حملے نے انہیں مکمل طور پر پسپا کر دیا۔ اس کے بعد تیر اندازوں نے دوبارہ گھوڑوں پر سوار ہو کر شکست خوردہ لودھی فوج کا پیچھا کیا۔

دہلی کی فوج اس قدر خوفزدہ ہو گئی کہ چنیوٹ کے قلعے تک نہ پہنچی۔ قلعہ کے کمانڈر نے ۳۰۰ محافظوں کی حفاظت کے وعدے کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ لیکن یہ وعدہ ٹوٹ گیا اور سپاہی مارے گئے۔

حسین شاہ لانگاہ نے چنیوٹ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بابر کے ہندوستان آنے تک یہ بہلول اور اس کے جانشینوں کے ماتحت رہا۔

احمد یادگار نے اپنی تاریخ الصلاتین افغانہ میں بہلول کی طرف سے میواڑ کے رانا کے خلاف مہم کا بھی ذکر کیا ہے، حالانکہ اس نے حکمران کا نام یا تاریخ نہیں بتائی ہے۔ راجپوت کی تاریخیں بھی اس واقعہ کی تصدیق کرتی ہیں۔

پس منظر یہ تھا کہ رانا کمبھا (کمبھکرن ۱۴۳۳–۱۴۶۸ CE)، جو رانا کمبھا کے نام سے مشہور ہیں، ہندوستان میں ریاست میواڑ کے حکمران تھے۔ ان کا تعلق راجپوتوں کے سسودیہ قبیلے سے تھا۔ رانا کمبھا مختلف سلاطین کے خلاف اپنے شاندار فوجی کیریئر اور آرٹ اور فن تعمیر کی سرپرستی کے لیے عقیدت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے) کو ۱۴۶۸ میں اس کے اپنے بیٹے رانا اڈا نے قتل کر دیا تھا- باپ کے قتل کے بعد بیٹے نے حکومت شروع کر دی۔ رانا اُڈا نے پانچ سال حکومت کی لیکن اپنے خاندان اور رعایا دونوں کی طرف سے سخت نفرت کا سامنا کرنا پڑا- چونکہ اس نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا، اس لیے لوگ اسے "ہتھیارہ" (قاتل) کہتے تھے۔

حمایت حاصل کرنے کے لیے رانا اڈا نے مقامی شہزادوں کو زمین اور خود مختاری دی- لیکن اس سے اس کی حیثیت میں کوئی فرق نہ پڑا۔ آخر کار اس کے بھائی رائے مال نے اسے میواڑ سے نکال دیا۔ رانا اُڈا پھر دہلی گیا اور سلطان بہلول سے مدد کے لیے کہا، یہاں تک کہ سلطان کو اپنی بیٹی کی شادی کی پیشکش کی۔

رانا اڈا سلطان بہلول لودھی کے دربار سے باہر نکلتے ہی وفات پا گیا- اس پر آسمانی بجلی گر گئی۔ پھر بھی بہلول نے ذاتی طور پر کئی کمانڈروں اور رانا اُڈا کے بیٹوں کے ساتھ میواڑ کی طرف فوج کی قیادت کی۔

میواڑ پہنچنے کے بعد لودھی فوج نے ناتھواڑا کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ رائے مال اپنے سرداروں، ۵۸,۰۰۰ گھڑ سواروں اور ۱۱,۰۰۰ پیادہ سپاہیوں کے ساتھ لودھیوں کے مقابل آیا۔

لڑائی اس وقت شروع ہوئی جب رانا کے بھتیجے چتر سال نے ۱۰,۰۰۰ گھڑ سواروں کے ساتھ حملہ کیا۔ راجپوتوں کی بہادری کی وجہ سے بہت سے افغان مارے گئے اور مسلمان کمانڈر خطرے میں پڑ گئے۔ تلواروں اور خنجروں کے ساتھ ہاتھا پائی کی شدید لڑائی ہوئی۔ چتر سال مارا گیا اور بہت سے راجپوت جنگ میں مارے گئے۔

اس کے بعد رانا نے سلطان سے صلح کر لی اور جمعہ کا خطبہ پڑھنے اور چتور میں سلطان کے نام کے سکے جاری کرنے پر رضامند ہو گئے۔

تاہم چتور میں بہلول کی کامیابی زیادہ دیر نہیں چل سکی۔ جیسے ہی سلطان واپس آیا، راجپوتوں نے دہلی کی اطاعت ترک کر دی۔

ایک رات بہلول نے قطب الدین بختیار کاکی کی قبر پر نماز پڑھی۔ خود کو بے بس تصور کرتے ہوئے بہلول لودھی نے مالوا کے سلطان محمود خلجی کے پاس قاصد بھیجے اور مدد طلب کی اور اس کے بدلے میں اسے مستقل طور پر بیان دینے کی پیشکش کی۔

وقت حاصل کرنے کے لیے بہلول نے تجویز پیش کی کہ وہ دہلی کو حسین شاہ کے حوالے کر دے گا اور دہلی کے ارد گرد کا صرف ایک چھوٹا سا علاقہ ہی حسین شاہ کی حکومت میں اپنے علاقے کے طور پر رکھے گا۔ حسین شاہ سمجھ گیا کہ یہ صرف ایک چال ہے۔

بی بی خنزہ کے ساتھ بہلول عزت سے پیش آیا اور اس کو خواجہ سراؤں کے ساتھ بحفاظت حسین شاہ کے پاس واپس بھیج دیا۔

بہلول کی فوج نے پسپائی اختیار کرنے والی شرقی افواج کا پیچھا کیا اور کمپل، پٹیالی، شمس آباد، ساکت، کول، مرہرہ اور جلالی کے قصبوں پر قبضہ کر لیا۔ ہر بستی میں بہلول نے اپنا افسر (شقدار) مقرر کیا۔

حسین شاہ نے راپری کے علاقے میں رجوہر میں اپنی فوج کو دوبارہ جمع کیا اور ۱۴۷۹ میں کچھ مزاحمت دکھانے میں کامیاب ہوا۔ آخر میں دونوں جنگی فریقوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ہر مملکت جنگ سے پہلے اپنی پرانی سرحدیں برقرار رکھے گی۔ اس کے بعد حسین شاہ راپری چلا گیا اور بہلول دھوپاماؤں کی طرف چلا گیا۔

بہلول کی چالوں نے سے اس شکست خوردہ حسین شاہ میں انتقام کی شدید خواہش سے بھر دیا۔ ملکہ جہان نے اپنی گرفتاری سے ہونے والی توہین کا بدلہ لینے کی ٹھانی اور حسین شاہ کو اکسایا۔ لہٰذا، ۱۴۸۰ میں، حسین شاہ نے اپنے خیر خواہوں کے مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے (جن میں حضرت خواجہ غنی بھی شامل تھے) معاہدہ توڑ کر بڑی فوج کی قیادت کرتے ہوئے دہلی کی طرف کوچ کیا۔

بہلول لودھی میں فہم و فراست، جنگی حکمت عملی اور دانائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس نے امن کی درخواست کی لیکن جب اس کی درخواست مسترد کردی گئی تو اس نے جنگ کی تیاری کی۔ سونہار (سونہار پرگنہ علاقے کا مرکزی گاؤں ہے اسی نام کے ساتھ ایٹا ضلع، یو پی میں ہے) کے مقام پر بہت خونریز جنگ ہوئی۔ حسین شاہ کو شکست ہوئی اور وہ راپری کی طرف فرار ہو گیا اور مال غنیمت کی شکل میں اپنے پیچھے بہت بڑا خزانہ چھوڑ گیا_ جسے بہلول نے اپنے قبضے میں لے لیا۔

بہلول نے حسین شاہ کو ۱۴۸۰ میں راپری میں دوبارہ شکست دی اور اسے خوفزدہ ہو کر بھاگنے پر مجبور کیا۔ فرار کے دوران حسین شاہ کے کئی بیٹے اور خاندان کے افراد دریائے جمنا (یمنا) کو عبور کرتے ہوئے ڈوب گئے۔ پریشان پشیمان حسین شاہ جونپور پہنچنے کی امید میں گوالیار کی طرف بھاگ گیا_

آگرہ کے قریب ہتھکانٹ میں رہنے والے ڈاکوؤں کے ایک راجپوت قبیلے بھدوریا نے سلطان کی مشکلات کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ انہوں نے بہلول لودھی کے جنگی اڈے جنگی اڈے پر حملہ کر کے اس جنگی اڈے کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ جب وہ شکستہ دل ہو کر گوالیار پہنچا تو اس کے راجہ کیرت سنگھ نے سلطان کے

پرانے خادم کی طرح وفاداری کا برتاؤ کیا۔ اس نے پریشان سلطان کو خطیر رقم، خیمے، گھوڑے، ہاتھی اور اونٹ دیے_ اس نے سلطان کے ہمراہ سپاہی بھیجے تاکہ وہ اسے بحفاظت کالپی پہنچا آئیں۔

راپری سے بہلول لودھی نے اٹاوہ کی طرف کوچ کیا۔ تین دن تک شہر کا محاصرہ کرنے کے بعد اس نے اس کے گورنر شہزادہ ابراہیم خان (سلطان حسین شاہ کے بھائی) اور ہیبت خان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔ بہلول نے پھر ابراہیم خان نوحانی کو اٹاوہ کا گورنر مقرر کیا، جب کہ کچھ قریبی اضلاع رائے ڈنڈو کو دے دیے گئے۔

اس کے بعد بہلول نے حسین شاہ کا پیچھا کرتے ہوئے جالون تک جو اس وقت کالپی کے زیر اطاعت تھا۔ دونوں فوجیں کئی مہینوں تک دریائے گنگا کے مخالف کناروں پر براجمان رہیں_ ان کے درمیان چھوٹی چھوٹی لڑائیاں اور جھڑپیں لگی رہی۔

آخرکار بکسر کا گورنر تلوک چند جس نے حسین شاہ کی خدمت کی تھی۔ بہلول کے ساتھ مل گیا اس نے گنگا کے کم گہرے پانی کو پار کرنے میں مدد کی۔ حسین شاہ چالاکی سے ریوا (مدھیہ پردیش) کی طرف فرار ہو گیا۔ ریوا کے راجہ نے اس کا استقبال کیا، اسے پیسے، گھوڑے اور ہاتھی دیے، اور اسے ایک فوج کی حفاظت میں جونپور لے جایا گیا۔

بہلول نے پھر ۱۴۸۱-۱۴۸۲ میں جونپور کی طرف کوچ کیا۔ حسین شاہ خوفزدہ ہو کر بہرائچ کے راستے قنوج کی طرف بھاگا جبکہ بہلول نے اس کا قریبی فاصلے سے پیچھا کیا۔

کالی ندی کے کنارے دونوں میں جنگ لڑی گئی_ ایک جنگ میں حسین شاہ کو بری طرح شکست ہوئی۔ اسے نہ صرف اپنی سلطنت کی شاہی نشانیاں بلکہ اپنی بیوی ملکہ جہان کو بھی چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ بہلول نے ملکہ جہان کا احترام کیا۔ اسے عزت سے رکھا۔ اس فتح کے بعد بہلول نے جونپور کے علاقوں کو فتح کرنے پر مکمل توجہ مرکوز کی اور ۱۴۸۳ تک ان میں سے بیشتر علاقوں کو اپنے ماتحت کر لیا۔

ملکہ جہان بڑی چالاکی سے بچ نکلی اور اپنے شوہر کے پاس چلی گئی وہ بھاگنے میں کامیاب ہو گئی۔

بہلول لودھی نے جونپور کی سلطنت مبارک خان نوحانی کے ماتحت کر دی _ اس کے بعد ل اس نے دوسرے سرداروں کے ساتھ ساتھ خان جہاں لودھی کے بیٹے قطب خان کو مجولی کے قصبے میں ایک فوجی چوکی پر تعینات کیا اور خود بہلول بدایوں کی طرف چلا گیا۔

بہلول کے جاتے ہی حسین شاہ نے جونپور پر دوبارہ حملہ کیا اور بہلول کے افسروں کو مجولی میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ قطب خان لودی نے مزید کمک کے انتظار میں حسین شاہ کو گفت وشنید میں الجھا لیا۔

بہلول نے ۱۴۸۴ء میں اپنے بیٹے بربک شاہ کو ایک پیشگی فوج کے ساتھ جونپور کی طرف بھیجا اور بعد میں وہ خود بھی پیچھے پیچھے چلا گیا۔ حسین شاہ بغیر لڑے بہار کی طرف بھاگا۔

جب بہلول اس کا پیچھا کر رہا تھا اور موجودہ بلیلا ضلع کے ہلدی کے قصبے میں پہنچ گیا تھا- اسے خبر ملی کہ اسکا کزن ،وزیر اور بہنوئی قطب خان لودھی وفات پا گیا ہے ۔ چناچہ بہلول اسکی موت کا سوگ منانے دہلی واپس آ گیا۔

لودھی کے دور میں قطب خان کی سفارت کاری کامیاب رہتی تھی۔ قطب خان کی چالوں نے بہلول کو بہت فائدہ پہنچایا۔ اس ڈپلومیسی سے اس نے بہت سی اہم کامیابیاں حاصل کیں۔ کبھی کبھار بہلول کی فوجی فتوحات سے بھی زیادہ۔ دشمنوں کو چکما دینے کی اس کی صلاحیت نے بہلول کو بہت سی سنگین شکستوں سے بچایا اور لودھی خاندان کے اقتدار کی راہ ہموار کی۔

دہلی سے واپس آنے کے بعد بہلول نے ایک بار پھر جونپور کی طرف کوچ کیا۔ جونپور اور اودھ کے ارد گرد کے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد اس نے اپنے بیٹے بربک شاہ کو شرقی تخت پر بٹھا دیا۔ مستقبل میں ہونے والی بغاوتوں کو روکنے کے لیے اس نے جونپور کے دفاع کو مضبوط اور دوبارہ تعمیر کیا۔

اب بہلول ایک ایک کر کے باقی ماندہ شرقی علاقوں کو فتح کرنے کے لیے آزاد تھا۔ جونپور سے اس نے کالپی کی طرف پیش قدمی کی- اسے فتح کیا_ اور اسے شاہی جاگیر کے طور پر شہزادہ اعظم ہمایوں کے قبضے میں دے دیا۔ اس کے بعد اس نے چندواڑ کے راستے دھول پور کا سفر کیا۔

دھول پور کا راجہ جو خرابیوں کا حامی رہ چکا تھا بہلول لودھی کے استقبال کے لیے آیا اور اسے کئی من سونا پیش کیا۔ دھول پور سے بہلول لودھی باری گیا_ جہاں گورنر اقبال خان نے ان کے اختیار کو قبول کیا اور سونا بطور خراج دینے کے بعد اپنا عہدہ برقرار رکھنے کی اجازت دی گئی۔

بہلول لودھی نے مالوہ پر چڑھائی کردی ۔ اس نے مالوہ کے عیاش حکمران سلطان غیاث الدین خلجی کی کمزوری کا فائدہ اٹھایا۔ غیاث الدین نے ۱۶۰۰۰ عورتوں کو حرم میں داخل کر رکھا تھا۔

بہلول لودھی نے ۱۴۹۴ عیسویں میں رنتھمبور کے علاقے میں الہان پور شہر پر حملہ کرکے تباہ کردیا- جو مالوہ میں تھا۔ اس حملے کی خبر سلطان غیاث الدین تک بڑی تگ ودو سے پہنچائی گئی کیونکہ وہ ڈسٹرب ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔

ایک بہادر درباری نے سلطان کو مطلع کیا کہ بہلول لودھی نے مالوہ کو معمول کا خراج بھیجنا بند کردیا ہے اور الہان پور شہر کو بھی تباہ کر دیا ہے۔ اس کے بعد غیاث الدین نے مظفر خان کے بیٹے اور چندری کے گورنر شیر خان کو بھیلسا اور سارنگ پور کی فوجوں کے ساتھ بہلول پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔

جب مالوہ کی فوج بیگنا کے قریب پہنچی تو بہلول نے دیکھا کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس نے پسپائی اختیار کی اور دہلی چلا گیا۔ مالوا کی فوج بھی واپس چلی گئی۔ بعد ازاں اُس نے تحائف بھیج کر اور نقصان کا تخمینہ ادا کرکے صلح کرلی۔ شیر خان نے بعد میں الہان پور شہر کو دوبارہ تعمیر کیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ سلطان بہلول ضعیف اور کمزور ہونے لگا۔ اس نے بہائی کی سلطنت کو اپنے بیٹوں اور رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا اور اس طرح اپنے جانشین کے لیے مشکلات کا ایک ورثہ چھوڑا۔ اس نے اپنے بیٹے مبارک خان لودھی کو کارا اور مانک پور دیا ۔ اس نے بہرائچ اپنے کزن شیخ محمد قربان فارملی کو دیا جس کی کنیت "کالا پہاڑ"؛ اور لکھنؤ اور کامپی اس نے مرحوم شہزادہ بایزید کے بیٹے شہزادہ اعظم ہمایوں (پوتا) کو دیا۔ بدایوں خان جہاں لودھی کو دے دیا۔ جو اس کا رشتہ دار اور امراء کا سردار تھا۔ پنجاب اور دوآبہ کے کچھ حصے اس نے شہزادہ نظام خان (سکندر لودھی) کے لیے چھوڑے۔ جس کو اس

نے اپنا ولی عہد نامزد کیا تھا۔ سلطان بہلول کے حکم فوج نے پنجاب سے کشمیر پر حملہ کیا۔ حسن شاہ نے راجہ عجب دیو کی قیادت میں کشمیر اور جموں کی ایک مشترکہ فوج پنجاب پر حملہ کرنے کے لیے بھیجی۔ راجوری کی طرف بڑھنے والی حملہ آور فوج کو پنجاب کے گورنر تاتار خان لودھی نے شکست دی۔ جس نے سیالکوٹ پر قبضہ کر لیا جو بابر کے قبضے تک لودھیوں کے زیر تسلط رہا۔ کشمیر میں خانہ جنگی نئے سرے سے شروع ہوئی جب شہزادہ محمد نے اپنے والد حسن شاہ کو /۱۴۸۶ میں جانشین بنایا۔ یہ سید محمد، سید حسن کے بیٹے اور اس کے حامیوں نے دفاعی جنگ میں دریائے بیاس کے دوسرے کنارے پر جاکر اس پر بنے پل کو تباہ کر دیا۔ پنجاب کے گورنر تاتار خان لودھی نے سری نگر پر حملہ کرنے کے لیے ایک بڑی فوج بھیجی۔ حملہ آور فوج کو بھمبر کے مقام پر پیاسی کے سردار راجہ ہنس نے شکست دی۔۱۴۸۶ میں یہ فوجی منتشر ہو کر دہلی پہنچے۔ بہلول حصار فیروزہ کی طرف گیا اور کچھ مہینوں کے بعد دوبارہ دہلی واپس آیا۔ دہلی میں کچھ دیر رک کر اس نے ۱۴۸۸ کے موسم خزاں میں گوالیار کی طرف کوچ کیا جو ایک پرانے شرقی جاگیر دار راجہ مان سنگھ تنور کے خلاف تھا۔ گوالیار سے سلطان نے اٹاوہ اور موت کی طرف کوچ کیا اور چوہان جاگیر دار کو بے دخل کر دیا– بہلول لودھی دہلی واپس جاتے ہوئے شدید گرمی سے بیمار ہو گیا۔ اس نے ساکت پرگنہ کے مضافاتی گاؤں میں میلولی (میلولی ایٹا ضلع کا ایک گاؤں ہے جو ایٹا– علی گنج روڈ پر ساکت سے تقریباً ۱۵ میل شمال میں ہے) کے قریب ڈیرے ڈالنے کا حکم دیا اور زندگی کی اسی بہاریں دیکھنے کے بعد بیماری کا شکار ہو کر وہ وفات پا گیا–اپنی موت سے پہلے بہلول نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی تھی کہ وہ سور قبیلے کے کسی فرد کو سردار نہ بنائے کیونکہ اس کا خیال میں سور قبیلہ اقتدار کا لالچی تھا۔اس نے اپنے بیٹے کو متنبہ کیا کہ "نیازی قبیلے پر بھروسہ نہ کرنا۔" کیونکہ نیازی نڈر، بے ایمان اور خطرناک قبیلہ ہے۔ بہلول نے خاص طور پر ان پر عدم اعتماد کیا۔ کیونکہ نیازی قبیلے کے افراد نے بہلول لودھی کے والد کالا لودھی کو قتل کر دیا تھا۔

بہلول کا انتقال ۱۲ جولائی ۱۴۸۹ (۱۳ شعبان ۸۹۴ھ) کو ہوا۔ چونکہ وہ ۱۹ اپریل ۱۴۵۱ کو سلطان بنا تھا۔اس لیے اس نے تقریباً ۳۹ قمری سال، یا شمسی کیلنڈر میں تقریباً ۳۸ سال حکومت کی۔
سلطان بہلول لودھی کو دہلی میں روشن چراغ کے مزار (درگاہ) کی اندرونی دیوار کے بالکل باہر دفن کیا گیا۔

سلطان بہلول لودھی کا کردار

بہلول لودھی کو پٹھان مورخ نے بہادر، سخی، صابر اور منصف حکمران کے طور پر بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنی ذاتی زندگی میں اور بادشاہت میں اسلامی قانون (شریعت) کی سختی سے پابندی کی۔ اس نے کبھی جلد بازی سے کام نہیں لیا۔اس کی عادتیں سادہ تھیں اور وہ دکھاوے کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ طبیعت میں مہربان اور معاف کرنے والا تھا۔ اس نے اپنے رئیسوں کے ساتھ بھائیوں کا سااور برابری کا سلوک کیا۔ اس نے شاہی غرور، عیش و عشرت اور مجلسی رسموں سے گریز کیا۔اس نے پٹھانوں کا مساوات پر یقین ظاہر کیا۔

وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ بہت ملنسار اور ان پر مہربان تھا۔ - اس نے بہت سے افغانوں اور خاندان کے افراد کو اہم سرکاری عہدوں پر تعینات کیا۔ وہ شکست خوردہ دشمنوں کے لیے بھی مہربان دشمن تھا۔وہ عورتوں کا احترام کرنے والا آدمی تھا۔ باغی سرداروں کے ساتھ اور سلطان حسین شرقی کی بیوی ملکہ جہان کے ساتھ اس کا سلوک اس کی مثالیں ہیں۔

وہ بھی ایک عام پٹھان کی طرح بہت خدمت گزار اور فیاض تھا۔ وہ اپنے دروازے سے مانگنے والے کو مایوس نہیں لوٹاتا تھا۔ ریاستی تقریبات کے مواقع پر خواہ وہ تخت نشینی ہو یا فتوحات کا جشن ہو۔ اس نے غریبوں اور ضرورت مندوں میں بھاری رقومات تقسیم کیں اور کبھی کوئی خزانہ جمع نہیں کیا۔ اگرچہ وہ اسلام پر سختی سے عمل کرتا تھا لیکن وہ متعصب نہیں تھا۔اس نے اور اپنے بیٹے کی طرح دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر کبھی ظلم نہیں کیا۔ کئی راجپوت زمینداروں اور جاگیرداروں نے اس کی وفاداری کے ساتھ خدمت کی جن کو اس نے اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز کیا۔ وہ ادب اور شاعری کا ذوق رکھتا تھا۔اور اپنا زیادہ وقت اہل علم کی صحبت میں گزارنا پسند کرتا تھا۔ایک بادشاہ کے طور پر، وہ عقلمند، مہربان اور محبت کرنے والا تھا۔وہ اپنے لوگوں کے ساتھ معاملات میں احتیاط سے کام لیتا تھا۔ خواہ وہ

کسی قبیلے کے سردار ہو یا بادشاہ کی حیثیت سے ہو۔اس نے جنگی مال غنیمت اپنے سپاہیوں میں تقسیم کیا۔ اور"پاک خلفاء" کی طرح خود بھی برابر کا حصہ لینے کو ترجیح دی۔ اس کا کھانا بہت سادہ تھا۔اس کے محل میں کھانا کبھی تیار نہیں کیا جاتا تھا۔رئیسوں کے گھر سے جو کھانا آتا۔ کھالیا جاتا۔وہ اتنا غیر روایتی مزاج رکھتا تھا کہ اجنبیوں کے ساتھ کھانے میں شمولیت کرتا تھا۔ کھانے کے وقت محافظ ہٹادیے جاتے جس کا دل چاہتا اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاتا۔ بہلول لودھی پٹھان سرداروں کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کرتا تھا نہ کہ ملازموں جیسا۔ وہ ملاقاتوں اور سرکاری تقریبات کے دوران تخت پر نہیں بیٹھتا تھا۔سے نمایاں ہونا پسند نہیں تھا۔اس نے معززین کو اپنے سامنے احترام کے ساتھ کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کے باوجود کہ وہ ایک طاقتور بادشاہ تھا۔ لیکن اس نے فخریہ شاہی کے بجائے سادہ القابات کا استعمال کیا۔

اگر کوئی پٹھان سردار اس سے ناراض ہوتا تو وہ خود اس سردار کے گھر جاتا۔اپنی تلوار اتار کر اسے رئیس کے سامنے رکھ دیتا اور عاجزی سے معافی مانگتا۔ بعض اوقات وہ اپنی پگڑی بھی اتار دیتا۔عاجزی اختیار کرتا وہ کہتا "اگر تم مجھے بادشاہ بننے کے لائق نہیں سمجھتے تو یہ عہدہ کسی اور کو دے دو۔"

اس نے خود کو کبھی دوسروں سے برتر ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے سجائے ہوئے خصوصی شاہی گھوڑوں کی بجائے عام گھوڑوں پر سواری کی۔وہ کہتا تھا کہ میرے نام کا سلطنت سے جڑنا ہی کافی ہے۔ کوئی سردار بیمار ہوتا تو وہ اس کے گھر اس کی عیادت کے لیے جاتا۔اپنے رویے کی وجہ سے،وہ ایک "شہری بادشاہ" اور ایک ایسے جمہوری رہنما کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔جو سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتا تھا۔

بہلول بہت بردبار، تحمل مزاج اور لوگوں کی رائے کا احترام کرنے والا آدمی تھا۔ ایک کہانی کہتی ہے کہ جس دن وہ بادشاہ بنا۔ ایک عالم دین ملا قدن نے مسجد میں خطبہ کے دوران افغانوں کی توہین کی۔ بہلول غصے میں آنے کے بجائے مسکرایا اور بولا "ہم بھی خدا کے بندے ہیں۔ فوجی کیمپوں میں ہوں یا دارالحکومت میں۔"بہلول نے حکومت اور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے سخت محنت کی۔ وہ صبح

سویرے جاگتا تھا۔ریاستی معاملات کو سنبھالتا تھا۔دستاویزات پر دستخط کرتا تھا۔احکامات جاری کرتا تھا۔لوگوں کی بات سنتا تھا۔اور انصاف فراہم کرتا تھا۔ظہر کے بعد وہ علماء کے ساتھ وقت گزارتا۔قرآن پڑھتا اور نماز پڑھتا۔عشاء کی نماز کے بعد کچھ وقت اپنے اہل خانی کے ساتھ گزارتا۔ اس کے بعد وہ کھانا کھاتا تھا۔

اس کی نیند بہت کم تھی۔اور رات میں تھوڑی دیر کے لیے سوتا تھا۔آرام کے وقت بھی وہ اپنے لوگوں کی مدد کرنے اور مشکل قانونی معاملات کو حل کرنے کے بارے میں سوچتے رہتا۔ مجموعی طور پر وہ ایک عقلمند، منصف اور مہربان حکمران سمجھا جاتا تھا۔

ایک سپاہی کی حیثیت سے بہلول خطرناک حالات میں بھی بہادر، ہوشیار، بردبار اور بہادر تھا۔اس نے فوجی مہمات میں بہت سی فتوحات حاصل کیں۔جن میں سے زیادہ تر کی اس نے خود قیادت کی۔وہ ۸۰ سال کی عمر میں ایک مہم سے واپس آتے ہوئے ایک فوجی کیمپ میں انتقال کر گیا۔

اگرچہ اس نے ہر جنگ نہیں جیتی ہو گی لیکن حتمی نتائج عام طور پر اس کے حق میں تھے۔وہ جنگ میں کبھی زخمی نہیں ہوا۔ مشکل وقت میں جب ہمت اور فوجی مہارت کافی نہیں ہوتی تھی تو اس نے سفارت کاری اور بعض اوقات ہوشیاری کا سہارا لیا۔ اس نے اکثر حالات کے مطابق اپنے وعدوں کو پس پشت ڈالا اور کبھی کبھی اس کے رویے میں ان عظیم خصوصیات کی کمی محسوس ہوئی جس کی ایک عظیم جنگجو سے توقع کی جاتی ہے۔

اس کے لیے معاہدے صرف اس وقت تک مفید تھے۔جب تک کہ وہ اسے فائدہ پہنچاتے تھے۔ دھوکہ دہی سے اپنی شاندار قابلیت کے بجائے اپنے دشمنوں پر معمولی فائدہ اٹھانا اس کا پسندیدہ عمل تھا۔ایک سپاہی یا فوجی رہنما کی حیثیت سے بہلول اپنی بہت سی فتوحات کا مالک ہے۔بہلول مغل سپاہیوں کا مداح تھا اور اس کی ملازمت میں باڈی گارڈز اور شہزادوں کے ذاتی عملے میں بھی مغلوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نے مغل جنگی حکمت عملی کو پسند کیا ہے۔اوراس نے اکثر اپنایا ہے اور اس کی وجہ سے

اس نے شرقی بادشاہوں پر فتوحات حاصل کی۔اس کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ سید بادشاہوں کے دور ابتلاء میں افغان واحد جنگ پسند لوگ تھے جو ایک مقصد کے لیے متحد تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ بہلول میں بہت کم انتظامی ذہانت موجود تھی۔ ان کے پاس انتظامی مسائل کو سنجیدگی سے حل کرنے کے مواقع بہت کم تھے۔ وہ فاتح ہونے کے ناطے وہ صحیح تھا اور اسے اپنے دور حکومت کا بڑا حصہ قانون سازی کو برقرار رکھنے میں صرف کیا۔اس نے اپنے پیشروؤں کے لیے انتظامی نظام کو بنائے بغیر چھوڑ دیا۔اور محض اپنے افسروں اور رشتہ داروں کی جگہ لے کر خود کو مطمئن کیا۔ وہ اتنا دور اندیش تھا کہ وہ پٹھان سرداروں کو مساوی سمجھ کر اور اپنے آپ کو ایک قبائلی سردار کے عہدے پر فائز ہونے کا لائسنس دے دیتا تھا۔

اس نے اپنے قبیلے کے افراد کو بہت زیادہ خود مختاری دی تھی۔جو بعد میں اس کے جانشینوں کے دور میں سنگین مسائل کا باعث بنی۔ اس کی موت کے بعد اس کی بادشاہی اس کے بیٹوں، پوتے اور دوسرے وارثوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس کی وجہ سے خونریز خانہ جنگیاں ہوئیں۔یہاں تک کہ اس کے دوسرے بیٹے سکندر لودھی نے اپنے تمام حریفوں کو شکست دے کے سلطان کا تاج سر پر رکھا۔

مورخین ان کے ۳۸ سالہ دور حکومت میں صرف ایک اہم کارروائی کا ذکر کرتے ہیں اور اس کا تعلق افغانوں سے تھا۔پٹھانوں میں رواج تھا کہ جب کسی خاندان میں وفات ہو جاتی تھی۔تو لواحقین کو تعزیت کے لیے آنے والے لوگوں کو شربت (کولڈ ڈرنک)، پان (پانی)، خشک کھجور، گڑ اور چینی پیش کرنی پڑتی تھی۔ بہلول لودھی نے اس رواج کو بند کر دیا کیونکہ یہ غمزدہ خاندان کے لیے بہت مہنگا تھا۔ کھانے پینے کی اشیاء کے بجائے عطر اور خوشبو تقسیم کرنے کا حکم دیا۔

البتہ بہلول نے ہندوستانی سکے کی تاریخ پر دیرپا اثر چھوڑا۔ اس کا جاری کردہ سکہ جسے بہلولی کہا جاتا ہے۔ شیر شاہ سوری اور اکبر کی کرنسی اصلاحات تک معیاری سکہ اور تبادلے کا اہم ذریعہ رہا۔ بہلولیوں میں پیسہ اسی طرح شمار کیا جاتا تھا۔ جس طرح آج لوگ پیسوں کو روپوں میں گنتے ہیں۔

سلطان سکندر لودھی

ساکت کے شمال میں تقریباً ۱۵ میل کے فاصلے پر ملوہ گاؤں میں سلطان بہلول لودھی کی وفات کے ایک دن بعد افغان / پٹھان سردار اگلے حکمران کا انتخاب کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ وہ شہزادوں نظام خان، باربک شاہ اور اعظم ہمایوں کی حمایت کرنے والے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ ایک شخص پر متفق نہ ہو سکے۔ گرما گرم بحثیں ہوئیں کیونکہ ہر گروپ نے اپنے اپنے امیدوار کی حمایت کی۔

شہزادہ نظام خان کی والدہ بی بی سوناری جو ایک ہندو سنار کی بیٹی تھیں۔ وہ سلطان کے آخری سفر میں ان کے ساتھ گئی تھی۔ پردے کے پیچھے سے اس نے سرداروں سے بات کی اور اپنے بیٹے کی خوبیوں کی تعریف کی اور یقین دہانی کروائی کہ وہ شرفاء سے حسن سلوک کرے گا۔

اس پر عیسیٰ خان لودھی نے کہا کہ جب باربک شاہ پیدائشی پٹھان ہے تو سنار کا نواسا تخت پر کیسے بیٹھ سکتا ہے؟

خان خانان فرمالی جنہوں نے شہزادہ نظام خان کی بھرپور حمایت کی۔ جواب دیا۔ "سلطان کی وفات کو صرف دو دن ہوئے ہیں۔ سلطان کی بیوی کی توہین کرنا بے عزتی ہے۔"

عیسیٰ خان نے غصے سے جواب دیا، "تم صرف نوکر ہو، خاندانی معاملات میں کیوں دخل دے رہے ہو؟"

اس سے خان خانان فرمالی کو بہت غصہ آیا۔ اس نے فوری طور پر شہزادہ نظام خان سے وفاداری کی قسم کھائی۔ میٹنگ برخواست ہو گئی تو وہ سلطان کی لاش کو ساتھ لے کر دہلی کی طرف بڑھ گیا- جنہوں نے اس کی حمایت کی تھی۔

جن رئیسوں نے نظام خان کی مخالفت کی تھی -وہ خود باربک شاہ اور اعظم ہمایوں کی حمایت میں بٹ گئے۔ چنانچہ وہ کوئی فیصلہ کیے بغیر وہاں سے چلے گئے اور اس بادشاہ کو ماننے سے انکار کر دیا جسے امراء نے سرکاری طور پر منتخب نہیں کیا تھا۔

شہزادہ نظام خان کو سلطان کی موت کی اطلاع ان کی والدہ اور وزیر (وزیر) عمر خان شروانی نے پہلے ہی خفیہ طور پر دے دی تھی جنہوں نے انہیں خفیہ طور پر کیمپ میں بلایا تھا۔ شہزادہ جمال خان کو دہلی کا کرتا دھرتا مقرر کر کے نظام خان نے بادشاہ بننے کی تیاری شروع کی۔ سکندر لودھی شیخ سمع الدین کمبوہ کی قدم بوسی کے بعد تیزی سے فوجی کیمپ کی طرف بڑھا۔ سلطان بہلول لودھی کی وفات کے بعد سکندر اپنے والد کی میت کے ساتھ فوج میں شامل ہو گیا۔

وہ جلالی کے پاس رکا اور اپنے والد کی لاش کو دہلی بھیج دیا۔ خان جہاں لودھی اور خان خانان فارملی جیسے اہم رئیسوں کے معاہدے سے اس نے خود کو سلطان قرار دیا۔ سلطان سکندر لودھی کی تاج پوشی ۱۷ شعبان ۸۹۴ھ (۱۶ جولائی ۱۴۸۹) کو جلالی کے مقام پر دریائے کالی کے قریب ہوئی۔ یہ تقریب ایک اونچے ٹیلے پر ہوئی جہاں سلطان فیروز تغلق کا ایک شکار کا محل (مالچا محل) تھا۔ بادشاہ بننے کے بعد سکندر نے امراء کی خوشنودی کے لیے ان کو تحائف، گھوڑوں، اعزازی لباسوں، سرکاری عہدوں اور جاگیروں سے نوازا۔

اپنی تاجپوشی کے فوراً بعد سکندر دہلی چلا گیا اور اپنی حکومت مضبوطی سے قائم کی۔ اس کے باوجود کہ بہت سے رئیسوں نے اس کی مکمل حمایت نہیں کی۔ اس وقت اس نے صرف دہلی، پنجاب، اور دوآبہ کے علاقے کا ایک چھوٹا سا حصے پر اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ سلطنت کے بیشتر مشرقی علاقے اس کے حریف بھائیوں کے زیر تسلط تھے - جن میں بربک شاہ اور اعظم ہمایوں شامل تھے۔ مشرق میں اس کا اختیار صرف جلالی تک پھیلا ہوا تھا۔

سکندر کا بنیادی مقصد اپنے بھائیوں بھتیجوں اور ان کے حامیوں کو زیر کرنا تھا تاکہ وہ اپنے والد کے فتح کردی تمام علاقوں پر حکومت کر سکے۔ سب سے پہلے اس نے اپنے بھائی عالم خان لودھی کے خلاف جنگی محاذ آرائی کی۔ جو شہزادہ اعظم ہمایوں کے ساتھ شامل ہوا تھا اور راپری میں سکندر کی مخالفت کی۔ سکندر کی فوج نے راپری اور چندوار کے قلعوں کو گھیر لیا۔ عالم خان عیسیٰ خان لودھی پٹیالی فرار ہو گئے۔ راپری نے ہتھیار ڈال دیے اور اس نے راپری خان خانان لوہانی کو دے دیا گیا۔

پھر سکندر اٹاوہ چلا گیا۔ جہاں وہ سات ماہ رہا۔ عالم خان نے بعد میں ہتھیار ڈال دیے اور وہیں اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ سکندر نے اسے دل کھول کر معاف کر دیا اور اسے اٹاوہ کا گورنر مقرر کر دیا۔

اس کے بعد سکندر نے ۱۴۹۰ء میں عیسیٰ خان لودھی کے خلاف محاذ آرائی کی - کیونکہ عیسیٰ خان نے سکندر کے تخت کے دعوے کی سخت مخالفت کی تھی اور شہزادہ اعظم ہمایوں کی حمایت کی تھی۔ عیسیٰ خان کو جنگ میں شکست ہوئی اور وہ سلطان سکندر کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا مگر وہ زخموں کی تاب نہ لا کر لڑائی کے جلد ہی وفات پا گیا۔ پٹیالی پھر رائے گنیش کو دے دی گئی۔ جو ایک متمول سردار تھا۔ وہ بربک شاہ کی حمایت سے دستبردار ہو کر سلطان کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔

اس کے بعد سکندر نے اسماعیل خان نوحانی کو اپنے بھائی بربک شاہ کے پاس بھیجا اور اس سے کہا کہ وہ سکندر کے نام پر خطبہ جمعہ پڑھے۔ بربک شاہ نے انکار کیا تو سکندر نے اس کے خلاف جنگی کارروائی کی - قنوج میں جنگ ہوئی۔ جنگ کے دوران، کالا پہاڑ (شیخ محمد قربان)، جو بربک شاہ کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ وہ گرفتار ہو گیا۔

سکندر نے قیدی کے ساتھ حسن سلوک کیا اور کالا پہاڑ اس کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر شرمسار ہو گیا۔ اس نے رخ بدل لیا اور سکندر کی طرف سے لڑنا شروع کر دیا۔ بربک شاہ کو شکست ہوئی اور وہ بدایوں کی طرف بھاگا۔ جبکہ شہزادہ مبارک خان لودھی کو گرفتار کر لیا گیا۔ سکندر نے بدایوں تک بربک شاہ کا پیچھا کیا۔ آخر کار بربک نے بے بس ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ سکندر نے اسے معاف کر دیا اور اسے جونپور کے حکمران کے طور پر بحال کر دیا لیکن اپنے نائب کے طور پر اصل طاقت سکندر کے قابل اعتماد افسروں اور امراء کے پاس رہی۔

جونپور سے سکندر کوٹلہ اور کالپی کی طرف بڑھا- جہاں اس نے شہزادہ اعظم ہمایوں لودھی کو شکست دی۔ اس نے کالپی محمود خان لودھی کو دے دیا۔ پھر اس نے اس کے باغی گورنر تاتار خان لودھی کے خلاف جیتھارا کی طرف مارچ کیا، لیکن بعد میں اسے معاف کر دیا اور اسے بحال رہنے کی اجازت دے دی۔

سکندر نے گوالیار کے راجہ مان سنگھ کو خصوصی تحائف کے ساتھ کالا پہاڑ بھی بھیجا۔ جس کی نئے سلطان کے ساتھ وفاداری غیر یقینی تھی۔ راجہ مان سنگھ نے سکندر کا اختیار قبول کر لیا اور اپنے بھتیجے کو بھی سلطان کے استقبال کے لیے بھیجا۔

اس وقت بیانا پر سلطان اشرف جیلوانی کی آزاد حکومت تھی۔ سکندر نے تجویز پیش کی کہ اشرف بیانا کو چھوڑ دے اور اس کے بجائے چندوار، مریرہ اور ساکت لے لے۔ پہلے تو اشرف نے بیانا قلعہ کے حوالے کرنے کا ڈرامہ کیا لیکن ساتھ ساتھ قلعہ کے اندر اپنے دفاع کو مضبوط کیا۔ سکندر نے پھر علاقے کا محاصرہ کر لیا۔ ۱۴۹۱ میں، سلطان اشرف نے آخر کار بیانا میں ہتھیار ڈال دیے۔ سکندر نے اسے خان خانان فارمالی کے حوالے کر دیا۔ آگرہ کے قلعے پر قبضہ کرنے اور سلطان اشرف کو مکمل طور پر ہٹانے کے بعد سکندر دہلی واپس آیا اور وہاں ۲۴ دن رہا۔

دہلی میں قیام کے تیسرے دن پولو کھیلتے ہوئے سکندر کو جونپور میں ایک بڑی بغاوت کی خبر ملی۔ زمیندار اور بچگوتی کے راجپوت تقریباً ایک لاکھ سپاہیوں اور گھڑ سواروں کی فوج کے ساتھ جوگا کے نیچے جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے جونپور میں سکندر کے افسروں کو شکست دی۔ وہاں سکندر کا نمائندہ مبارک خان نوحانی دریائے گنگا کو عبور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا گیا اور اس کا بھائی شیر خان جنگ میں مارا گیا۔ باربک شاہ باغیوں کا مقابلہ نہ کر سکا – کالا پہاڑ کے ساتھ دریا آباد بھاگ گیا۔

سکندر نے جب یہ خبر سنی تو اسے سخت غصہ آیا۔ اس نے فوراً جنگ کی تیاری کا حکم دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے محل میں واپس آنے سے انکار کر دیا اور یہاں تک کہ بغاوت کو کچلنے تک صرف فوجی کیمپ میں رہنے کا فیصلہ کیا۔

جنگی تیاریاں کرنے کے بعد سکندر نے ۱۴۹۱ میں جونپور کی طرف کوچ کیا۔ جب ڈالمائو پہنچا تو فرار ہونے والا باربک شاہ اپنے تمام حامیوں کے ساتھ اس کے ساتھ ہو گیا۔ جب سلطان اپنی پوری فوج کے ساتھ پہنچا تو رائے بھیڈ نے مبارک خان نوحانی کو رہا کر کے سلطان کے پاس بھیج دیا۔

اس کے بعد سلطان جوگا اور اس کے اتحادیوں کی طرف بڑھا۔ ڈالماؤ شہر سے تقریباً آٹھ میل شمال مشرق میں سلطان اسکندر لودھی نے کاٹھ گڑھ میں ڈیرے ڈالے۔

سلطان نے باقی ماندہ فوج کا انتظار کیے بغیر جوگا پر ۱۵۰۰۰ گھڑ سوار اور ۲۰۰۰۰۰ پیادہ، صرف ۵۰۰ سواروں کے ساتھ اچانک حملہ کر دیا۔ جگا بغیر لڑے بھاگا اور اس کی فوج بری طرح شکست کھا کر بکھر گئی۔ لودھی کی فوج نے بڑی مقدار مال غنیمت اکٹھا کیا - جس میں کیمپ سے ملنے والے جوگا کے کپڑے بھی شامل تھے۔ جوگا کا پیچھا جھنڈ کے مضبوط قلعہ تک کیا گیا- جہاں سلطان حسین شرقی تعینات تھے۔

سکندر لودھی نے سلطان حسین شاہ کو ایک پُر امن خط لکھا- جس میں ان سے ماضی کے تنازعات کو بھلا کر صلح کرنے کو کہا۔ اس نے پیشکش کی کہ اگر وہ جوگا اسکے حوالے کر دے تو وہ اپنے زیر قبضہ علاقوں کو اپنے پاس رکھ لے گا۔

تاہم حسین شاہ نے میر (رسول) کے ذریعے خط کا ایک بد تہذیبی سے بھرا توہین آمیز جواب دیا۔ سعید خان نے سکندر لودھی سے کہا "جوگا میری سلطنت ہے- تمہارا باپ جنگجو تھا اس کے ساتھی۔ تلوار سے کرتا تھا- تم میرے سامنے ناتجربہ کار بچے ہو اگر تم زاحمت کروگے میں تم کو جوتے سے ٹھوکریں مارو نگا۔"

سلطان سکندر لودھی نے اپنے سپاہیوں کو جنگی ترتیب سے صف بند کیا۔

عمر خان شروانی کو فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا -- حسین شاہ نے قلعہ سے باہر نکل کر پہلا حملہ کیا۔

حملے میں مایوس کن ہاتھاپائی ہوئی۔ اس جنگ کی قیادت سلطان سکندر لودھی نے ذاتی طور پر کی۔

وہ ایک ہاتھی پر سوار تھا۔ جنگ جس کے نتیجے میں شکست ہوئی۔

اور حسین شاہ کی بہار کے لیے روانہ ہو گیا۔

سلطان نے ہمایوں اور شروانی کو اودھ اور شرقی محاذوں پر تعینات کیا۔

جند سے سلطان نے جون پور کی طرف رخ کیا۔

اس نے بربک شاہ کو ایک بار پھر شرقی پر تعینات کر دیا۔

تخت نشین ہوا اور تقریباً ایک مہینہ اودھ میں شکار اور تفریح کرتے ہوا گزارا۔ جب وہ کاٹ گڑھ آیا تو اس کو

بربک شاہ کی بے دخلی کی اطلاع جونپور سے دوسری بار زمینداروں کے ذریعے ملی۔

وہ غصہ سے بے قابو ہو گیا۔ بربک شاہ کی نااہلی کا حکم اس نے محمد قربان فارملی کو دیا۔ قربان اور ہمایوں خان شیروانی کارا کے راستے جونپور کی طرف گئے۔

سلطان نے سخت حکم دیا کہ بربک شاہ کو گرفتار کر کے اس کے پاس قیدی بنا کر لایا جائے۔ جب بربک کو سلطان کے سامنے لایا گیا تو اسے عمر خان شروانی کی نگرانی میں رکھا گیا۔

اس کے بعد سلطان جونپور کے قریب چلا گیا اور چنار پر حملہ کیا۔ حسین شاہ کے کچھ رئیس جو وہاں ٹھہرے ہوئے تھے شکست کھا کر قلعہ کے اندر چھپنے پر مجبور ہو گئے۔ چونکہ قلعہ بہت مضبوط تھا، اس لیے سلطان نے محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور اس کے بجائے کانتات (پرگنہ کا دارالحکومت) کی طرف بڑھا جو اس وقت ریوا کے علاقے کا حصہ تھا۔

رائے بھید جس نے پہلے مبارک خان کو قید کیا تھا اور بعد میں اسے رہا کر دیا تھا۔ وہ سلطان سے ملنے آیا اور اس کا تصرف قبول کر لیا۔ سلطان نے اسے کانت پر قابو پانے کی اجازت دی۔

بعد میں جب سلطان نے اڑیل کی طرف پیش قدمی کی اور اس کے آس پاس کے علاقوں کو تباہ کر دیا تو رائے بھید بہت خوفزدہ ہو گیا۔ وہ اپنا سارا سامان چھوڑ کر ریوا کی طرف بھاگا۔ سلطان نے فراخدلی سے پیش آیا اور رائے بھید کا سارا سامان اس کے پاس واپس بھیج دیا۔

اس کے بعد سلطان کارا کے راستے ڈلماؤ گیا جہاں اس نے شیر خان کی بیوہ سے شادی کر لی۔

نوحانی خان جو بچگوٹی کی بغاوت میں مارا گیا تھا۔ اس کی بیوہ بہت خوبصورت، پڑھی لکھی اور باصلاحیت عورت تھی۔ سلطان نے اس سے شادی کر لی اور پھر شمس آباد پہنچا۔ چھ مہینے وہاں رہنے کے بعد وہ

سنبھل چلا گیا۔ وہ سنبھل سے واپس شمس آباد واپس آیا۔اس نے راستے میں باغیوں کے قلعوں پر حملہ اور لوٹ مار کی۔

شمس آباد میں برسات کا موسم گزارنے کے بعد سلطان نے ۱۴۹۴عیسوی میں ریوا کے رائے بھید کا تعاقب کیا کیونکہ رائے بھید نے اب بھی شرقی حکمرانوں کا ساتھ دیا۔ سفر میں سلطان باغیوں کے قلعوں پر حملے کرتا رہا اور وہاں رہنے والوں کو لوٹتا رہا۔

کھر کھری کے مقام پر سلطان نے رائے بھید کے بیٹے بیر سنگھ سے جنگ کی اور اسے شکست دی۔ بیر سنگھ ریوا کی طرف بھاگا جبکہ سکندر لودھی نے اس کا لگاتار پیچھا کیا۔ راجہ بھید اس کے بعد سلطان کے ساتھ سر کچ کی طرف بھاگا۔ تاہم راجہ بھید کی راستے میں ہی موت ہو گئی۔

سر کچ سے سلطان نے سیہونڈا (پچھند) کی طرف پیش قدمی کی جو اس علاقے کے زیرِ انتظام تھا۔ سلطان پچھند تک دشمن کا پیچھا کرتا رہا۔ مگر اسے جونپور کی طرف پیچھے ہٹنا پڑا۔غالباً قحط کی وجہ سے۔ واپسی کے سفر میں سیلاب نے اس کی گھڑ سوار فوج کا تقریباًنواں دسواں حصہ تباہ کر دیا۔

جب سلطان جونپور میں اپنی فوج کی تعمیر نو کر رہا تھا۔رائے بھید کا بیٹارائے لکھمی چند مقامی زمینداروں کے ساتھ حسین شاہ کے ساتھ شامل ہو گیا۔ انہوں نے حسین شاہ کو سلطان کی فوج کو ہونے والے بھاری نقصانات سے آگاہ کیا اور اسے حالات سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دیا۔

اس کے بعد حسین شاہ نے ۱۰۰ ہاتھیوں سمیت ایک لشکر اکٹھا کیا اور بہار میں اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل آئے۔ جب سلطان سکندر کو یہ خبر ملی تو اس نے تیزی سے دریائے گنگا کو کانت کے راستے سے عبور کیا اور چنار کے راستے بنارس پہنچا جہاں حسین شاہ جا رہا تھا۔ حسین شاہ آگے بڑھتا رہا اور ۱۴۹۴ء میں بنارس سے تقریباً ۳۶ میل کے فاصلے پر سلطان سکندر لودھی کا مقابلہ کیا۔رائے بھید کے بیٹے سلبہان نے سمجھداری سے جنگ نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور سلطان سکندر کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس کے بعد ہونے والی

جنگ میں حسین شاہ کو بری طرح شکست ہوئی اور وہ بہار کی طرف فرار ہو گیا۔ سلطان سکندر نے نو دن تک اس کا پیچھا کیا اور پھر بنارس میں اپنے کیمپ میں واپس آ گیا۔

پھر سلطان حسین شاہ پر دوبارہ حملہ کرنے کے لیے اپنی مرکزی فوج کو بہار کی طرف لے گیا۔ حسین شاہ نے ملک کنڈو کو بہار کے قصبے کا انچارج چھوڑ دیا اور خود کولگانگ کی طرف بھاگ گیا جو اس وقت بنگال کا حصہ تھا۔ دیوبر نامی جگہ پر سلطان نے حملہ کر کے ملک کنڈو کو شکست دی، وہ بھی بھاگ گیا۔ اس طرح حسین شاہ کا آخری گڑھ بہار ۱۴۹۴ء میں فتح ہوا۔

حسین شاہ نے ۱۴۹۳ سے ۱۴۹۴ عیسوی تک تقریباً ۱۱ سال تک بہار پر حکومت کی۔ بعد ازاں بنگال کے حکمران سلطان علاؤالدین حسین شاہ نے اس کے ساتھ حسن سلوک کیا اور اسے ساری زندگی اچھی پنشن دی۔ حسین شاہ بعد میں گور (برصغیر کے قدیم اور تاریخی شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ شہر موجودہ بنگلہ دیش اور بھارتی ریاست مغربی بنگال کی سرحد کے قریب واقع تھا۔ قدیم زمانے میں اسے لکھنوتی بھی کہا جاتا تھا) میں مر گیا۔

سلطان سکندر لودھی نے ایک سردار مبارک خان نوحانی اور چند دوسرے سرداروں کو بہار میں چھوڑا اور درویش پور نامی جگہ چلا گیا۔

اس نے اپنے دو جرنیلوں (خان خانان نوحانی اور خان جہاں) کو مرکزی فوجی کیمپ اور سامان کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر سلطان نے ترہٹ نامی علاقے کی طرف کوچ کیا۔ ترہٹ کے مقامی حکمران (راجہ) نے بغیر لڑائی کے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

سلطان نے مبارک خان نوحانی کو راجہ سے جزیہ وصول کرنے کے لیے وہاں چھوڑ دیا جس کی مالیت لاکھوں سکے (ٹینکوں) تھی۔ سلطان پھر درویش پور میں فوجی ہیڈ کوارٹر واپس چلا گیا۔ وہاں سے وہ ایک مشہور بزرگ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مقبرے کی زیارت کے گیا - سلطان سکندر لودھی نے مقبرے

پر حاضری دی۔ وہ ممکنہ طور پر اسلامی مہینے شوال کی ۵ تاریخ کو منعقد ہونے والے سالانہ مذہبی تہوار عرس میں شمولیت کے لیے گیا تھا۔

اس کے بعد سلطان درویش پور میں اپنے فوجی کیمپ میں واپس چلا گیا۔ اگلے ہی دن اسے افسوسناک خبر ملی: اس کا ایک اعلیٰ جرنیل خان جہان انتقال کر گیا تھا۔ جنرل کو عزت دینے کے لیے سلطان نے جنرل کے بیٹے کو ایک اعلیٰ شاہی لقب اعظم ہمایوں دیا۔

اس کے بعد سلطان نے اپنے حکمران سلطان علاؤالدین سے لڑنے کے لیے اپنی فوج کو بنگال کی طرف بڑھایا۔ علاؤالدین کو لودھی کی فوج کی نقل و حرکت پر شک تھا۔ جیسے ہی اس نے سنا کہ سکندر لودھی تغلق پور نامی قصبے میں پہنچا ہے۔ اس نے اپنے ہی بیٹے شہزادہ دانیال کی قیادت میں ایک جماعت بھیجی تاکہ معاملات کا ادراک ہو سکے۔ دو حریف فوجیں بارہ نامی قصبے میں آمنے سامنے ہوئیں۔

بڑے پیمانے پر جنگ لڑنے کے بجائے دونوں فریق امن معاہدے پر آمادہ ہوئے۔ معاہدے کے اصول یہ تھے:

"کوئی بھی بادشاہ دوسرے کی زمین پر حملہ نہیں کرے گا۔

بنگال کے بادشاہ نے سکندر لودھی کے دشمنوں میں سے کسی کو نہ چھپانے یا تحفظ دینے کا وعدہ کیا۔

بنگال کے بادشاہ نے باضابطہ طور پر قبول کیا کہ سکندر لودھی اب بہار، ترہوت اور سرن کے نئے زیر قبضہ علاقوں کا مالک ہے۔

لودھی جرنیلوں میں سے ایک یہ معاہدہ تغلق پور میں سلطان کے پاس واپس لایا۔ سلطان نے باضابطہ طور پر امن معاہدے کی منظوری دے دی۔ مگر ایک اور اعلیٰ جنرل، مبارک خان، اجلاس میں سفر کے دوران پٹنہ میں طبی موت مر گیا۔

سلطان اپنے مرکزی پڑاؤ درویش پور واپس آیا اور چھ ماہ تک وہاں رہا۔ جانے سے پہلے اس نے قابل اعتماد رہنماؤں کو اپنے نئے مفتوحہ علاقوں کا انچارج بنایا۔

اس نے شہزادہ اعظم ہمایوں لودھی کو درویش پور کا گورنر بنادیا۔اس نے دریاخان کو بہار کا نیا حکمران بنایا (اپنے والد کی جگہ کو بھرتے ہوئے، جنرل جو ابھی فوت ہوا تھا۔

اس کے بعد سلطان نے سرن کی طرف کوچ کیا، اسے ایک مقامی ہندو سردار سے لے لیا-، اور یہ زمین اپنے سپاہیوں کو بطور انعام (جاگیریں) دے دی۔

آخرکار سلطان جونپور واپس چلا گیا اور چھ ماہ تک وہاں رہا۔ وہاں رہتے ہوئے اس نے اپنے پرانے دشمنوں (شرقی خاندان) پر اپنا غصہ نکالا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے محلات، باغات اور ان سے وابستہ ہر چیز کو تباہ کر دیں۔ یہاں تک کہ اس نے ان کی مساجد کو گرانے کا حکم بھی دیا لیکن مقامی مسلم مذہبی علماء (علماء) نے احتجاج کیا اور اسے روکنے کی التجا کی- جس سے مساجد کو تباہ ہونے سے بچایا گیا۔

سلطان سکندر کے پاس حسین شاہ شرقی کو شکست دینے پر فخر کرنے کی معقول وجہ تھی۔ آخرکار اس نے ایک دیرینہ دشمن کو کچل دیا- جس نے کئی بار دہلی کو فتح کرنے کی کوشش کی تھی۔ بہار اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کر کے سکندر نے شرقی خاندان کا مکمل خاتمہ کر دیا۔

بنگال کے سلطان علاؤالدین کے ساتھ ایک امن معاہدے پر دستخط کر کے اپنی مشرقی سرحدوں کو محفوظ کرنے کے بعد اور جونپور شہر کے بیشتر حصے کو تباہ کرنے کے بعد سلطان نے اپنے اگلے کام کی طرف رجوع کیا: جسکی ان حکمرانوں کو سزا دینا تھا جنہوں نے حسین شاہ کی مدد کی تھی۔

سلطان بھٹہ کے راجہ (بادشاہ) سے تین وجوہات کی بناپر ناراض تھا۔

راجہ نے حسین شاہ کو سکندر پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔

سکندر ۱۴۹۴ میں پہلے کی فوجی مہم کے دوران بھٹہ کو فتح کرنے میں ناکام رہا تھا، جس نے اس کے غرور کو زخمی کر دیا۔

راجہ کے بیٹے اور جانشین رائے سلبہان نے سکندر کو اپنی بیٹیوں میں سے ایک کا رشتہ نہ دے کر اس کی توہین کی تھی۔

اس کی وجہ سے سکندر نے ۱۴۹۸ میں ریوا پر حملہ کر دیا- بدلہ لینے کے لیے اس کی فوج نے اس علاقے کو بے دردی سے لوٹ لیا۔ اس نے دوسری بار بندھو گڑھ کے خلاف مارچ کیا، جو دارالحکومت شہر اور صوبے کے سب سے مضبوط قلعے تھے۔ مگر محافظوں نے بہادری سے مقابلہ کیا اور قلعہ بہت مضبوط تھا، اس لیے سکندر اس پر قبضہ کرنے میں ناکام رہا۔ اس نے محاصرہ ختم کر دیا اور جونپور واپس آ گیا- اس نے پسپائی کے راستے میں دیہی علاقوں کو تباہ کر دیا۔

جونپور میں قیام کے دوران سکندر نے حکومتی انتظام پر توجہ دی۔ اس نے جونپور کے گورنر مبارک خان لودھی کے کھاتوں کا آڈٹ کیا اور پتہ چلا کہ گورنر ریاست کا پیسہ (غبن) چوری کر رہا تھا۔

اگرچہ مبارک خان کے خاندان اور دوستوں نے نرمی کی بھیک مانگی۔ لیکن سلطان نے کوئی رحم نہیں کیا۔ انہوں نے مبارک خان کو حکم دیا کہ وہ کئی سالوں سے غائب جزیے کی واپسی کریں۔ اگرچہ یہ سزا منصفانہ تھی - لیکن اس نے بہت سے دوسرے پٹھان سرداروں کو ناراض اور پریشان کر دیا کہ مستقبل میں ان کے ساتھ بھی قدر سختی سے برتاؤ کیا جائے گا۔

سلطان ۱۴۹۹ میں سنبھل چلا گیا اور وہاں چار سال تک رہا- کیونکہ اسے وہاں کا موسم پسند تھا۔ اس نے اپنا وقت حکومت چلانے اور شکار اور پولو جیسے کھیلوں سے لطف اندوز ہونے کے درمیان تقسیم کیا۔

اس دوران ناراض سرداروں نے اس کا تختہ الٹنے کے خفیہ منصوبے شروع کر دیے۔ یہ سازش سنبھل سے شروع ہوئی اور دہلی اور پنجاب تک پھیل گئی۔ امراء پہلے ہی پریشان تھے کہ سلطان نے جونپور میں مبارک خان کے ساتھ کتنا سخت سلوک کیا اور انہوں نے اس بات کا فائدہ اٹھایا کہ سلطان اپنی جنگوں کے دوران اتنے عرصے تک مغربی صوبوں سے دور رہا۔

پولو میچ کے دوران ایک پر تشدد لڑائی کے بعد سلطان نے اس سازش کو دریافت کیا۔

ایک دن کھیل کے دوران، سلیمان (دریا خان نامی رئیس کا بیٹا) کے سر پر غلطی سے ہیبت خان کا پولو اسٹک لگ گیا۔

بدلہ لینے کے لیے سلیمان کے بھائی خضر خان نے جان بوجھ کر ہیبت خان کے سر پر اس کے چھرے سے وار کیا۔

دوسرے رئیس ہیبت خان کو پر سکون کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اسے گھر لے گئے - لیکن غصہ اتنا زیادہ تھا کہ سلطان تین دن تک اپنے محل سے نکلنے سے ڈرتا تھا۔

چوتھے دن جب سلطان بالآخر باہر نکلا تو ہیبت خان کے ایک رشتہ دار نے خضر خان پر گھات لگا کر اس کے سر پر موٹی لکڑی دے ماری۔

ایک ہنگامہ برپا ہوا اور شمس خان نامی شخص کو سلطان (سکندر لودھی) کے حکم سے مارا پیٹا گیا۔ اس پر شمس خان کے حامی سرداروں کے اس گروپ میں شامل ہونے کے لیے پہنچ گئے جو پہلے ہی حکمران کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔

سلطان سکندر کو شک ہوا کہ کوئی خطرناک سازش پک رہی ہے۔ اس نے خود کو اپنے محل کے اندر بند کر لیا اور اپنی حفاظت کے لیے وفادار اور مسلح جنگجوؤں کی خدمات حاصل کر لیں۔

اس دوران میں سکندر کے سخت اور بے لچک اصولوں سے تنگ آنے والے بائیس سرداروں نے اسے اقتدار سے ہٹانے اور اس کی جگہ شہزادہ فتح خان کو تخت پر بٹھانے کا خفیہ منصوبہ بنایا۔

اس شہزادے نے یہ راز اپنی والدہ اور اپنے روحانی رہنما شیخ طاہر کو بتا دیا۔ شیخ نے شہزادے کو مشورہ دیا کہ وہ اس سازش کو سلطان کو بتائے تاکہ اس پر باغیوں کی مدد کرنے کا الزام نہ لگے۔

ایک بار جب سلطان کو حقیقت کا پتہ چلا تو اس نے سازش میں ملوث ہر فرد کو یا تو جلاوطن کر دیا یا پھانسی دے دی۔ دہلی کے گورنر اصغر خان سمیت پنجاب کے کئی طاقتور رہنما اس سازش کا حصہ تھے۔

سلطان نے ماچھی واڑہ کے گورنر خواص خان کو حکم دیا کہ وہ جا کر اصغر خان کو گرفتار کرے۔ لیکن خواص خان کے دہلی پہنچنے سے پہلے ہی اصغر خان دہلی کے قلعے سے فرار ہو گیا (۱۵۰۰) میں وہ رحم کی بھیک مانگنے

کے لیے سیدھا سنبھل میں سلطان کے دربار میں گیا۔ سلطان نے اسے معاف کرنے کے بجائے جیل میں ڈال دیا۔

اپنے بیٹے کو دہلی کا انچارج بنانے کے بعد خواص خان سلطان کے دربار میں حاضر ہوا اور اسے اس کی وفاداری کا صلہ ملا۔ مگر سلطان نے پنجاب کے سازشیوں پر کوئی رحم نہیں کیا۔ جن میں سعید خان شروانی، تاتار خان اور محمود شیلی جیسے رہنما شامل تھے۔ جیسا کہ اصغر خان نے کیا تھا۔ یہ لوگ اپنے طور پر سنبھل کی طرف روانہ ہوئے- یہ توقع رکھتے ہوئے کہ سلطان بہر حال انہیں بلانے ہی والا ہے۔ سلطان نے ان میں سے کچھ کو قتل کر دیا اور باقی کو جلاوطن کر دیا۔ جلاوطن رئیس پھر گوالیار کے راستے گجرات کے علاقے کی طرف روانہ ہوئے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد (۱۵۰۱ اور ۱۵۰۲ کے درمیان) سلطان کو گوالیار کے حکمران راجہ مان کی طرف سے ایک وفد ملنے آیا۔ راجہ سلطان کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ گوالیار نے ان باغی رئیسوں کو پناہ دی تھی جو سکندر سے بھاگے تھے۔ راجہ مان نے اپنے قاصد نہال نامی محل کے اہلکار کے ذریعے تحفے بھیجے اور دوستی اور وفاداری کا وعدہ کیا۔ نہال نے غیر تسلی بخش اور غیر مہذب جوابات دیئے - سلطان نے غصے میں قاصدوں کو برخاست کر دیا اور گوالیار پر حملہ کرنے کی دھمکی دی۔ عماد الملک اور سلیمان نامی دو بھائیوں کو ان کے والد خان خانان کے انتقال کے بعد بیانا کے علاقے کا کنٹرول سونپا گیا تھا۔ وہ باغیوں کے حملوں کی وجہ سے بیانا چھوڑنے پر مجبور ہوئے جو کہ غالباً دھول پور کے راجہ کی طرف سے مشتعل تھے۔

اس مصیبت نے سلطان سکندر کو دھول پور پر حملہ کرنے کا بہترین بہانہ فراہم کیا۔ اس نے خواص خان کو بیانا کا نیا گورنر بنایا اور صفدر خان کو آگرہ کا منتظم مقرر کیا (جو اس وقت بیانا پر منحصر ایک چھوٹا سا علاقہ تھا)۔ جہاں تک عماد اور سلیمان کا تعلق ہے-سلطان نے انہیں جلیسر، منگلور، شاہ آباد اور چند دیگر اضلاع کا کنٹرول دے دیا۔

سلطان نے میوات کے گورنر عالم خان اور راپری کے گورنر خان خانان لوہانی کو بیانا کے خواص خان کی مدد سے دھول پور پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔

دھول پور کے حکمران رائے مانک دیو نے فوری طور پر مقابلہ کیا۔ جنگجو دھول پور پہنچے اور قلعہ کو گھیرے میں لینا شروع کر دیا۔

ہر روز چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی تھی۔ ان لڑائیوں میں بہت سے مسلمان مارے گئے جن میں خواجہ بابان بھی شامل تھے -جو ایک بہت بہادر سپاہی تھے۔

جب سلطان کو یہ خبر ملی تو وہ جلدی سے سنبھل سے نکل کر دھول پور کی طرف چلا گیا۔ وہ ۶ رمضان ۹۰۶ھ (۲۵مارچ ۱۵۰۱ء) بروز جمعہ وہاں پہنچے۔

جب سلطان دھول پور کے قریب پہنچا تو رائے مانک دیو بھاگ کر گوالیار چلا گیا۔ اس نے اپنے خاندان اور پیروکاروں کو دھول پور قلعہ کے اندر چھوڑ دیا۔

اس کے سپاہی لڑائی جاری نہ رکھ سکے اور آدھی رات کو قلعہ سے نکل گئے۔

چنانچہ اگلی صبح دھول پور قلعہ پر بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کر لیا گیا۔

انہوں نے علاقے کی ہر چیز کو لوٹا اور تباہ کر دیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے دھول پور کے قریب باغات میں درختوں کو بھی نہ بخشا- جو ایک قدیم جنگل تھا۔ یہ درخت اتنے بڑے تھے کہ جن کا سایہ چودہ چودہ میل تک پھیلا ہوا تھا۔

سلطان ایک ماہ تک دھول پور میں رہا۔ جب وہ چلا گیا- تو اس نے آدم لودھی نامی ایک پٹھان سردار کو دوسرے لیڈروں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ وہاں ٹھہرایا۔ اس کے بعد سلطان نے گوالیار کی طرف کوچ کیا کیونکہ گوالیار کے بادشاہ (راجہ) نے اسے دو بار ناراض کیا تھا - پہلی دفعہ اس نے سلطان کی سلطنت سے بھاگنے والے باغیوں کو چھپا کر- اور دوسری دفعہ دھول پور کے راجہ مانک دیو کی حفاظت کر کے۔

دریائے چمبل کو عبور کرنے کے بعد سلطان نے دریائے آسن (جسے مینڈ کی بھی کہا جاتا ہے) کے کنارے دو ماہ تک کیمپ لگایا۔ دریا کا پانی گندا اور غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے اس کے سپاہیوں میں ایک خوفناک بیماری پھیل گئی۔

لڑائی کو روکنے کے لیے، راجہ مان (گوالیار کے بادشاہ) نے ایک سرکاری نمائندے کو مذاکرات کے لیے بھیج کر امن کے لیے کہا۔ اس نے باغیوں (سعید خان، بابو خان، اور رائے گنیش) کو باہر نکال دیا جو سلطان کی سلطنت سے بھاگ کر اس کے قلعے میں چھپ گئے تھے۔

اس وعدے کے طور پر کہ وہ امن کے لیے مخلص ہے-راجہ مان نے اپنے بیٹے کو سلطان کے پاس یرغمال بنا کر رہنے کے لیے بھیجا۔ سلطان اس اقدام سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے شہزادے کو ایک سرکاری لباس بطور تحفہ دیا۔

سلطان سکندر لودھی ۲

۱۵۰۴ء میں سلطان سکندر لودھی نے گوالیار کے قریب مندریال کے قلعے پر حملہ کیا۔ قلعہ کے لوگوں نے بغیر لڑے ہتھیار ڈال دیئے۔ سلطان نے مندروں کو تباہ کیا اور وہاں مساجد تعمیر کیں۔ وہ اپنے افسروں کو انچارج چھوڑ کر آگرہ واپس چلا گیا۔

اس کے بعد یہ علاقہ بہت گرم موسم بیماری (بخار) اور دریائے یمن کے پار باغی راجپوتوں کے حملوں سے دوچار ہوا۔ اس کے لیے صورتحال انتہائی غیر محفوظ ہو گئی۔

ان مسائل کی وجہ سے سلطان نے علاقے کو بہتر طریقے سے کنٹرول کرنے کے لیے دریائے جمنا کے کنارے ایک نیا شہر بسانے کا فیصلہ کیا۔

اس نے دانشمندوں کی ایک جماعت کو ایک اچھی جگہ تلاش کرنے کے لیے بھیجا۔ انہوں نے دریا کے دونوں کناروں کا جائزہ لیا اور مناسب جگہ کا انتخاب کیا۔

سلطان خود کشتی کے ذریعے اس جگہ کو دیکھنے گیا۔ جب اس نے کشتی والے سے پوچھا کہ اسے کون سا پہلو پسند ہے تو اس نے کہا "آگرہ" یعنی سامنے والی جگہ۔ سلطان کو یہ نام پسند آیا اور اس نے نئے شہر کو آگرہ کہنے کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ آگرہ تعمیر کیا گیا۔ جسکی انتظامی اور دفاعی لحاظ سے ایک اہم شہر بن گیا۔

سلطان سکندر لودھی نے ایک نیا شہر بنانے کا حکم دیا۔ اس نے بسائی گڑ گاؤں اور پوپا (بیانا کے دیولی علاقے میں واقع) گاؤں سے زمین لی اور اسے بنانے کے لیے نو مقامی اضلاع کو شامل کیا۔ وہاں ایک قلعہ بنانے کا حکم دینے کے بعد سلطان دھول پور گیا۔ اسے مقامی حکمران رائے مانک دیو سے چھین کر ملک قمر الدین نامی ایک جرنیل کو دے دیا۔ ۱۵۰۶ میں سلطان اس نئے شہر آگرہ میں واپس آیا اور اپنے سرداروں کو ان کی جاگیروں میں واپس بھیج دیا۔

جب وہ آگرہ میں قیام کے دوران چھ جولائی ۱۵۰۵ کو اس علاقے میں ایک زبردست زلزلہ آیا۔ یہ اتنا شدید تھا کہ پہاڑ لرز اٹھے اور بلند عمارتیں گر گئیں۔ لوگوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے دنیا کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ شمالی ہندوستان کے بیشتر قصبوں اور دیہاتوں میں اس زلزلے کے جھٹکے محسوس کیے گئے۔

سلطان سکندر لودھی نے ۱۵۰۵ میں گوالیار کی طرف کوچ کیا۔ حملہ دھول پور کے راجہ مانک دیو نے کیا تھا۔ سلطان سکندر نے مانک دیو کو دوسری بار دھول پور سے بے دخل کر دیا۔ جس سے مانک دیو کو گوالیار فرار ہو گیا۔ جہاں مقامی حکمران نے اس کے مقصد کی حمایت کی اور سلطان کے لیے پریشانی کا باعث بنے۔ - سلطان ایک ماہ تک دھول پور میں رہا۔ اس کے بعد اس نے گوالیار کے علاقے میں داخل ہونے کے لیے دریائے چمبل کو عبور کیا۔ اس نے شہزادوں ابراہیم خان اور جلال خان کو دھول پور میں پیچھے رہنے کے لیے کہا۔

سلطان نے مقامی راجپوت جنگجوؤں کا پہاڑیوں اور جنگلوں میں تعاقب کیا۔ جہاں اس کی افواج نے ان میں سے بہت سے لوگوں کو ہلاک اور گرفتار کر لیا۔ مگر اس کی شاہی فوج کے پاس جلد ہی خوراک کی کمی ہو گئی۔ کیونکہ کچے راستوں کی وجہ سے اناج کے تاجروں (بنجاروں) کے لیے سامان لانا مشکل ہو گیا تھا۔

جب شاہی فوج گوالیار میں چتاوڑ پہنچی۔ تو اس کے پیشگی محافظوں نے جو کہ مرکزی فوج سے چار میل آگے چل رہے تھے۔ گھات لگا کر حملہ کیا۔ اس کے بعد ایک خونریز جنگ ہوئی۔ سلطان کی فوجیوں نے زیادہ تر اودھ خان اور احمد خان (خان خانان کے بیٹے) کی بہادری کی وجہ سے جنگ جیت لی۔ اس لڑائی میں بہت سے راجپوت مارے گئے۔

اس کے بعد سلطان نے مزید آگے نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ واپس مڑا اور دھول پور کے راستے آگرہ واپس آ گیا۔ اس نے بارش کا موسم آگرہ میں گزارا۔ اپنے سرداروں کے ایک گروپ کو چھوڑ کر بشمول اودھ خان کے جو دھول پور میں تعینات تھا۔

دھول پور کا دورہ کرنے کے بعد سلطان آگرہ واپس آیا۔ اس نے سرحدوں سے اپنے بہت سے پٹھان سرداروں کو اکٹھا کیا۔ ممکنہ طور پر گوالیار کو فتح کرنے کے لیے حتمی حملے کا منصوبہ بنایا۔

مگر اسے گلے کی بیماری نے آلیا —ہو سکتا ہے کینسر جیسی بیماری ہو- جس سے وہ شدید بیمار ہو گیا۔ اس نے اپنی بیماری کو پوشیدہ رکھا۔ چپکے چپکے علاج معالجہ کرتا رہا۔ اور لوگوں سے ملنا جاری رکھا اور معمول کے مطابق گھڑ سواری کرتا رہا۔ آخر کار بیماری اس حد تک بڑھ گئی کہ وہ کھانا یا پانی نگلنے سے محروم ہو گیا اب وہ بمشکل سانس لے رہا تھا۔

اخر کار ۲۱ نومبر ۱۵۱۷ (۷ ذی القعد ۹۲۳ ہجری) کو وہ دنیا فانی سے کوچ کر گیا۔

اس نے ۲۸ سال، ۲ مہینے اور ۲۰ دن حکومت کی۔ جنت الفردوس میں ان کے داخلے کا جشن منانے والے اسلامی جملے کی عددی قدر ان کی وفات کے سال سے ملتی ہے- ۹۲۳ ہجری۔ انہیں دہلی میں اپنے ہی باغ لودھی گارڈن میں اپنے ہی بنوائے عالی شان مقبرے میں دفن کیا گیا- جو صفدر جنگ کے مقبرے سے تقریباً ایک میل اور چوتھائی دور ایک قدیم پتھر کے پل کے قریب ہے۔

سلطان سکندر لودھی کے مالوہ، ملتان اور کشمیر سے تعلقات

۹۱۲ ہجری (۱۵۰۶عیسوی) میں موسم گرما کے آخر میں سلطان نے عماد خان فارملی اور مجاہد خان کی قیادت میں ایک مضبوط پیشگی فوج بھیج کر قلعہ اونٹ گڑھ کو فتح کیا جو گوالیار کا گیٹ وے سمجھا جاتا تھا۔ سلطان سکندر لودھی سرکاری کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے کچھ عرصہ دارالحکومت (آگرہ) میں مقیم رہا۔ اس دوران اس نے قاضی عبداللہ، شیخ عمر اور شیخ ابراہیم کو شاہی ایوان کے طور پر مقرر کیا۔ اس نے جلال خان کو کالپی کا نیا گورنر بھی بنایا۔

اس دوران جلال خان کے بھائی حاجی خان اور بھیکہن خان آپس میں لڑ رہے تھے۔ اس جھگڑے کی وجہ سے سلطان نے انہیں ان کے عہدوں سے واپس بلالیا اور ان کی جگہ فیروز اعوان کو تعینات کر دیا۔

آخر کار سلطان آگرہ سے دھول پور میں اپنی پیشگی فوج میں شامل ہونے کے لیے روانہ ہوا۔ اس نے مجاہد خان کو دھول پور کا انچارج چھوڑ دیا اور مہم جاری رکھنے کے لیے دریائے چمبل کو عبور کیا۔

سلطان ۱۵۰۵ میں قلعہ اونٹ گڑھ پہنچا۔ محاصرے کی تیاری کر کے اس نے تمام سامان اکٹھا کرنے کے بعد ایک ایسے وقت میں چاروں طرف سے حملہ شروع کر دیا- جب اس کے نجومیوں نے اسے خوش قسمت قرار دیا۔ حملہ آور چیونٹیوں اور ٹڈیوں کی مانند بڑی تعداد میں قلعے کو گھیرے میں لے آئے اور بہادری سے لڑے۔ راجپوت محافظوں نے بہادری سے مقابلہ کیا۔

بالآخر ملک علاؤالدین نامی ایک جرنیل نے قلعہ کی دیوار کے ایک حصے کو توڑا جو نڈر تھا اور بہادری سے لڑا تھا۔ قلعہ طوفان کی زد میں آگیا۔ لیکن راجپوت مزاحمت کرتے رہے۔ اپنے گھروں کے اندر چھپ کر شدت سے گولہ باری کرتے رہے۔ جنگ کے دوران ملک علاؤالدین کی آنکھوں میں تیر مار کر اسے اندھا کر دیا گیا۔ شدید مزاحمت کے باوجود دفاع ناکام رہا۔ باقی راجپوت سپاہیوں نے آخری دم تک لڑتے رہے۔ حتیٰ کہ ان کی بیویوں اور بچوں نے جوہر کی رسمی آگ میں مرنے کا انتخاب کیا۔ (گرفتاری سے بچنے

کے لیے اجتماعی خود سوزی) سلطان نے مجاہد خان نامی ایک کمانڈر کو قبضہ شدہ قلعے کا انچارج بنایا۔ اس کے بعد اس نے اپنی توجہ مقامی مندروں کو ڈھانے اور ان کی جگہ مساجد بنانے پر مرکوز کی۔ لیکن سلطان کو جلد ہی پتہ چلا کہ مجاہد خان نے مسلمانوں کو علاقے سے باہر نکالنے کے لیے اونٹ گڑھ کے مقامی راجہ (بادشاہ) سے رشوت لی تھی۔ ۱۶ جون ۱۵۰۷ کو سلطان نے ملا جمن (ایک عدالتی اہلکار جس نے مجاہد خان کی مدد کی تھی) کو قید کر دیا اور اپنے افغان رشتہ داروں کو بھی مجاہد خان کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔

جون ۱۵۰۷ کے آخر میں سلطان سکندر لودھی آگرہ کے لیے روانہ ہوا۔ راستہ تنگ گھاٹیوں پر مشتمل تھا ۔ جنگی کانوائے کو متوازن چلانے کے لیے ہجوم کو روکنے کے لیے سلطان نے راستے میں منظم کیمپ لگائے۔ اس منصوبہ بندی کے باوجود ایک بڑی تباہی آگئی۔

پانی نہ ہونے کی وجہ سے بڑی تعداد میں فوجی اور جانور مرنے لگے۔ جب وہ اونٹ گڑھ اور دھول پور کے درمیان پہاڑیوں سے گزرے تو پانی اتنا کم ہو گیا کہ ایک کپ کی قیمت ۱۵ ٹنکے (چاندی کا سکہ) تک پہنچ گئی۔ کچھ لوگ پانی کی کمی کی وجہ سے اور کچھ زیادتی سے مر گئے۔ جب سلطان نے لاشوں کو اکھٹا کر کے سروں کی گنتی کا حکم دیا تو صرف ۸۰۰ آدمی بچ رہے۔ ۸ جون ۱۵۰۷ کو سلطان آخر کار بارش کے موسم میں قیام کے لیے آگرہ پہنچا۔

سکندر لودھی کے دور کا آغاز سلطنت ملتان کے ساتھ سفارتی بات چیت کے آغاز کے ساتھ ہوا۔ ایک علاقہ جسے اس کے والد بہلول لودھی نے فتح کرنے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہے تھے۔

۱۴۸۹ء میں جب سلطان بہلول کا انتقال ہوا تو ملتان کے حکمران حسین شاہ لانگاہ نے تعزیت کے لیے دہلی کو ایک دوستانہ پیغام بھیجا تھا۔ اس نے امن معاہدہ تجویز کیا اور تحائف بھیجے۔ دہلی اور ملتان کی حکومتوں کے درمیان ایک باضابطہ امن معاہدے پر کامیابی سے دستخط ہوئے۔

۱۴۸۹ میں جو جنگی معاہدہ لنگاہ اور لودھیوں کے درمیان ہوا۔ اس کے مطابق سے کسی کو بھی دوسرے کے علاقوں کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنی ہو گی اور کسی بھی حال

میں وہ مدد سے کبھی انکار نہ کریں گے۔ اس معاہدے پر فریقین کے رئیسوں اور درباریوں نے دستخط کیے اور ملتان کے سفیروں کو تحائف اور اعزازی لباس کے ساتھ واپس بھیج دیا گیا۔ لنگاہ نے بڑھاپے میں اپنے بیٹے فیروز شاہ لانگا کے حق میں تخت سے دستبردار ہو کر عبادت کی زندگی گزاری۔ تاہم فیروز لنگا کو اس کے وزیر عمود الملک نے بادشاہ کے حکم سے اپنے بیٹے بلال کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے زہر دے دیا تھا۔ اس پر حسین لانگا نے اپنی گوشہ نشینی ترک کر کے ایک بار پھر حکومت کا چارج سنبھالا۔ اس نے اپنے پوتے محمود لانگا کو (جو کہ فیروز لنگا کا بیٹا تھا) جانشین نامزد کیا۔ حسین لانگا نے اپنے ماموں جام بایزید کو غدار ٹھہرایا - جسے اس نے وزیر اور نوجوان محمود کا استاد بنایا تھا۔ حسین شاہ کا انتقال ۹۰۸ھ / ۱۵۰۲ء میں ہوا، نوجوان محمود نے اپنے ساتھیوں کا انتخاب غلط کیا۔ پست اخلاق اور بد کردار کے لوگ اس کے مشیر بن گئے۔ بایزید سلطان سکندر لودھی سلطان کا نافرمان تھا۔ وہ دربار میں حاضر نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے بایزید کے بیٹے عالم خان کو گرفتار کرنے کی سازش کی جب وہ پر شاہی دربار میں حاضری کے لیے آیا۔ عالم خان خود کو متواتر حملوں سے بچانے میں ناکام رہا۔ اس نے اپنا خنجر نکالا اور اسے دائیں بائیں اپنے حملہ آوروں پر پھینک دیا۔ لڑائی میں وہ بادشاہ کو زخمی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب بادشاہ نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ تو اس کے بد عنوان دوست اس کی حفاظت کے لیے دوڑ پڑے۔ جس کی وجہ سے عالم خان آزاد ہو کر فرار ہو گیا۔

فرار ہونے کے بعد بایزید نے عالم خان کو ایک لشکر کے ساتھ دریائے چناب کے بائیں کنارے پر واقع قلعہ شور (شور کوٹ) بھیج دیا۔ بایزید کامیابی سے لڑا اور شاہی دستوں کو شکست دی جو ان کا پیچھا کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔

ایک بار جب وہ بحفاظت شور کوٹ پہنچ گیا۔ تو بایزید نے سلطان سکندر لودھی کو پیغام بھیجا کہ محمود لانگا کے خلاف اس کی فوجی مدد کی جائے۔ دہلی کے ساتھ اپنی وفاداری ظاہر کرنے کے لیے بایزید نے خطبہ (باضابطہ جمعہ کا خطبہ) پڑھا اور اس مقام پر سلطان سکندر لودھی کے نام کے سکّہ (سکے) جاری کرائے گئے۔

سکندر لودھی نے اس کی حمایت کا وعدہ کیا اور پنجاب کے گورنر دولت خان لودھی کو حکم دیا کہ وہ جا کر اس کی مدد کرے۔ اسی دوران محمود لانگا نے تازہ فوج کے ساتھ شور کی طرف کوچ کیا۔ اسے روکنے کے لیے جام بایزید اور عالم خان قلعہ کے باہر ۲۰ میل آگے بڑھے۔ جہاں وہ ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔
دونوں فوجیں کچھ دیر تک آمنے سامنے رہیں۔ ایک دوسرے کی طاقت کا اندازہ کرتی رہی اور بالآخر دونوں فریقین امن معاہدے پر راضی ہو گئے اور واپس روانہ ہو گئے۔ معاہدے کی شرائط میں کہا گیا تھا کہ دریائے راوی دونوں ریاستوں کے درمیان باضابطہ سرحد کے طور پر قائم رہے گا- اور کسی بھی فریق کو دوسرے کے علاقے پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ جام بایزید لودھی خاندان کی حفاظت میں قلعہ شور میں واپس آیا۔ جب کہ دولت خان لودھی پنجاب واپس چلا گیا۔ مگر یہ معاہدہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکا اور یہ سلطان سکندر لودھی کی وفات کے فوراً بعد ٹوٹ گیا تھا۔
سلطان ابو سعید مرزا کے دور کے بعد تیموری سلطنت کا اتحاد ٹوٹ گیا۔ حکمرانوں نے کابل اور ان کے مغربی صوبوں کا کنٹرول کھو دیا۔ اس وقت ہندوستان میں ان کے علاقوں میں شور، خوشاب، چناب، بھیرہ اور چنیوٹ کے علاقے شامل تھے۔
جب غازی خان (مرزا علی بیگ کا بیٹا) تیموریوں کے لیے ان ہندوستانی سرزمینوں پر حکومت کر رہا تھا تو ملتان کے حسین شاہ لانگاہ نے شور کوٹ اور چنیوٹ کے قلعوں پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ غازی خان کا بیٹا سید علی خان ملتان کے بادشاہ سے بہت خوفزدہ تھا۔ اپنی حفاظت کے لیے اس نے سلطان سکندر لودھی کے حتمی اختیار کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے یہ حکم دے کر اپنی وفاداری ظاہر کی کہ خطبہ (باضابطہ جمعہ کا خطبہ) پڑھا جائے اور سکندر لودھی کے نام پر سکہ (سکے) بنائے جائیں۔
پندرہ سو پانچ میں مغل حملہ آور بابر نے ہندوستانی سرحد پر اپنی پہلی مختصر نمائش کی اور پھر وہاں سے چلا گیا۔ بابر کے جانے کے بعد موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، دولت خان لودھی (پنجاب کے گورنر اور تاتار

خان لودھی کے بیٹے) نے باضابطہ طور پر اقتدار سنبھال کر بھیرہ، خوشاب اور چناب کو اپنے ماتحت علاقوں میں شامل کیا۔

اس کا بنیادی مقصد ان علاقوں کو بابر نامی تیموری شہزادے کے ہاتھ میں جانے سے روکنا تھا جس نے اپنی خاندانی وراثت کے حصے کے طور پر ان کی ملکیت کا دعویٰ کیا تھا۔

سلطان سکندر لودھی کشمیر میں اپنے والد سے زیادہ کامیاب ہو چکا تھا۔

اس وقت کشمیر کی سیاسی صورتحال انتہائی غیر مستحکم تھی۔

کشمیر کے سلطان محمد نے تاتار خان لودھی نامی جرنیل کو ۱۴۹۳ء میں شکست دی۔

سلطان محمد اپنے چچا فتح خان سے ۱۴۹۶ میں لڑائی کے بعد اپنا تخت کھو بیٹھا اور اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔

وہ جیل سے فرار ہوا اور ۱۵۰۵ میں اپنا تخت لودھی خاندان کی مدد سے دوبارہ حاصل کر لیا۔

لیکن صرف ۱۳ ماہ بعد ۱۵۰۶ میں وہ تخت دوبارہ فتح خان سے ہار گئے۔

دوسری بار نکالے جانے کے بعد محمد شاہ حفاظت کے لیے سلطان سکندر لودھی کے پاس گیا۔ سکندر لودھی نے اس کی مدد کے لیے ایک بڑی فوج بھیجی۔ لودھی فوج نے کشمیری افواج کو ایک جنگ میں شکست دی جس میں کشمیری جنرل جہانگیر خان بکری اور اس کا بیٹا مارا گیا۔ فتح خان بھاگ کر شمالی ہندوستان (ہندوستان) چلا گیا، جہاں ۱۵۲۶ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس فتح کی وجہ سے محمد شاہ نے تیسری بار کشمیر کا تخت سنبھالا۔ سکندر لودھی کی موت تک وہ لودھیوں کی حفاظت میں رہا۔ مگر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ دہلی اور آگرہ کے سلطان نے کشمیر کے روزمرہ کے اندرونی معاملات میں درحقیقت کتنی مداخلت کی تھی۔

بالآخر، سلطان سکندر لودھی کشمیر میں اپنی فوجی مہمات میں انتہائی کامیاب رہا۔ وہ اپنے بادشاہت کو پھیلانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ حکومت بہت مضبوط نہیں تھی اور اس کا خاتمہ جب ابراہیم لودھی کے اقتدار میں ہوا۔ جس کے نتیجے میں خانہ جنگی شروع ہوئی جو بالآخر پانی پت کی تباہ کن جنگ میں ختم

ہوئی۔چونکہ سلطان سکندر لودھی نے دھول پور کو فتح کیا تھا اور گوالیار، بھٹہ اور بندیل کھنڈ میں فوجی مہمات کی قیادت کی تھی۔اس لیے اس کے علاقے اب براہ راست مالوہ کی سلطنت سے متصل تھے۔
مالوہ کے سلطان غیاث الدین خلجی کا ۱۵۰۰ء میں انتقال ہوا۔اس کی موت ایک لرزہ خیز اندرونی خانگی جنگی کے بعد ہوئی۔

غیاث الدین کو اس کے اپنے بیٹے ناصر الدین نے قید کر رکھا ہوا تھا۔یہ ان کے دو بیٹوں شہزادہ ناصر الدین اور شہزادہ شجاعت خان (جن کی والدہ ملکہ خورشید نے ان کی حمایت کی) کے درمیان جنگ کے بعد ہوا۔بعد میں شہزادہ ناصر الدین نے ممکنہ طور پر مکمل حکومت پر قابض ہونے کے لیے اپنے والد کو زہر دے دیا۔

سلطان ناصر الدین خلجی شرابی، عیاش اور ظالم بادشاہ نکلا۔ اس کی حکومت کے آخری سالوں کے دوران مالوہ مکمل خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ امراء افسر اور درباری اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔اسے اپنے ماضی کی وجہ سے اپنے ماضی کی وجہ سے شاہی شہزادوں پر شدید شدید شک تھا کہ اس کا اپنا بڑا بیٹا جو کہ ولی عہد شہزادہ تھا۔اس کی طرف دیکھنے سے بھی ڈرتا تھا۔ اس دہشت کی وجہ سے بالآخر امراء نے ولی عہد کو بغاوت پر آمادہ کیا۔

امراء نے ولی عہد شہزادہ شہاب الدین کو اپنے والد کے خلاف استعمال کیا۔مالوہ میں اس ابتری کی وجہ سے معاملات سلطان سکندر کے حق میں ہو رہے تھے۔جس سے اسے مالوہ کی کچھ زمین پر قبضہ کرنے کا بہترین موقع ملا۔

سلطان سکندر لودھی نے ۱۵۰۷ انروڑ گوالیار کے بڑے اور مضبوط دفاع والے قلعے پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوا۔جس پر مالوہ کا کنٹرول تھا۔اس نے اپنے رشتہ دار جلال خان لودھی کو حکم دیا کہ وہ اپنی افواج کو کالپی سے منتقل کر دے اور اگر محافظوں نے پرامن طور پر ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تو طاقت کے ذریعے قلعہ پر قبضہ کریں گے۔

سلطان سکندر چند دنوں کے بعد نروڑ پہنچا۔ وہاں اپنے دوسرے دن سلطان فوج کا معائنہ کرنے نکلا۔ سلطان کو متاثر کرنے اور اپنی فوجوں کے لیے زیادہ الاؤنس کا مطالبہ کرنے کے لیے جلال خان لودھی نے اپنی بڑی فوج تیار کی۔ جس میں گھڑ سوار (گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار سپاہی)، جنگی ہاتھی، اور پیدل فوج (پیدل سپاہی) شامل تھے۔

جلال خان لودھی کے اس اقدام سے خوش ہونے کی بجائے سلطان اپنے رشتہ دار کی زبردست مسلح طاقت سے خوفزدہ ہو گیا۔ اس خوف سے کہ یہ فوج ایک دن اس کے خلاف بغاوت میں بھی استعمال ہو سکتی ہے۔ سکندر نے چپکے سے جلال خان کی طاقت کو آہستہ آہستہ ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

نروڑ کا محاصرہ ایک سال تک جاری رہا کیونکہ قلعہ ناقابل یقین حد تک مضبوط تھا۔ یہ پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا اور اس کی لمبائی ۱۶ میل (۸ کروہ) تھی۔ بار بار حملے ناکام ہونے اور سلطان کے جوانوں کو بھاری جانی نقصان پہنچانے کے بعد سلطان نے آخر کار محاصرہ کرنے والے ہتھیاروں کا استعمال کرتے ہوئے چاروں طرف سے ایک بڑے زبردست حملے کا حکم دیا۔

سلطان نے اس حملے کو اپنے محل کی چھت سے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ قلعے کی دیوار میں ایک سوراخ ہو گیا تھا۔ لیکن محافظوں نے جلدی سے اس کی مرمت کر دی۔ اس کی وجہ سے اس نے براہ راست حملہ کرنا چھوڑ دیا اور سخت محاصرہ (قلعہ کو روکنے) کا حکم دیا۔

سلطان نے جلال خان کے بہترین سپاہیوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ اس سے جلال خان کی فوج کمزور ہو گئی۔ پھر اس نے دو حکم بھیجے:

ایک حکم، ابراہیم خان نوحانی، سلیمان فارملی، اور ملک علاؤالدین جیلوانی کے نام بھیجا کہ جلال خان کو گرفتار کیا جائے۔

دوسرا حکم میاں بھوآ (وزیر)، سعید خان، اور ملک آدم کاکڑ کے نام جاتی ہوا کہ جلال خان اور شیر خان کو زنجیروں میں جکڑ کر قلعہ اونٹھ گڑھ میں قید کیا جائے۔

قلعہ ناروڑ کے محافظوں کا کا مورال پست ہونے لگا انکے پاس پانی اور خوراک کی ہو رہی تھی۔ انہوں نے علاج کی دہائی دی تو انہیں اپنے سامان کے ساتھ قلعہ سے باہر جانے کی اجازت دی گئی۔

سلطان چھ ماہ تک قلعہ ناروڑ کے قریب رہا۔ اس دوران سلطان نے مساجد بنانے کا حکم دیا۔

دسمبر ۱۵۰۸ء کو سلطان سکندر ناروڑ سے نکلا۔ لیکن دریائے سپرا کے کنارے پہنچنے کے بعد وہ قلعہ کو مضبوط کرنے کے لیے اپریل ۱۵۰۹ میں واپس آیا۔ اس نے پرانے قلعے کے گرد ایک اور دفاعی دیوار بنائی تاکہ دشمنوں کے اس پر قبضہ کرنے کے امکانات کو کم کیا جاسکے۔ یہ کام مکمل کرنے کے بعد وہ آگے بڑھا۔

سلطان نے لہڑ کا سفر کیا۔ وہاں نعمت خاتون (قطب خان لودھی) کی بیوہ اور شہزادہ جلال خان لودھی کی سابقہ دائی) نے سلطان سے ملاقات کی۔ وہ سلطان سے ناہنجار شہزادے کو معاف کروانے کے لیے آئی تھی۔ سلطان نے اس کی درخواست منظور کرلی اور کالپی کا علاقہ شہزادہ جلال کو اراضی (جاگیر) کے طور پر واپس دے دیا۔ اس نے شہزادے کو کئی تحائف بھی دیے - جن میں ایک سو بیس گھوڑے، پندرہ ہاتھی، ایک اعلی پوشاک اور نقدی شامل تھی۔

اپریل ۱۵۰۹ (۱۰ محرم ۹۱۵ ہجری) کو سلطان نے لہڑ چھوڑا اور بھدوریا راجپوتوں کے اہم گڑھ ہاٹکانٹ کی طرف کوچ کیا۔ اس نے باغیوں کا پیچھا کیا۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ وہ دوبارہ بغاوت نہ کریں -اس نے آگرہ واپس آنے سے پہلے اہم اسٹریٹیجک علاقوں میں پولیس اسٹیشن (تھانے) قائم کر دیے۔

آگرہ میں قیام کے دوران سلطان نے احمد خان (لکھنؤ کے گورنر اور مبارک خان لودھی کے بیٹے) کو اقتدار سے ہٹادیا اور اسے جیل میں ڈال دیا- کیونکہ یہ اطلاع ملی تھی کہ اس نے اسلام کو ترک کر دیا تھا۔ اس کے بعد سلطان نے اس علاقے کا کنٹرول احمد کے بھائی سعید خان کو دے دیا۔ مالوہ میں حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے، جہاں حکومتی وزراء شہزادہ شہاب الدین کو بغاوت پر اکسا رہے تھے۔

شہزادہ شہاب الدین نے اپنے والد سلطان نصیر الدین کے خلاف بغاوت کی۔ ۱۵۱۰عیسوی کی ایک رات وہ چپکے سے مالوہ (مانڈو) چھوڑ کر چندیری کے قریب ایک قصبہ سپری آیا۔ اس کے والد کی طرف سے محبت اور معافی کا وعدہ کرنے کے بعد بھی شہزادے نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ اس نافرمانی کی وجہ سے سلطان نصیر الدین نے شہاب الدین کو مستقبل کے حکمران کی حیثیت سے ہٹا دیا اور اپنے تیسرے بیٹے شہزادہ اعظم ہمایوں کو وارث منتخب کیا۔

اس کے بعد شہزادہ شہاب الدین نے سلطان سکندر لودھی سے حفاظت کی درخواست کی۔ سلطان سکندر نے تحفے، گھوڑے اور شاہی لباس بھیج کر اس کا استقبال کیا۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر وہ چندری اسے دے تو شہزادے کی مدد کرے گا۔

اسی وقت سلطان سکندر کو خدشہ تھا کہ گجرات کا سلطان محمود مالوہ میں مداخلت کر سکتا ہے۔ چنانچہ مارچ ۱۵۱۱ء میں اس نے ایک دوستانہ وفد گجرات کے حکمران کے پاس تحائف کے ساتھ بھیجا۔ یہ اس لیے اہم تھا کیونکہ یہ گجرات کے آزاد ہونے کے بعد دہلی کے سلطانوں کا پہلا دوستانہ مشن تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی نے گجرات کی آزادی کو قبول کر لیا ہے۔

اسی دوران شہزادہ شہاب الدین اپنے والد کے ہاتھوں شکست کھا کر دہلی کی طرف جانے لگا۔ لیکن جب اس نے سنا کہ اس کے والد کا مئی ۱۵۱۱ میں انتقال ہو گیا ہے تو اس نے اپنا منصوبہ بدل لیا۔ اس نے چندری کو سلطان سکندر کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے بجائے اپنے بھائی سے لڑنے کے لیے منڈو کی طرف کوچ کیا۔ جو ان کے والد کی موت کے بعد سلطان محمود دوئم بن گیا تھا۔

مگر شہاب الدین کو اس کے بھائی محمود دوم نے شکست دی اور بعد میں جلاوطنی میں رہتے ہوئے انتقال کر گیا۔ اس کے فوراً بعد سلطان محمود دوم کو خود ایک اور بھائی شہزادہ صاحب خان نے منڈو کی حکومت سے ہٹا دیا۔ اور خود سلطان محمد کے لقب سے تخت سنبھالا۔ محمود دوم پھر اُجّین سے چندری گیا اور مدد کے لیے کہا۔

سلطان محمود دوم اُجین سے چندری آیا اور بہاجت خان سے مدد کی درخواست کی - گورنر نے جواب دیا، "میں صرف اس کا وفادار ہوں جو مانڈو شہر پر کنٹرول رکھتا ہے۔"

اس دوٹوک جواب سے الجھ کر مرسل نے سلطان سکندر لودھی کو بہشت پور نامی گاؤں سے صلح کی تجویز بھیجی اور پھر خود رنتھمبور کا سفر کیا۔ سلطان سکندر نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ چندری کے علاقے پر قبضے کی صورت میں کیا۔ اس کے بعد سلطان دھول پور واپس آیا اور تعمیراتی منصوبوں پر توجہ مرکوز کی - آگرہ سے دھول پور تک کا پورا راستہ مساجد، محلات اور دیگر عمارتوں سے بھر گیا۔ جو سکندر لودھی نے تعمیر کروائی تھی۔

اسی دوران اس نے سکندرہ کے مقام پر بارہ دری کے نام سے ایک پویلین بنوایا جو آج بھی موجود ہے۔

لیکن جلاوطن بادشاہ کو کبھی بھی سلطان کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ جیسے ہی مدنی رائے ایک رہنما راجپوت سپاہیوں کے ایک دستے کے ساتھ اس کی حمایت کے لیے پہنچا۔ محمود نے منڈو پر چڑھائی کی۔ ایک پر تشدد اور خونریز لڑائی کے بعد اس نے ١٦ جنوری ١٥١٢ کو کامیابی کے ساتھ شہر پر قبضہ کر لیا۔ صحاب خان (محمد شاہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے) گجرات فرار ہو گیا۔ اس نے گجراتی فوج کا استعمال کرتے ہوئے اپنا تخت واپس حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا۔ اس کے بعد وہ بھاگ کر دکن کے علاقے گویل گڑھ قلعہ میں چلا گیا اس کے ساتھ علی خان اور ابو بکر خان (جو مالوا کے علاقوں میں ناگور کے گورنر محمد خان کے رشتہ دار تھے) شامل ہو گئے۔

کچھ لوگوں نے حکمران کو قتل کرنے اور ناگور پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن اس نے بروقت ان کا منصوبہ روک دیا گیا اور ان کو شکست ہو گئی۔ وہ بھاگے اور سکندر سے تحفظ کے لیے کہا۔ اس امید پر کہ سلطان سکندر لودھی ان کا ساتھ دے گا- انہوں نے تحفے بھیجے، خطبہ پڑھنے اور سلطان کے نام کے سکے بنانے پر رضامندی ظاہر کی - اس عمل سے وہ سے سلطان کی حمایت حاصل کرنا چاہتے تو تھے- - ایک فاتح پر امن قبضہ بہترین اقدام تھا۔ اس لیے ناگور پر امن طور پر سلطان کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔

اس کے بعد سلطان دھول پور سے آگرہ واپس آیا تاکہ پُر سکون، آرام دہ ایام گزار سکے۔اور تھکن اتار سکے۔

کچھ دیر بعد سلطان دوبارہ دھول پور کی طرف روانہ ہوا۔اس نے خان حسین فارمالی کے بیٹے میاں سلیمان کو حکم دیا کہ وہ سوئی سوپر کے علاقے اونٹ گڑھ میں نئے مسلمان حسین خان (جس کا اصل نام رائے ڈنگر تھا) کی مدد کرے۔ ایسا لگتا ہے کہ حسین خان سلطان کا ایک جاگیر دار (زمیندار) تھا جسے راجپوتوں نے ہٹادیا تھاجو اسکے ہم مذہب تھے۔

میاں سلیمان نے جانے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ سلطان کی صحبت چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے معزول کر دیا گیا۔اسے سورج نکلنے سے پہلے چھوڑنے کا حکم دیا گیا- جبکہ اس کی باقی جائیداد تباہ کر دی گئی۔

سلطان نے اندری نام کا ایک چھوٹا سا ضلع ایک اہلکار کو دے دیا تاکہ وہ اس کی آمدنی کو اپنی کفالت کے لیے استعمال کر سکے۔ پھر سلطان باری گیا اور اس نے مبارک خان کو برطرف کر دیا اور اس کی جگہ میاں مکھن کو یہ عہدہ دے دیا۔

سلطان محمود نے مدنی رائے کی مدد سے مالوہ کا اپنا تخت واپس حاصل کر لیا تھا۔ سلطان جلد ہی مدنی رائے کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گیا۔ جس نے بنیادی طور پر حکومت سنبھال لی تھی۔

بہاجت خان (جو چندری کا گورنر اور سلطان کا رشتہ دار تھا) ۱۵۱۲میں ان حالات سے فکر مند ہو گیا۔اس نے دیکھا کہ سلطان کتنا بے بس ہے اور مالوہ میں مدنی رائے اور اس کے راجپوت سپاہی کتنی طاقت حاصل کر رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے بہاجت خان نے ریاست کے خلاف بغاوت کی۔ دو دیگر مقامی گورنر سکندر خان اور منصور خان بھی اس کی بغاوت میں شامل ہو گئے۔

مدنی رائے نے جلد ہی سکندر خان کو جنگ میں شکست دی۔اس کے بعد سلطان محمود نے صلح کی کوشش کی لیکن بہاجت خان نے اس کی صلح کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ اس کے بجائے بہاجت خان نے شہزادہ صحاب

خان کو دکن کے گویل گڑھ سے بھیجا۔ اس نے محفوظ خان نامی اہلکار کے ذریعے سلطان سکندر لودھی سے مدد کی فوری درخواست بھی بھیجی جو سلطان محمود کا پرانا دشمن تھا۔

بہاجت خان نے اپیل میں کہا:

"یہاں کے مسلمانوں پر غیر مسلم راجپوتوں نے مکمل تسلط جمار کھا ہے۔ اس قبیلے کا سردار مدنی رائے حقیقی حکمران بن چکا ہے۔ اس نے بہت سے وفاداراور دیرینہ سرکاری ملازمین کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور دیگر اپنی جانیں بچا کر بھاگ گئے ہیں حالانکہ سلطان محمود شرمندہ ہے کہ راجپوت کس قدر جارحانہ انداز میں کام کر رہے ہیں۔ راجپوت سپاہی مسلمانوں کی قیادت والی مالوہ سلطنت پر مکمل طور پر قبضہ کر رہے ہیں۔"

بہاجت خان کے علاوہ بھی کچھ لوگوں نے دہلی کے حکمران سے کہا کہ وہ مقامی مسلم رہنماؤں پر بھروسہ نہ کریں کیونکہ وہاں اب اسلامی قانون کی صحیح طریقے سے پیروی نہیں کی جاتی ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ مساجد اور دینی مدارس کو مندروں میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور متنبہ کیا گیا ہے کہ مدنی رائے کا بیٹا جلد ہی سلطان کو ہٹا کر خود تخت سنبھال سکتا ہے۔

انہوں نے مشورہ دیا کہ اگر دہلی کا سلطان شہزادہ صحاب خان کو حکمران بنانے کے لیے فوج بھیجے تو وہ خطبہ پڑھ کر اور ان کے نام کے سکے جاری کر کے اس کا اختیار قبول کر لیں گے۔

اس وقت گجرات کے سلطان مظفر شاہ نے دھڑ پر حملہ کیا اور منڈو کی طرف بڑھے۔ بعد میں مظفر کے پیچھے ہٹنے کے بعد سلطان محمود نے چندری کی طرف کوچ کیا۔ لیکن اس نے دریافت کیا کہ شہزادہ صاحب خان گونڈوانا کے راستے چندری پہنچ چکے ہیں اور لودھی فوج کی مدد سے اسے تخت پر بٹھا دیا گیا ہے۔ سعید خان لودھی اور عماد الملک بھی دہلی کی افواج کے ساتھ قریب ہی تھے۔

چونکہ محمود سکندر لودھی کی فوج سے لڑنے سے ڈرتا تھا۔ - اس لیے وہ بھلسا کی طرف پیچھے ہٹ گیا۔ اس کامیابی کے بعد بہاجت خان نے اپنے پہلے والے وعدے کو توڑا اور خطبہ پڑھنے یا سلطان سکندر کے نام کے

سکے جاری کرنے سے انکار کر دیا۔دونوں کی سلطان محمود دوئم سے صلح ہو گئی جس نے ان کے لیے تحائف اور نقد رقم مقرر کی اور شہزادہ صحاح خان کو اسرافیل کا نائب مقرر کیا۔اس جھوٹی اطلاع پر کہ بہاجت خان اسے قید کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہزادہ ۲۹ رمضان ۹۱۹ /۱۸ نومبر ۱۵۱۳ کو سلطان سکندر کی حفاظت میں بھاگا اور سرحد عبور کر کے اپنی فوج میں شامل ہو گیا۔

سلطان سکندر نے ۹۲۳/۱۵۱۷ میں رنتھنبور کی طرف آہستہ روی سے شکار کھیلتے ہوئے اور بیانا کے قرب وجوار کا چار ماہ تک نظارہ کرتے ہوئے کوچ کیا۔ سلطان نے شہزادے اور اس کی والدہ کو بہت نوازا۔ وہ رنتھمبور کی اصل حکمران تھیں۔شہزادہ اس کی تعظیم کے لیے آیا اور اسے سلطان نے اعزازی گھوڑوں اور ہاتھیوں کا لباس دیا تھا۔ شہزادے کی واپسی پر علی خان نے انہیں رنتھمبور سے دستبردار نہ ہونے پر آمادہ کیا۔ شہزادے نے بہانے پیش کیے اور تاخیر کی اور حقیقت میں سلطان کی مخالفت پر اتر آئے تھے۔سکندر لودھی نے علی خان کے خلاف جنگی کارروائی کی۔

اسلامی سال ۹۱۹ اور ۹۲۲ ہجری کے درمیان سلطان سکندر لودھی نے اپنی صوبائی حکومتوں میں کئی تبدیلیاں کی تھیں۔

اس نے بھیکن خان کو اٹاوہ کے گورنر کے عہدے سے ہٹا دیا اور یہ ذمہ داری اس کے چھوٹے بھائی خضر خان کو دے دی۔سلطان کو سرن کے گورنر حسین خان فارملی کی وفاداری پر شک ہو گیا۔ اس نے اسے گرفتار کرنے کے لیے سارنگ خان کی قیادت میں ایک فوج بھیجی۔لیکن حسین خان کو مخبری ہو گئی وہ فوج کے پہنچنے سے پہلے اپنے پیروکاروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کے ساتھ بنگال کی طرف بھاگ گیا۔سوئی سوپر پر قبضہ کرنے کے بعد سلطان نظم بحال کرنے کے لیے بیانا گیا۔اس کے بعد اس نے راپری کا سفر کیا۔مبارک خان نوحانی کے بیٹوں سے اس کا کنٹرول چھین لیا - اور اسے شیخ زادہ مکھن کے حوالے کر دیا۔

سلطان سکندر لودھی کا کردار

تاریخی حوالوں کے مطابق سکندر لودھی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔مؤرخ نعمت اللہ کا کہنا ہے۔ کہ سلطان سکندر لودھی میں اتنی خوبیاں اور کمالات تھے کہ ان کا مکمل طور پر لکھنا یا بحث کرنا ناممکن ہے۔وہ غیر معمولی طور پر خوبصورت اور دلکش تھا۔وہ ایک قابل ذکر یادداشت کے مالک تھا۔اپنی تقریر اور عمل دونوں میں بے عیب تھا۔اس نے دوسروں کے لیے اسلامی قانون (شریعت) کی سختی سے پیروی کی۔حالانکہ اس نے اپنے لیے چند ذاتی استثنیٰ بھی حاصل کیے۔ مثال کے طور پر اس نے اپنی داڑھی منڈوائی (یہ دعویٰ کیا کہ یہ صحت اور حفظان صحت کے لیے ہے)اور چپکے سے شراب پی لی۔اپنے شدید کام کے شیڈول کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنی پانچوں نمازیں وقت پر ادا نہیں کر پاتا تھا۔ اس لیے وہ اکثر صبح کے وقت ایک ہی نشست میں ان سب کو ایک ساتھ ادا کرتے تھے۔

اپنے والد کی طرح وہ خدا سے ڈرتا تھا اور سادہ زندگی گزارتا تھا۔ وہ اسراف والی تقاریب کو ناپسند کرتا تھا۔سادہ لباس پہنتا تھا۔ اور پست اخلاق والے لوگوں سے صحبت ناپسند کرتا تھا۔اس نے اپنے آپ کو صرف علماء مذہبی شخصیات اور نیک لوگوں سے تعلقات تک ہی رکھا۔ ان کی موجودگی میں سخت نظم وضبط برقرار رکھا جاتا تھا اور نامناسب گفتگو کو کبھی برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔وہ اپنے رشتہ داروں اور بھائیوں کے ساتھ مہربان، نرم خو اور صابر تھا۔وہ اکثر رد گزر کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ قصوروار بھی ہوتے تھے۔سکندر لودھی انتہائی ذہین، محنتی، اور اپنے لوگوں کے ساتھ گہری وابستگی رکھنے والا انسان تھا۔ وہ ناقابل یقین حد تک فیاض، علماء کا بہت بڑا حامی، اور ادب و فن سے محبت کرنے والا شخص تھا۔ تاہم وہ کٹر مذہبی حکمران کے طور پر بھی مشہور تھا۔اس کی شہرت افسانوی نوعیت کی بھی تھی۔

سکندر لودھی بادشاہت کو ایک مقدس امانت کے طور پر دیکھتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی مکمل طور پر ریاست اور اپنے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دی۔اس نے انتھک محنت کی۔اکثر صبح سویرے

سے رات سونے تک۔ اس نے کبھی بھی اپنے روز مرہ کے شیڈول میں خلل نہیں ڈالا اور دوسروں سے مکمل اطاعت کی توقع نہیں کی۔ یہ نظم وضبط اتنا سخت تھا کہ یہاں تک کہ درباری موسیقاروں کو بھی صرف مخصوص نوعیت کی پہلے سے منظور شدہ دھنیں بجانے کی اجازت تھی۔

اس کے دن کا آغاز صبح سویرے نمازوں اور قرآن مجید کی تلاوت سے ہوتا تھا۔ جس کے بعد وہ فوراً انتظامی امور میں لگ جاتا تھا۔ دن کے وقت وہ نے سرکاری امور سنبھالتا تھا۔ اس نے اپنی راتیں نجی ملاقاتیں کرنے 'ریاستی امور کو سنبھالنے 'موسیقی سننے یا آدھی رات تک اس کے ساتھ رہنے والے پڑھے لکھے آدمیوں کے ساتھ باتیں کرنے میں گزاریں۔ سخت محنت کی اسے عادت تھی۔ اس نے رات کے وقت اپنے گورنروں اور دوسرے بادشاہوں کو سرکاری احکامات بھیجنے کو بھی ترجیح دی۔

ایک دفعہ آدھی رات کو رات کا کھانا پیش کیا گیا۔ سترہ پڑھے لکھے آدمی جو سلطان کے قریب تھے۔ 'وہ ایک چھوٹے سے بستر پر اس کے پاس بیٹھ گئے۔ ان عالم دین کو اس کے سامنے کھانا کھانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے بجائے ایک بار جب سلطان نے کھانا کھالیا تو وہ بچا ہوا کھانا اپنے ساتھ گھر لے گئے۔

مشہور شہنشاہ اکبر کی طرح وہ بہت کم سوتا تھا۔ وہ تمام ریاستی کاروبار کا انتظام کرتا تھا۔ خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ ذاتی طور پر اور اپنی سلطنت کی ہر تفصیل کو بخوبی جانتا تھا۔ وہ ہمیشہ مصیبت کو روکنے حکومت چلانے اور اپنے لوگوں کی زندگی آسان بنانے کے لیے کام کر رہے تھے۔ اس نے اپنی حکومت کی ہر شاخ کو خود سے قدر قریب رکھا کہ اس نے اپنی فوج کو سفر کے دوران ہر روزانہ بنیاد پر دو سرکاری حکم بھیجے۔

ایک صبح یہاں اس جگہ کی طرف کوچ کرنا دوسرا شام کو وہاں دوسری جگہ پر ڈیرے ڈالنا۔ جب فوج کافی فاصلے پر تھی - تب بھی اس طرز عمل سے انحراف نہیں کیا گیا۔ اسے اپنے علاقے کے مقامات کے جغرافیے کے بارے میں گہرا علم تھا حالانکہ وہ کبھی وہاں نہیں گیا تھا۔ اس لیے اپنی سلطنت کی حالت بشمول افراد کے گھریلو معاملات کے بارے میں اس کا مکمل علم تھا۔ کہ لوگوں کو یقین تھا کہ اس کے پاس "لن" (جن ہے کہ سلطان کے پاس ایک چراغ تھا جیسا کہ عرب کے علاؤالدین کے پاس تھا دو محافظ

جنات والا)۔ اس نے ایک وسیع کرنسی حاصل کی۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سلطان کے پاس جاسوسی کا ایک خوفناک نظام تھا۔ فوج کی خبریں، صوبوں اور پرگنوں کے واقعات روزانہ ڈاک کے ذریعے اس تک پہنچتے تھے۔ محکمہ ڈاک کی گاڑیوں اور گھوڑوں کو مناسب فاصلے پر مستقل طور پر تیار رکھا جاتا تھا۔ روزانہ سلطنت میں نرخوں کے شیڈول کا جائزہ لینا اس کی عادت تھی۔ اس نے درباری آداب کو ترک کر دیا اور اپنے والد کی طرح رئیسوں کو اپنے سامنے بیٹھنے دیا۔ اس کی فوج جب (۱۰۰۰ میل) کی دوری پر ہوتی تھی تو فرمان روزانہ بھیجے جاتے تھے۔ سلطان سکندر انصاف کی فراہمی میں مشہور تھا۔ یہاں تک کہ سجنی رائے جو ہندو مخالف قانون سازی کی مذمت کرتی ہے -وہ بھی ان کی دانشمندی، فہم و فراست اور انصاف کو خراج تحسین پیش کرتی ہے۔ ایک بادشاہ کے طور پر وہ اپنی انصاف پسند حکمت اور تدبر کا مالک تھا اور شاذ و نادر ہی جسمانی خواہشات کو پورا کرتا تھا۔ روزانہ عوامی سامعین دے کر انصاف فراہم کرنا اور ذاتی طور پر غلطیوں کا ازالہ کرنا ان کی روزمرہ کی عادت تھی۔ "اس کی آنکھ کمزور اور طاقتور کو ایک ہی نظر سے دیکھتی تھی۔" اگر کوئی درخواست گزار اس سے باہر نکلتے وقت اس سے رابطہ کرتا تو وہ شکایت کنندہ کی شکایت دور کرنے کی کوشش کرتا اور درخواست گزار کو تسلی دیتا۔ انصاف کی فراہمی میں وہ افراد یا عہدے کا احترام نہیں کرتا تھا۔ ایک دفعہ کہا جاتا ہے کہ میاں بھوآں وزیر اعظم اور پریوی کونسلر اور سلطان آف میر عدی صوبوں سے ایک مقدمہ چلا رہے تھے۔ جس میں سید کو اس جگہ کے جاگیر دار نے اپنے "وظیفہ" (وظیفہ) "املاک" زمینوں سے محروم کر دیا تھا۔ جب مقدمہ دو ماہ تک چلتا رہا تو بادشاہ نے اس کی سماعت کرتے ہوئے ایک دن اعلان کیا کہ جب تک مقدمہ کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ کوئی ادارہ عدالت سے باہر نہیں جا سکے گا۔ ججوں نے آدھی رات کو کیس کا فیصلہ شکایت کنندہ کے حق میں کر دیا۔

سلطان کو مقدمے کی کارروائی سے آگاہ کرتے وقت باقی رہ گیا۔ مدعا علیہ کو سلطان نے اس کے طرز عمل کی وضاحت کے لیے بلایا اور سلطان آف میر عدی کو عدالت میں تین بار اپنے جرم کا اعتراف کرنے کے لیے بلایا گیا اور اسے اس کی جاگیر سے محروم کر دیا گیا۔

گوالیار کی فوجی مہم کے دوران دو بھائیوں کے بارے میں اس کہانی کا تذکرہ تقریباً تمام مورخین نے کیا ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ سلطان پیچیدہ قانونی معاملات کو حل کرنے میں کتنا ہوشیار تھا۔

دو بھائیوں نے چوری شدہ خزانہ کی ایک بڑی رقم جمع کر لی۔ جس میں کئی قیمتی یاقوت بھی شامل تھے۔ ایک بھائی گھر واپس آنا چاہتا تھا۔ لیکن دوسرا زیادہ دولت اکٹھا کرنے کے لیے پیچھے رہنا چاہتا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اب تک جو خزانہ جمع کر چکے ہیں۔ اس میں یاقوت بھی شامل ہے۔ چھوٹے بھائی جس نے پیچھے رہنے کا انتخاب کیا۔ اس نے اپنا حصہ جس میں ایک بہت بڑا روبی بھی شامل تھا۔ اپنے بڑے بھائی کو گھر لے جانے اور اپنی (چھوٹے بھائی کی) بیوی کو دینے کے لیے دیا۔

جب چھوٹا بھائی آخر کار کچھ دیر بعد گھر واپس آیا تو اس نے دریافت کیا کہ اس کی بیوی کو کبھی روبی نہیں ملا تھا۔ اس نے اپنے بڑے بھائی سے اس بارے میں بات کی۔ بڑے بھائی نے جھوٹ بولا اور اسے بتایا کہ اس کی بیوی جھوٹ بول رہی ہے اور اسے صرف مارنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اعتراف کرے کہ اس نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے۔ چھوٹے بھائی نے اس کی بات مان لی اور اس کی بیوی کو مارا۔ دردناک زیادتی کو روکنے کے لیے بے بس خاتون نے وعدہ کیا کہ وہ اگلے دن روبی کو حوالے کر دے گی۔

اس کے بجائے وہ سیدھے سلطان کے پاس اس ناانصافی کی شکایت کرنے گئی۔ سلطان نے اس سے پوچھا کہ وہ پہلے میاں بھوآں (چیف جج) کے پاس کیوں نہیں گئی۔ اس نے جواب دیا کہ وہ پہلے ہی اس کی کوشش کر چکی ہے۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

پھر سلطان نے دونوں بھائیوں کو عدالت میں طلب کیا۔ بڑے بھائی نے اس الزام کی تردید کی اور دعویٰ کیا کہ اس نے روبی کو پہنچایا تھا۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے وہ جعلی گواہ لائے۔ وہ جوئے کے اڈے پر گیا تھا، اس نے کچھ مجرموں کو تلاش کیا۔ انہیں باعزت لباس پہنایا اور اس کے لیے جھوٹ بولنے کے لیے انہیں اچھی قیمت ادا کی۔

سلطان نے ایک ایک کر کے ہر گواہ سے سوال کیا۔ اس نے ان میں سے ہر ایک کو موم کا ایک ٹکڑا دیا اور حکم دیا کہ وہ اسے روبی کے عین مطابق شکل اور سائز میں ڈھال دیں۔ دو جعلی گواہ بری طرح ناکام ہو گئے۔ انہوں نے جو موم ماڈل بنائے تھے وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف سائز کے تھے۔ مگر دونوں بھائیوں نے بالکل ایک ہی سائز کا بنایا - لیکن عورت نہیں بنا سکی۔ وہ رونے لگی۔ کیونکہ وہ کسی ایسی چیز کی شکل دوبارہ نہیں بنا سکی جسے اس نے حقیقت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

سلطان نے دو جعلی گواہوں کو پھانسی دینے کی دھمکی دی۔ جس کی وجہ سے وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے کہ انہیں جھوٹ بولنے کی تربیت دی گئی تھی اور انہیں معاوضہ دیا گیا تھا۔ لالچی بڑے بھائی کو سزا دی گئی، اور بالآخر اس نے گمشدہ روبی کو حوالے کر دیا۔

حکمران بابر کی طرح سلطان سکندر کو بھی دولت جمع کرنے کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ بہت سے مواقع پر جب لوگ چھپے ہوئے خزانوں کو کھودتے تھے تو اس نے ان سے ایک پیسے کا بھی مطالبہ نہیں کیا -۔

جب خیرات اور سخاوت کی بات آتی تو وہ محمد تغلق کو پیچھے چھوڑ دیتا اگر اس کے پاس اتنا پیسہ ہوتا۔ ابو بکر (اسلام کے پہلے خلیفہ) کی مثال پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے زکوۃ سے جمع ہونے والی تمام رقم کو براہ راست غریبوں، علماء اور راہبوں میں تقسیم کیا۔

دارالحکومت کے مختلف حصوں میں ہر روز پکا ہوا کھانا اور کچا راشن دینے کے علاوہ اس نے مذہبی تہواروں اور تعطیلات کے دوران بڑی مقدار میں نقد رقم بھی دی۔ اس نے ان قیدیوں کو بھی رہا کیا جنہیں محض اس لیے جیل میں ڈالا گیا تھا کہ وہ اپنے قرضوں کی ادائیگی کے متحمل نہیں تھے۔

سال میں دو بار حکومت ضرورت مندوں کے لیے مالی الاؤنس اور وظیفہ مختص کرتی ہے۔ مقامی ضلعی گورنروں کی سفارشات کی بنیاد پر یہ فنڈز ہر فرد کی ضروریات اور سماجی حیثیت کے مطابق سے تھے- اور چھ ماہ تک چلنے کے لیے کافی تھے۔ اس کے علاوہ مسجد کے مقررین، مبلغین، اور صفائی کرنے والوں کو باقاعدہ سرکاری تنخواہ کے ساتھ ساتھ سردیوں کے لیے گرم ملبوسات بھی ملتے تھے۔

سلطان کو یہ بھی عادت تھی کہ وہ ہر ہفتے اپنا سوٹ اپنا چھوٹا سا بستر اور بستر تبدیل کرتا تھا۔ استعمال شدہ اشیاء فروخت کی جاتی اور رقم بیواؤں کو ان کی بیٹیوں کی شادیوں کے لیے جہیز کے طور پر استعمال کرنے کے لیے دی جاتی۔ اس خیراتی ادارے کے ذریعے ہر سال تقریباً ایک ہزار لڑکیوں کی شادیاں کر دی جاتی تھیں۔

ان کی مثال پر عمل کرتے ہوئے امراء بھی غریبوں کو دل کھول کر دیتے تھے۔ سلطان کہتا تھا کہ جب تم اچھی بنیاد رکھو گے تو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ وہ اپنے ملازمین کے ساتھ بھی بہت مہربان تھا۔ جن کو اس نے صرف ان کی خاندانی تاریخ میں محتاط پس منظر کی جانچ پڑتال کے بعد رکھا تھا۔ اوراس نے شاذ و نادر ہی کبھی کسی کو برطرف کیا۔

مؤرخ نعمت اللہ نے لکھا، "وہ اتنا گہرا تعصب کا شکار تھا کہ اس معاملے میں وہ انتہائی حد تک چلا گیا۔" ولی عہد شہزادہ سکندر کے زمانے کی ایک مشہور کہانی اس کی وضاحت کرتی ہے: اس نے مولانا عبد اللہ اجودھانی نامی ایک عالم دین سے ان کی قانونی رائے پوچھی کہ کیا وہ ہندوؤں کو تھانیشور کے مقدس مقام پر جمع ہونے پر پابندی لگا سکتے ہیں۔ عظیم قانونی ماہر نے جواب دیا کہ ایک قدیم قائم شدہ مذہبی عمل کو روکنا اسلامی قانون کے خلاف ہے۔

اس جواب سے غضبناک ہو کر شہزادے سلطان سکندر نے عالم پر اپنی تلوار سونت لی۔ لیکن جب عالم نے ڈھٹائی سے جواب دیا کہ وہ موت سے نہیں ڈرتا۔ تو انہیں 'کلانسویا' (لمبی ٹوپی)، پگڑی یا جوتے پہننے یا مسلمانوں کی طرح سواری کرنے سے منع کیا تھا اور انہیں کندھے پر الگ الگ لباس پہننے کا حکم دیا تھا۔ غلامی کی علامت کے طور پر 'زنار' یا کمر کے گرد کمر باندھیں۔ جو ہندو پگڑی پہنتے تھے ان کو جزیہ کی زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔" سکندر خاموش ہو گیا وہ اسلام کے معاملے میں انتہا پسند سوچ کا مالک تھا۔ اس نے متھرا میں مندر منہدم کیے - جہاں جہاں اس نے مندر گرائے وہاں مسجدیں، مدارس اور بنائے -- ناگر کوٹ کا مندر گرا کر اس نے مذبحہ خانہ قائم کیا اور اسے قصائیوں کو دے دیا-- اس نے

ہندوؤں کی رسومات پر بھی پابندی لگائی - متھرا میں نہانے پر پابندی کے نتیجے میں ایک ہندو نے مسلمانوں کو رشوت دے کر اشنان کرنے کی کوشش کی - اور کپڑوں سمیت ندی میں کود گیا۔

اس نے ہندوؤں پر کافی پابندیاں لگائی -- خلیفہ دوم حضرت عمر کی طرح اس نے ذمیوں سے جزیہ وصولی کے لیے سخت قانون بنائے- غیر مسلموں کو مسلمانوں کی طرح سواری کرنے سے منع کیا گیا اور انہیں کندھے پر الگ الگ لباس پہننے کا حکم دیا تھا۔ اونچی پگڑی پر جرمانہ عائد ہوتا تھا۔ انہیں مسلمانوں سے مماثلت اختیار کرنے کی اجازت نہیں تھیں۔ غلامی کی علامت کے طور پر انہیں زنار باندھنے کا حکم تھا۔ سلطان سکندر لودھی کے بارے میں ہندو مورخین نے جھوٹی کہانیاں مشہور کر رکھی ہیں۔ جن کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا۔ جیسا کہ ان کا کہنا ہے کہ سکندر لودھی ہندوؤں کی مذہبی کتب جلائی۔

سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں ایک ہندو جس کا نام بودن تھا۔ اس نے یہ دعوی کیا تھا کہ ہندوازم اور اسلام دونوں ہی سچے مذہب ہیں۔ جس کی وجہ سے مقامی گورنر ہمایوں لودھی نے اسے سلطان سکندر لودھی کے پاس سنبھل بھیج دیا۔

سلطان نے پوری مملکت سے اسلامی قانونی ماہرین کو بلا کر ایک بڑی خصوصی عدالت قائم کی۔

طویل بحث کے بعد عدالت نے برہمن کو یہ اختیار دیا کہ وہ اسلام قبول کر لے یا پھانسی دے دی جائے۔

جب اس نے انکار کیا تو اسے قتل کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ توہین مذہب کا مرتکب ہوا تھا۔

سکندر ایک طاقتور رہنما تھا۔ جس نے بہت سے سماجی، معاشی اور انتظامی قوانین اور اصلاحات کیں۔

اس نے بعض مذہبی روایات پر بھی پابندی لگا دی۔ جیسے کہ بہرائچ میں سالانہ جلوس۔ مشہور سنت کبیر کے بارے میں ایک مشہور افسانہ کو واضح کرتے ہیں۔

کبیر سلطان (۱۳۹۸-۱۵۱۸عیسوی) کے زمانے میں رہتے تھے۔

کہانیوں کا دعویٰ ہے کہ سلطان سکندر نے کبیر کو ڈبو کر جلا کر یا ہاتھی کو روند کر مارنے کی کوشش کی- لیکن ناکام رہا۔

یہ کہانی مکمل طور پر جھوٹی ہے۔ کیونکہ اس کا ذکر اس وقت کے کسی تاریخی فارسی مصنفین نے نہیں کیا۔ میں چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان۔

سر ولیم جونز کے مطابق کبیر کا ایک شاگرد سلطان کا ہم عصر تھا۔ کبیر پیدائشی طور پر ایک جولاہا رامانند کا شاگرد اور ممکنہ طور پر مانک پور کے صوفی میر تقی کا روحانی شاگرد تھا۔ جو کہ ۱۳۹۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۳۹۸ء میں وفات پائی۔ منوہر لال زوتشی کی کتاب "کبیر صاحب" کے دو مقبرے ساتھ ساتھ ان کے ہندو اور مسلمان شاگردوں نے گھر کے مقام پر تعمیر کیے۔ جسے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے شائع کیا ہے۔ اور "کبیر جنم سخی"، جس میں سلطان سکندر لودھی کی کہانی ہے۔ محمد خلیل انصاری کی "کبیر جنم ساکھی"۔ سلطان سکندر لودھی کی جانب سے کبیر کو پانی میں ڈبو کر، آگ میں جلا کر یا ہاتھی کے پاؤں تلے کچلوا کر مارنے کی ناکام کوششوں کی کہانی بالکل بے بنیاد ہے اور کسی بھی فارسی تاریخ نویس (خواہ وہ ہندو ہو یا مسلم) نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

جس میں اسے بے بنیاد طریقے سے مارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کوئی بھی فارسی تاریخ ساز ہندو یا مسلمان نے اس کی تصدیق نہیں کی۔

سکندر لودھی نے سالار مسعود غازی کے نیزے (عرس کے علامتی جلوس) پر پابندی لگادی جس کی ممکنہ وجہ یہ تھی کہ یہ روایت بگڑ کر توہم پرستی اور غیر شرعی عقیدت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ شہید بزرگ (سالار مسعود، جو اجمیر میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد بہرائچ آئے اور وہاں سورج کنڈ مندر کے پاس ایک درخت کے نیچے پناہ لی۔ وہ ۴۲۹ ہجری میں محض ۱۹ سال کی عمر میں راجہ سہر دیو کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ انہیں "سلطان الشہداء" (شہیدوں کا بادشاہ) بھی کہا جاتا ہے) کے سر کی علامت کے طور پر ایک نیزہ یا بانس استعمال کیا جاتا ہے، جسے عام طور پر "غازی میاں کی شادی" کہا جاتا ہے - کیونکہ شہادت کے وقت وہ دولہا کے لباس میں تھے۔ کئی شہروں میں یہ جلوس بگڑ کر اوباشی اور ہلڑ بازی کا میلہ

بن چکا تھا۔ اس نے عورتوں کے مزارات پر جانے، ماہِ محرم میں تعزیے نکالنے اور چیچک (Small-pox) کی دیوی 'سیتلا' کی پوجا کرنے پر بھی پابندی لگادی۔

اس نے ایک قانون بنایا۔ جس کے تحت جاگیر داروں کو اپنی جاگیروں سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی رکھنے کی اجازت تھی۔ سوائے 'املاک' (موقوفہ زمینیں) اور 'وظائف' (دینی یا خیراتی الاؤنس) کے۔

اس نے (بظاہر) حکمران کے مرتبے اور رعب کو قائم رکھنے کے لیے یہ اصول بنایا کہ جب بھی کسی امیر یا درباری کے نام کوئی شاہی فرمان جاری کیا جائے گا - تو فرمان حاصل کرنے والے کو خود جانا پڑے گا۔ سلطان سکندر لودھی نے ایک سخت قانون بنایا تھا تاکہ ہر شخص بطور حکمران اس کے اختیار اور طاقت کا احترام کرے۔ جب بھی کسی امیر (رئیس) یا گورنر کو شاہی پیغام (فرمان) ملتا۔ تو اسے ایک خاص طریقے پر عمل کرنا پڑتا تھا۔

امیر کو شاہی قاصد (پیغام لانے والے) سے ملنے کے لیے اپنے گھر سے تقریباً ۲ سے ۳ کوس (تقریباً ۴ سے ۶ میل) دور سفر کر کے جانا پڑتا تھا۔

ایک عارضی چبوترہ (پلیٹ فارم) بنایا جاتا تھا۔ پیغام لانے والا قاصد اس چبوترے کے اوپر کھڑا ہوتا، جبکہ امیر کو نیچے زمین پر احترام کے ساتھ کھڑا ہونا پڑتا تھا۔

امیر کو وہ سرکاری دستاویز دونوں ہاتھوں سے لینی ہوتی تھی۔ اسے عزت دینے کے لیے اپنے سر اور ہونٹوں سے لگانا پڑتا تھا اور پھر اسے پڑھنا ہوتا تھا۔

اگر وہ حکم سب کے لیے ہوتا تو اسے لوگوں کے سامنے اونچی آواز میں یا مسجدوں میں پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔

اور اگر وہ کوئی خفیہ (رازوالا) پیغام ہوتا۔ تو امیر اسے اکیلے میں پڑھتا تھا۔

اپنے والد بہلول لودھی کی طرح سکندر کو بھی شکار اور گھر سے باہر کی سرگرمیاں پسند تھیں۔ اس کا پسندیدہ کھیل 'چوگان' (پولو) تھا، جو وہ باقاعدگی سے اپنے امراء کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔

وہ میدانِ جنگ میں ایک بہادر انسان تھا لیکن ہارے ہوئے دشمنوں کے لیے بہت رحم دل تھا۔ وہ بلاوجہ خون بہانے کو سخت ناپسند کرتا تھا۔

اپنے والد کے برعکس سکندر نے اپنے دشمنوں کو نیچا دکھانے کے لیے کبھی دھوکے بازی یا چالاکی کا سہارا نہیں لیا اور نہ ہی کبھی اپنا وعدہ توڑا۔

سکندر ایک انتہائی محنتی اور سرگرم فوجی رہنما تھا۔ اس نے اپنی حکومت کا آدھے سے زیادہ وقت فوجی کیمپوں میں گزارا اور تقریباً ہر جنگ میں خود حصہ لیا۔ وہ مہم پوری ہونے سے پہلے کبھی پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔

اس کی بڑی کامیابیوں میں یہ شامل ہیں:

اپنے بھائی اور دوسرے رشتہ داروں کی بغاوتوں کو ختم کرنا۔

جونپور کی 'شرقی ریاست' کو پوری طرح فتح کرنا۔

دھول پور، ناروڑ اور وسطی ہندوستان کے بڑے علاقوں پر قبضہ کرنا، جس کی وجہ سے گوالیار کے راجہ کو بھی اس کی بات ماننی پڑی۔

اس نے کشمیر کے خلاف فوجی مہم شروع کی اور ملتان کے ساتھ اچھے سفارتی (سیاسی) تعلقات قائم کیے۔

ان تمام فتوحات کے ذریعے اس نے اپنی سلطنت کی سرحدوں کو بہت زیادہ پھیلا دیا تھا۔

ملتان کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس نے جنگی فتوحات اور دوسرے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے اپنی حکومت کی سرحدیں مغرب میں ہندوکش، کشمیر اور ملتان تک پھیلا دیں۔ اسی طرح مشرق میں اس کی سلطنت بنگال تک، شمال میں ہمالیہ کے دامن تک اور جنوب میں مالوہ اور راجپوتانہ تک پہنچ چکی تھی۔

سکندر لودھی جتنا جنگی میدانوں میں نمایاں تھا۔- اس سے کہیں زیادہ امن کے زمانے میں علم وہنر اور تہذیب کو فروغ دینے کے لیے مشہور تھا۔ مفکر 'برائس' نے جرمنی کے بادشاہ 'فریڈرک اعظم' کے بارے میں ایک بات کہی تھی کہ "یورپ فریڈرک کو اس کی فوجی صلاحیتوں کی وجہ سے جانتا ہے لیکن

آنے والی نسلوں کے لیے اس کی تعریف کا اصل حقدار اس کا وہ جذبہ ہے - جو اس نے اپنے ملک کے انتظام کو بہتر بنانے اور اپنی عوام کی خوشحالی و ترقی کے لیے دکھایا۔" یہ بات سکندر لودھی پر بھی بالکل سچی بیٹھتی ہے۔

سکندر لودھی پڑھے لکھے لوگوں اور علماء کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اسے سب سے زیادہ خوشی انہی کی محفل میں بیٹھ کر ملتی تھی۔ اسے خود بھی ادب اور شاعری کا بہت شوق تھا اور وہ 'گل رخ' کے قلمی نام (تخلص) سے بہترین شعر لکھا کرتا تھا۔ (اس نے نو سو اشعار پر مشتمل دیوان لکھا)۔ دوست ملکوں کے بادشاہوں یا درباری امیروں کی طرف سے جو تحائف اسے ملتے۔ وہ انہیں الگ رکھوا دیتا تاکہ بعد میں علماء اور دانشوروں میں بانٹ سکے۔ اس کے دور کے نامور شاعروں میں ایک برہمن بھی شامل تھا۔ جس کا نام 'ڈونگر' تھا۔

سکندر جنگ کے فنون سے زیادہ امن کے فنون (علم و ادب اور ثقافت) کو فروغ دینے میں نمایاں اور ممتاز نظر آتا ہے۔ برائس (Bryce) نے فریڈرک اعظم کے بارے میں جو بات کہی تھی کہ "وہ فوجی صلاحیتیں جن کی وجہ سے یورپ اسے جانتا ہے آنے والی نسلوں کی تعریف کے لیے اس کے اس جذبے سے کم تر درجہ رکھتی ہیں - جو اس نے اپنے نظم و نسق کی بہتری اور اپنی عوام کی خوشحالی اور خوشی کے لیے دکھایا تھا - " یہی بات سکندر (لودھی) پر بھی بالکل صادق آتی ہے۔

سکندر لودھی کی علم پروری کی وجہ سے عرب، ایران (فارس) اور ماوراء النہر (وسطی ایشیا) سے بڑے بڑے اسکالرز اور ماہرین آگرہ کا رخ کرنے لگے۔ کافی خط و کتابت اور دعوت نامے بھیجنے کے بعد وہ شیخ جمال الدین کو اپنے دربار میں بلانے میں کامیاب ہو گیا (جو شیخ سما الدین کمبوہ کے شاگرد تھے)۔ شیخ جمال الدین نے اسلامی ممالک کا دور دراز کا سفر کر رکھا تھا۔ انہوں نے پہلے "جلالی" تخلص اختیار کیا تھا لیکن بعد میں اپنے مرشد کے مشورے پر اسے بدل کر "جمالی" کر دیا۔ انہوں نے مکہ، مدینہ اور مسلم مشرق (بلادِ اسلامیہ) کا سفر کیا۔ اور مولانا عبد الرحمٰن جامی اور مولانا جلال الدین دوانی سے ملاقاتیں کیں۔ ہندوستان

واپسی پر وہ یکے بعد دیگرے سکندر لودھی، بابر اور ہمایوں کے درباروں سے وابستہ رہے۔ وہ گجرات کی مہم میں ہمایوں کے ساتھ تھے اور ذوالقعدہ ۹۴۲ھ / فروری ۱۵۳۵ء میں گجرات ہی میں وفات پائی۔ وہ دہلی میں 'راجوں کی بائیں' (راجوں کی باؤلی) میں خواجہ بختیار (کاکی) کے مزار کے قریب دفن ہیں۔ وہ صوفیائے کرام کے تذکرے پر مبنی کتاب "سیر العارفین" اور ایک "دیوان" کے مصنف ہیں جو ۸ سے ۹ ہزار اشعار پر مشتمل ہے وہ سلطان کی وفات تک ان کے پکے ساتھی رہے اور انہوں نے سلطان کی دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے ان کی یاد میں کچھ خوبصورت اشعار بھی لکھ کر ان کی دوستی کا حق ادا کیا۔

سلطان کی محفل میں ہر وقت موجود رہنے والے ۱۷ (ستر اہ) بڑے علماء اور قانون کے ماہرین (جیسے قنوج کے مولانا صدر الدین اور سیکری کے مولانا عبدالرحمٰن) کے علاوہ دنیا بھر کے دوسرے نامور اسکالرز سے بھی اس کا دربار سجتار ہتا تھا۔

سکندر لودھی کے دربار کی رونق دہلی کے عبداللہ تلنبی اور سنبھل کے عزیز اللہ تلنبی جیسے علماء سے روشن تھی۔ بادشاہ خود ذاتی طور پر شیخ عبداللہ کے علمی اور فلسفیانہ خطبات (لیکچرز) میں شرکت کرتا تھا۔ دوسرے علماء جو اپنی تحریروں کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ ان میں جونپور کے شیخ اللہ دِیا اور ان کے بیٹے شیخ بہکاری شامل تھے۔

ریاست کی طرف سے جب کسی کے لیے ایک بار وظیفہ یا مالی امداد مقرر کر دی جاتی تھی—خواہ وہ نقد رقم کی شکل میں ہو یا سامان کی شکل میں—تو موسم بدلنے کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی تھی۔ مؤرخ عبداللہ ایک کہانی سناتے ہیں کہ جونپور کے شیخ عبدالغنی جب گرمیوں میں دربار تشریف لائے تو انہیں شربت (ٹھنڈا مشروب) پیش کیا گیا۔ جب وہ دوبارہ سردیوں میں آئے تو انہیں وہی ٹھنڈا مشروب دیا گیا اور اس میں کوئی تبدیلی اس لیے نہیں کی جاسکی کیونکہ یہ حکم سلطان کی طرف سے سرکاری طور پر طے ہو چکا تھا۔ سکندر لودھی نے ماہر خوش نویسوں (کاتبوں) کو بھی جمع کیا - جو قلمی نسخوں کی نقل تیار کرنے میں مصروف رہتے تھے، اور یہ نسخے بعض اوقات بخارا جیسے دور دراز علاقوں سے منگوائے جاتے

تھے۔ یہ اسی کے دورِ حکومت کا وقت تھا جب ہندوؤں نے باقاعدہ طور پر فارسی زبان کا مطالعہ شروع کیا۔ سلطان کے احکامات پر، طب (حکمت) کی ایک اہم ہندو کتاب ("مہاویدک") کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا اور اس کا نام بدل کر "طبِ سکندری" (جسے الشفاء سکندری بھی کہا جاتا ہے) رکھا گیا۔ یہ کتاب آنے والے کئی سالوں تک ہندوستان میں طب کی معیاری اور مستند کتاب رہی۔

اس نے اپنے دور کے تمام مشہور گلوکاروں اور سازندوں (ساز بجانے والوں) کو اکٹھا کیا۔ مذہبی قانون کی ظاہری پاسداری کرنے اور ساتھ ہی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لیے، وہ ان موسیقاروں سے اپنے قریبی امراء میر سید روح اللہ اور سید ابنِ رسول کے خیموں میں پرفارم کرواتا تھا تاکہ وہ اپنے خیمے سے بیٹھ کر موسیقی سن سکے۔

سکندر لودھی کلاسیکی موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ کا عمدہ ذوق رکھتا تھا۔ یہ عجیب حقیقت کہ اس جیسا بت شکن اور کٹر مذہبی (راسخ العقیدہ) حکمران موسیقی میں دلچسپی لیتا اور اس کی قدر کرتا تھا_ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے اس فن کی کس حد تک سرپرستی کی تھی۔ اس نے تمام نامور فنکاروں کو جمع کر رکھا تھا-خواہ وہ گلوکار ہوں یا ساز نواز (ساز بجانے والے)۔ وہ شرعی قانون کی لکیر کو اس طرح پار کرتا (یا بچ کر نکلتا) تھا کہ ان فنکاروں کو میر سید روح اللہ اور سید ابنِ رسول کے خیموں میں گانے یا ساز بجانے کا حکم دیتا-جو اس کے اپنے خیمے کے بالکل قریب تھے اور خود وہاں بیٹھ کر موسیقی سنتا تھا۔

موسیقی کی یہ محفل رات کے تین گھنٹے گزرنے کے بعد شروع ہوتی تھی۔ سلطان نے چار غلام لڑکے خریدے تھے،-جن میں سے ایک چنگ (بربط / ہارپ) بجاتا تھا-دوسرا قانون، تیسرا طنبورہ (ایک قسم کا رباب) اور چوتھا بین (وینا) بجاتا تھا۔ وہاں دس شہنائی نواز بھی تھے - لیکن کوئی بھی ان مخصوص دھنوں کے علاوہ نہیں بجا سکتا تھا۔ جنہیں سلطان پسند کرتا تھا۔

سلطان نے ہندوستانی زبان سے ایک کتاب ترجمہ کرنے کا حکم دیا کیونکہ یونانی طب (دوائیں) ہندوستان کے مزاج اور آب وہوا کے موافق نہیں تھی اور یونانی دواؤں کے نام فارسی زبان میں لکھے ہوئے تھے اور وہ نایاب بھی تھیں۔ ان نامور اطباء (ڈاکٹروں / حکیموں) کے نام بھی شمار کیے گئے ہیں - جن سے یہ طریقہ کار مستعار لیا گیا (سیکھا) گیا تھا، اور اس کتاب کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کیونکہ یہ تمام کتابوں کا مجموعہ ہے۔

سکندر معمار بھی تھا اور تباہ کار بھی۔ اس نے مندروں کو تباہ کیا اور مسجدیں، مدارس (کالج)، سرائیں اور بازار تعمیر کروائے۔ تباہی و بربادی کے اپنے اس کام میں جو سلطان محمود غزنوی کی طرز پر بڑے پیمانے پر شروع کیا تھا۔ اس نے کسی بھی برادری (یا طبقے) کا کوئی پاس نہیں رکھا۔ اس کی پسند یا ناپسندیدگی سب سے بڑا معیار تھا۔ اس نے دھولپور کے اس جنگلاتی باغ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جس کا سایہ ۱۴ میل (۷ کوس) تک پھیلا ہوا تھا۔ گوالیار، دھولپور، کانتات اور ریوا میں اس نے اپنی پوری تسلی کے ساتھ تباہی کا کام انجام دیا۔ اس نے شرقی خاندان کے مرکز جونپور کے خوبصورت شہر کو لوٹا۔ جو "اپنی گنجان آبادی کی وجہ سے باغِ ارم (جنت) کی مانند تھا"۔ جونپور میں یہ عام عقیدہ یا روایت ہے کہ اس نے 'جامع مسجد' سمیت دیگر مساجد کی دیواروں میں بارود بھر دیا تھا تاکہ انہیں اڑا دیا جائے۔ اور وہ صرف اس وقت باز آیا جب 'علماء' نے احتجاج کیا کہ وہ 'اللہ کے گھروں' کی تباہی کو معاف کرنے میں (اس کے) شریک نہیں بنیں گے۔

اس نے دہلی سے دارالحکومت منتقل کرنے کے بعد عمارتیں تعمیر کر کے آگرہ شہر کو خوبصورت بنایا۔ دہلی میں بہلول لودھی کا مقبرہ اور آگرہ میں اس کی تعمیر کردہ ایک بارہ دری آج بھی موجود ہیں۔

مورخین اس کے دورِ حکومت کے سنہرے دور کی تعریف کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے اور نہ ہی ان کے پاس الفاظ کی کمی ہوتی ہے۔ 'تاریخِ داؤدی' کا یہ بیان کہ "اس کے دورِ حکومت کے گہوارے میں تمام مخلوق امن، سلامتی اور خوشحالی سے بہرہ مند تھی بے معنی نہیں ہے۔ محمد تغلق کے دنوں سے جان ومال کی عام بے امنی کے بعد، شمالی ہند کو ایک مستحکم حکومت نصیب ہوئی۔ بالکل ویسے ہی جیسے انگلستان میں

'وارز آف دی روزیز'(گلابوں کی تباہ کن جنگوں) کے بعد ٹیوڈر بادشاہوں کے تخت نشین ہونے پر امن قائم ہوا تھا۔ امیروں اور نوابوں کو قانون کا پابند بنایا گیا اور سکندر کے مضبوط ہاتھوں نے ان کی سرکشی اور لوٹ مار کو لگام دی - یہاں تک کہ "امیر اور غریب کو برابری کی سطح پر لا کھڑا کیا گیا"۔

اس نے شرقی بادشاہوں کے مقبروں کو تباہ نہیں کیا - -جو جامع مسجد سے ملحقہ احاطے میں واقع ہیں اور اچھی حالت میں محفوظ ہیں۔ جامع مسجد، لال دروازہ مسجد اور اٹالا مسجد سمیت دیگر مساجد کی مرمت شیر شاہ اور بعد میں مغل صوبیداروں نے کروائی تھی۔ اور اب بھی مخیر حضرات اور عوامی چندے سے ان کی مرمت کی جارہی ہے۔ لال دروازہ مسجد ۱۹۳۴ کے شدید زلزلے سے پہنچنے والے نقصان کے باعث تیزی سے بوسیدگی کا شکار ہو رہی ہے اور تب سے اس کی مرمت نہیں کی گئی۔

سکندر لودھی کے دور حکومت میں انتظامیہ فعال تھی۔ سڑکیں اور شاہراہیں ڈاکوؤں سے محفوظ ہو گئیں- جس سے سفر اور مال و اسباب کی نقل و حمل آسان ہو گئی۔ اشیائے خورد و نوش کی قیمتیں اس حد تک سستی تھیں کہ حیرت ہوتی تھی۔ اور اسی وجہ سے کم آمدنی والا شخص بھی آسانی سے پر سکون زندگی بسر کر سکتا تھا۔ "ایک نئے طرز کی زندگی وجود میں آئی، اور کیا امیر کیا غریب سبھی لوگ بااخلاق اور خود دار بن گئے۔"

لیکن ہم اس تلخ حقیقت سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے کہ اس سستے پن کی وجہ سونے چاندی (سکے بنانے والی دھاتوں) کی کمی اور مال کی نقل و حمل یا اشیاء کے تبادلے کا نہ ہونا تھا۔ اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ سلطنت کا کوئی بھی حصہ سمندر سے نہیں لگتا تھا اور دوسری وجہ یہ کہ محکمہ مال میں بدعنوانی اب بھی برقرار تھی- جیسا کہ سلطان اور میاں بھوا کے درمیان ہونے والی گفتگو کی اس کہانی سے ثابت ہوتا ہے جس میں بدعنوانی کو روکنے کے طریقوں پر بات کی گئی تھی۔

سکندر لودھی کا موازنہ دنیا کے عظیم حکمرانوں سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ اکبر کی طرح کوئی مثال پسند یا خواب دیکھنے والے حکمران نہیں تھا بلکہ ایک عملی حکمران تھا۔ اس نے خود کو رعایا کا خادم ظاہر کرنے کی کوشش کی اور "ان کی یہ خاص خواہش تھی کہ وہ اپنی عوام کے دلوں میں خیر سگالی اور محبت پیدا کرے۔" وہ اپنے سر پر رکھی گئی اس ذمہ داری (امانت) کا اس حد تک احساس رکھتا تھا کہ تاریخ کے بہت کم حکمرانوں نے اتنی دیانت داری اور باریک بینی سے اسے نبھایا ہو گا جتنا اس نے نبھایا۔ اس نے اپنی سلطنت کو وسعت دی اور امیر تیمور کے حملے کے بعد بری طرح بکھر جانے والے سلطنت کے وقار کو دوبارہ بحال کیا۔ انہوں نے ملک کو ایک منظم اور باقاعدہ نظامِ حکومت دیا۔ فیروز شاہ تغلق کے دور کے بعد ان کے عہدِ حکومت میں سلطنت اپنی سب سے بڑی جغرافیائی حدود تک پہنچ گئی۔ ان کا قبضہ خوشاب، چناب، بھیرا اور کھوکھر کے علاقے تک پھیلا ہوا تھا۔

لودھی سلطنت کی سرحدیں کشمیر کی حدود تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جہاں کا حکمران ایک احسان مند اتحادی تھا۔ مغربی سرحد ملتان اور سندھ کی آزاد مملکتوں کو چھوتی تھی۔ مشرق میں ترہت (Tirhoot) اور وسطی و مغربی بہار کا پورا علاقہ شامل تھا۔ جو اب دریائے گنگا کے شمال میں چمپارن، سارن، مظفر پور اور دربھنگہ کے اضلاع اور دریائے گنگا کے جنوب میں شاہ آباد، پٹنہ اور شاید مونگیر اور گیا کے ایک حصے پر مشتمل ہے۔ شمال میں یہ سلطنت ہمالیہ کے دامن تک پھیلی ہوئی تھی جس میں وادی کانگڑا تو شامل تھی۔ لیکن نیپال خارج تھا۔ جنوب میں اس کی سرحدیں میواڑ کی مملکت اور مشرق کی طرف تھوڑا آگے ونڈھیاچل (Vindyas) سے ملتی تھیں - جس میں جلون، جھانسی، ہمیر پور اور بانڈہ کے اضلاع کے ساتھ ساتھ بندیل کھنڈ اور وسطی ہندوستان کی متعدد اتحادی اور باجگذار (ماتحت) ریاستیں شامل تھیں۔ دھولپور اور گوالیار کے حکمران اس کے باجگذار تھے۔ اس نے مالوا کی سلطنت سے، جو زوال کے برے دنوں کا شکار ہو چکی تھی، وسطی ہندوستان کا ایک بڑا حصہ فتح کر لیا تھا جس میں چندیری، رنتھمبور، نروار اور سوئی سوپر (Sui-soper) شامل تھے اور ساتھ ہی کرولی کا پورا علاقہ بھی جو اس وقت بھی ایک الگ

ریاست تھا۔ سکندر لودھی نے تمام غریبوں اور ضرورت مندوں کو سرکاری امداد دینے کا اسلامی سوشلزم کا کامیاب تجربہ کیا تھا۔ یہ ایک ایسا طریقہ کار تھا جسے اموی حکمرانوں کے دور کے بعد سے اسلام (سیاست) میں ترک کر دیا گیا تھا۔ بحیثیت قانون ساز وہ سکوں کی اصلاح، بندوبستِ اراضی محصولات ، عدالتی اور سول انتظامیہ میں شیر شاہ سوری اور اکبر دونوں کے لیے ایک مثالی نمونہ تھا۔

پٹھان امراء (افغان سردار) جو برابری کا ایک عجیب و غریب تصور رکھتے تھے اور کسی بھی طاقتور سلطان یا آقا کو برداشت نہ کرنے کا مزاج پاتے تھے_ ان کا رویہ لوئی چودھویں کے دور سے پہلے کے فرانسیسی امراء سے بھی زیادہ بدتر تھا۔ سلطان بہلول لودھی کی وفات کے بعد انہوں نے شہزادہ نظام خان (سلطان سکندر لودھی) کی جانشینی کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ ناکام رہے۔ سکندر لودھی کی مضبوط حکمرانی انہیں اپنی من مانی کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس سے تنگ آکر انہوں نے سکندر لودھی کا تختہ الٹنے اور ان کی جگہ ان کے بھائی شہزادہ فتح خان کو بٹھانے کی سازش کی تھی۔ سلطان سکندر لودھی کی وفات نے انہیں اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لیے لاقانونیت اور انتشار کو برقرار رکھنے کا ایک نیا موقع فراہم کر دیا۔

سلطان ابراہیم لودھی

شہزادہ ابراہیم اگرچہ اپنی دانشمندی، شجاعت اور دیگر خوبیوں کے لیے مشہور تھا۔ لیکن وہ امراء کے تئیں اپنے سخت اور سمجھوتہ نہ کرنے والے رویے کے لیے بھی مانا جاتا تھا۔ اس کا یہ قول مشہور تھا کہ "بادشاہت کسی رشتہ داری کو نہیں جانتی" (شاہی راخویشی نیست) اور یہ کہ تمام چھوٹے بڑے بادشاہ کے برابر کے خادم ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان میں سے بیشتر امراء کی نظر میں ایک ناپسندیدہ شخصیت بن چکا تھا۔ جانشین کے انتخاب میں فیصلہ کن اثر و رسوخ رکھنے والے پٹھان امراء نے سلطنت کو تقسیم کرنے کی سازش تیار کی۔

افغان سرداروں نے اپنے مفاد کے لیے سلطنت کو دو حصوں میں بانٹنے کا فیصلہ کیا۔ یہ طے ہوا کہ دہلی کا تخت ابراہیم لودھی کو ملے گا اور جونپور کی سلطنت اس کے سگے بھائی جلال خان کو دی جائے گی۔

ابراہیم نے اپنے باپ کی وفات کے اگلے دن ۲۲ نومبر ۱۵۱۷ء کو آگرہ میں تاج پہنا اور سلطان ابراہیم کہلایا۔ ادھر جلال خان آرام سے سیر و تفریح کرتا ہوا کالپی پہنچا اور وہاں اس نے فتح خان کو اپنا وزیر مقرر کیا۔

راپڑی کے گورنر خان جہاں لوہانی نے آگرہ آکر سلطان ابراہیم کو مبارکباد دی۔ لیکن پھر درباریوں کو سخت سنائی کہ انہوں نے سلطنت کو کیوں تقسیم ہونے دیا۔ اس کی بات سب کو سمجھ آگئی اور خود سلطان بھی شرمندہ ہوا۔

پھر یہ فیصلہ ہوا کہ جلال خان کو بہانے سے آگرہ بلایا جائے اور قید کر لیا جائے تاکہ دوہری حکومت کا جھنجھٹ ختم ہو۔ اسی کے ساتھ سلطان نے اپنے دوسرے بھائیوں ـــ اسماعیل خان، حسین خان اور محمود خان کو بھی گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ ہیبت خان ـــ جو اپنی چالاکی کے لیے مشہور تھا ـــ کو یہ فرمان لے کر کالپی بھیجا گیا۔ لیکن جلال خان کو پہلے ہی خبر مل چکی تھی۔ اس نے عمدہ۔ بہانے بنائے اور آگرہ جانے سے

انکار کر دیا اور فوراً جونپور کی طرف نکل گیا۔ ہیبت خان خالی ہاتھ واپس لوٹا اور سلطان کو سب بتا دیا۔ اس پر سلطان نے امراء کا ایک اور وفد روانہ کیا۔

سلطان ابراہیم لودھی نے شہزادہ جلال خان کو جونپور سے واپس لانے کے لیے امراء کا ایک دوسرا وفد روانہ کیا۔ اس وفد میں شیخ زادہ محمد (شیخ سعید فرملی کے بیٹے)، ملک اسماعیل (ملک علاؤ الدین جلوانی کے بیٹے) اور قاضی مجد الدین (بادشاہ کے حاجب / درباری) شامل تھے۔ تاہم، ان کی میٹھی باتوں اور سمجھانے بجھانے کا بھی شہزادے پر کوئی اثر نہ ہوا (وہ شہزادے کو راضی نہ کر سکے)۔

اپنے وزیروں اور عقل مند مشیروں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے، سلطان نے جونپور کے تمام گورنروں اور جاگیرداروں کو الگ الگ شاہی فرمان (حکم نامے) بھیجے۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگر وہ جلال خان کی وفاداری چھوڑ دیں اور اس کے احکامات ماننے سے انکار کر دیں، تو وہ ہر ایک کو اس کے مرتبے اور حیثیت کے مطابق انعامات اور نوازشات سے نوازے گا۔

جونپور کے ان امراء میں سے بیشتر ایسے تھے جن کے پاس ۳۰ سے ۴۰ ہزار سواروں (فوجیوں) کے لشکر تھے – جیسے بہار کا گورنر دریا خان نوہانی، غازی پور کا جاگیر دار ناصر خان، اور اودھ و لکھنؤ کا گورنر شیخ زادہ محمد فرملی وغیرہ۔ سلطان نے ان کے پاس گھوڑوں، شاہی خلعتوں (قیمتی لباس) اور جواہرات سے جڑی تلواروں کے تحائف کے ساتھ ایک خاص قاصد بھیجا – تاکہ انہیں اپنے بھائی (جلال خان) کے خلاف بغاوت پر اکسایا جا سکے۔ جیسے ہی یہ شاہی فرمان ان تک پہنچے – ان سب نے شہزادے کے خلاف بغاوت کر دی – یہاں تک کہ جونپور میں جلال خان کا اپنا نائب السلطنت / وزیر اعظم (فتح خان) بھی باغی ہو گیا۔

سلطان ابراہیم یہ خبر سن کر بہت خوش ہوا اور اسے ایک نیک شگون (اچھا نشان) سمجھا۔ جمعہ ۱۵ ذوالحجہ ۹۲۳ھ (مطابق ۳۰ دسمبر ۱۵۱۷ء) کو اس نے محل میں قیمتی ہیروں اور جواہرات سے جڑا ہوا ایک خوبصورت تخت سجایا اور اس پر بیٹھ گیا۔

یہ اس کے والد (سکندر لودھی) اور دادا (بہلول لودھی) کے طریقے سے بالکل ہٹ کر تھا۔ انہوں نے امراء کے سامنے کبھی کسی اونچے چبوترے یا تخت پر بیٹھنا پسند نہیں کیا تھا- بلکہ وہ ان کے ساتھ برابری کا سلوک کرتے تھے۔ ابراہیم کے اس قدم کے پیچھے ایک گہرا مقصد تھا: وہ سب کو عملی طور پر یہ دکھانا چاہتا تھا کہ تمام امراء محض اس کے غلام اور خادم ہیں—یہ ایک ایسا تصور تھا جو پٹھان (افغان) امراء کے آزاد مزاج کے بالکل خلاف تھا- کیونکہ وہ کسی کا محکوم ہونا برداشت نہیں کرتے تھے۔

اس موقع پر ایک عظیم الشان دعوت کا اہتمام کیا گیا اور عام دربار لگایا گیا۔ سرداروں، امراء، درباریوں اور فوجیوں کو ان کے رتبے اور حیثیت کے مطابق شاہی لباس، سجاوٹی تلواریں، خنجر، گھوڑے، ہاتھی، سرکاری عہدے، خطابات اور جاگیریں دی گئیں۔ عام عوام کا دل جیتنے کے لیے سلطان نے علماء اور ضرورت مندوں کو صدقات و خیرات کی مد میں بھاری رقم دی اور تمام چھوٹے بڑے لوگوں کے وظائف اور پنشن میں اضافہ کر دیا۔ اس طرح سلطنت کے معاملات ایک نئی چمک کے ساتھ نکھر اٹھے اور حکومت کو نئی طاقت اور مضبوطی ملی۔

شہزادہ جلال خان اب خود کو ایک ایسی صورتحال میں پا رہا تھا جیسے (عباسی دور میں) خراسان کا گورنر شہزادہ مامون الرشید تھا۔ سن ۸۰۹ء میں ان کے والد خلیفہ ہارون الرشید کی وفات کے بعد مامون کے بڑے بھائی بغداد کے خلیفہ امین الرشید نے اس کا پیدائشی حق (وراثت) چھیننے کی کوشش کی تھی۔

اپنے بھائی ابراہیم کے اس رویے اور اپنے ہی امراء کی بغاوت سے جلال خان سخت پریشان ہوا—وہ یہ اچھی طرح جانتے ہوئے کہ اب اس کے بھائی کے ساتھ صلح کی کوئی گنجائش نہیں بچی ہے۔ اس نے (خراسان میں مامون کی طرح) جونپور کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔

اعظم ہمایوں کو سلطان ابراہیم سے ذاتی رنجش تھی۔ جب شہزادہ جلال خان بے بس حالت میں ان کے پاس پہنچے اور اسلامی اخوت اور انصاف کے نام پر ان سے اپیل کی تو اعظم ہمایوں کو کچھ ہمدردی محسوس

ہوئی۔ لیکن اس سے بھی اہم بات جسے اس نے محسوس کیا کہ وہ اتنا مضبوط نہیں ہے کہ وہ خود سلطان ابراہیم کا مقابلہ کر سکے۔ اس لیے اس نے مزاحمت کرنے کی بجائے جلال خان کا ساتھ دینا ہی بہتر سمجھا۔
اس نے قلعہ کلنجر کا محاصرہ ترک کر دیا اور وفاداری کا پختہ وعدہ کرتے ہوئے شہزادہ جلال خان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ انہوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے جونپور کی سلطنت کو کسی بھی مخالفت سے پاک کیا جائے۔ ان کی مشترکہ فوج نے اودھ کے گورنر کے بیٹے سعید خان کے خلاف تیزی سے پیش قدمی کی۔ سعید خان نے لڑنے کی ہمت نہیں کی اور لکھنؤ کی طرف بھاگا اور سلطان ابراہیم کو جو کچھ ہوا تھا اس کے بارے میں اطلاع بھیجی۔

جب سلطان ابراہیم نے یہ بری خبر سنی تو اس نے فوراً اپنے بھائی کے خلاف ایک بڑی فوج بھیجنا چاہا۔ لیکن اس کے مشیروں نے اسے انتظار کرنے پر آمادہ کیا۔ اس کے بجائے اس نے شہزادہ شیخ دولت خان کو حکم دیا کہ وہ اپنے قیدی بھائیوں اسماعیل خان، حسین خان اور محمود خان کو ہانسی (حصار ضلع، پنجاب کا ایک قصبہ، حصار سے تقریباً ۱۵ میل دور ہے) کے قلعے میں منتقل کر دیں اور انہیں وہاں محفوظ طریقے سے محفوظ رکھیں۔ سلطان نے دل کھول کر ان میں سے ہر ایک کے لیے دو بیویاں، کافی خوراک اور لباس کا انتظام کیا۔

اپنے بھائیوں کو اب محفوظ طریقے سے قید کرنے اور بغاوت کا خوف نہ ہونے کے باعث سلطان ابراہیم نے اپنے تنخواہ داروں کو حکم دیا کہ وہ فوجیوں کو خوش اور جنگ کے لیے تیار رکھنے کے لیے ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی ادا کر دی۔

جمعرات، ۷ جنوری ۱۵۱۸ کو، سلطان ابراہیم مشرق کی طرف بڑھے اور موجودہ مین پوری ضلع کے بھونگاؤں کے قصبے میں پہنچے۔ وہاں اس نے راجپوتوں کو شکست دی جو جلال خان کی حمایت کر رہے تھے۔ اس کے بعد اس نے قنوج کی طرف رخ کیا۔ وہ ابھی راستے میں تھا کہ اس کو بہت خوش آئند خبریں موصول ہوئیں۔ اعظم ہمایوں خان شیروانی نے شہزادہ جلال خان کو چھوڑ دیا تھا اور اب وہ اپنے بیٹے فتح

خان شیر وانی کے ساتھ، جو جونپور میں جلال خان کے وزیر اعلیٰ رہ چکے تھے، سلطان ابراہیم کی طرف آرہے تھے۔

اس خبر نے سلطان ابراہیم کے اعتماد اور طاقت کو بہت بڑھا دیا۔ اس نے بزرگوں کا ایک گروپ اعظم ہمایوں کی حفاظت کے لیے بھیجا اور اس کا استقبال تحائف اور اعزازات سے کیا۔ اسی وقت کے قریب کول کے علاقے میں جرتولی کا ایک راجپوت زمیندار مان چند نے ۱۵۱۹ء کے شروع میں بغاوت کر دی۔ کول (علی گڑھ) کا علاقہ ہے جو ان دنوں باغیوں کا ایک مشہور گڑھ بن گیا - ایک جنگ کے دوران باغیوں نے وہاں کے گورنر 'عمر خان شیر وانی' (ابن سکندر سور) کو قتل کر دیا۔

اس پر سلطان ابراہیم لودھی نے سنبھل کے گورنر ملک قاسم کو حکم دیا کہ وہ باغی لیڈر مان چند کے خلاف کارروائی کرے۔ اس فتنہ کو دبانے کے بعد ملک قاسم قنوج میں سلطان کے فوجی کیمپ میں جا ملا۔ اس دوران زیادہ تر زمیندار اور امیر، جیسے سعید خان اور اودھ کے گورنر شیخ زادہ محمد فرملی بھی سلطان کا ساتھ دینے پہنچ گئے۔

سلطنت نے شہزادہ جلال خان کے خلاف ایک بہت بڑی فوج روانہ کی۔ جس میں جنگی ہاتھی بھی شامل تھے۔ اس فوج کی کمان اعظم ہمایوں خان شیر وانی، اعظم ہمایوں لودھی اور ناصر خان لوحانی جیسے بڑے سردار کر رہے تھے۔

شہزادہ جلال خان جو اس وقت کالپی میں تھا۔ اسے حملے کا اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے قطب خان لودھی کی بیوہ 'نعمت خاتون' (جس بزرگ خاتون کو شہزادہ جلال کی حفاظت میں دیا گیا تھا۔ ان کی عمر اس وقت ۸۰ سال سے زیادہ تھی) اپنے خاندان اور اپنے قریبی لوگوں کو کالپی کے قلعے میں چھوڑ دیا۔ ان کی حفاظت کے لیے اس نے 'عماد الملک بدرالدین' کو ایک مناسب فوج کے ساتھ وہاں تعینات کیا۔ سلطان کی فوج کے کالپی پہنچنے سے پہلے ہی شہزادہ جلال خان خود ۳۰ ہزار گھڑ سواروں اور چند ہاتھیوں کے لشکر کے ساتھ لودھیوں کے دارالحکومت 'آگرہ' کی طرف نکل پڑا۔ اسی دوران، سلطان ابراہیم

لودھی کالپی پہنچ گیا۔ قلعے کا محاصرہ کیا اور دو دن تک توپوں اور بندوقوں کی گولہ باری کے بعد اس پر قبضہ کر لیا۔ اس لڑائی میں کالپی شہر پوری طرح تباہ ہو گیا اور سلطان کی فوج کے ہاتھ بڑی مقدار میں لوٹ کا مال (مالِ غنیمت) آیا۔

جب سلطان ابراہیم لودھی کو پتہ چلا کہ شہزادہ جلال خان آگرہ پر حملہ کرنے آ رہا ہے- تو اس نے اپنے ایک وفادار سردار ملک آدم کاکڑ کو فوری طور پر آگرہ کی حفاظت کے لیے بھیجا۔ شہزادہ جلال آگرہ کو اس لیے تباہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ سلطان نے اس کے شہر 'کالپی' کو برباد کر دیا تھا۔

ملک آدم نے آگرہ پہنچ کر چالاکی دکھائی۔ اس نے شہزادے کے ساتھ امن کی باتیں شروع کر دیں اور جھوٹے وعدے کر کے اسے حملے سے روکے رکھا۔ ملک آدم کا اصل مقصد صرف وقت ضائع کرنا تھا تاکہ سلطان کی مددگار فوج آگرہ پہنچ سکے۔

جیسے ہی سلطان کی بڑی فوج (جس کی کمانڈ ملک اسماعیل، کبیر خان لودھی اور بہادر خان لودھی کر رہے تھے) آگرہ پہنچی۔ ملک آدم نے اپنے تیور بدل لیے۔ اس نے شہزادہ جلال کو پیغام بھیجا:

"اگر تم بادشاہ بننے کا خواب چھوڑ دو، اپنی شاہی چھتری، نقارے، ڈھول اور بادشاہت کی تمام نشانیاں ہمارے حوالے کر دو اور ایک عام درباری کی طرح رہنے پر راضی ہو جاؤ، تو ہم سلطان سے سفارش کریں گے کہ وہ تمہاری جان بخش دیں اور تمہیں دوبارہ کالپی کا علاقہ دے دیں۔"

شہزادہ جلال کے پاس ۳۰ ہزار گھڑ سوار اور ۱۶۰ جنگی ہاتھی تھے، لیکن اس کے باوجود وہ ڈر گیا اور لڑنے سے انکار کر دیا۔ اس نے ملک آدم کی شرائط مان لیں۔

اس کے وفادار ساتھی جو اس کے لیے مرنے مٹنے کو تیار تھے - اس کے اس فیصلے پر بہت غصے ہوئے اور کہنے لگے: "یہ کیسی بزدلی ہے؟ سلطان تمہیں کبھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ہم نے دس سال تمہارا نمک کھایا ہے۔ تھوڑی ہمت دکھاؤ تاکہ ہم تمہارے لیے لڑ سکیں۔ سلطان بہت گھمنڈی ہے- وہ تمہارا وہی حشر کرے گا جو اس نے تمہارے باپ کے زمانے کے دوسرے امیروں کا کیا تھا۔"

جلال نے اپنے ساتھیوں کی ایک نہ سنی اور بہترین موقع گنوا دیا۔ ملک آدم نے جلال سے تمام شاہی نشانیاں لیں اور اٹاوہ جا کر سلطان ابراہیم لودھی کو سارا ماجرا سنایا۔ لیکن سلطان چونکہ جنگ کے لیے پوری طرح تیار تھا۔اس لیے اس نے یہ صلح نامہ ماننے سے صاف انکار کر دیا اور جلال پر حملہ کرنے نکل پڑا۔

یہ دیکھ کر شہزادہ جلال گوالیار کی طرف بھاگ گیا اور وہاں کے راجہ بکرماجیت (راجہ مان سنگھ کے بیٹے) کے پاس پناہ لے لی۔ اس کے جاتے ہی اس کی فوج تتر بتر ہو گئی۔

سلطان ابراہیم لودھی آگرہ آیا اور کچھ دن وہاں رکا۔ تمام باغی اور مخالف امیروں نے اس کے سامنے سر جھکا دیا۔ جس سے اس کی حکومت پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گئی۔

اس کے بعد سلطان نے دلی کی حفاظت کے لیے اپنے چند بڑے جرنیل بھیجے اور 'چندیری' کے علاقے کی حفاظت کے لیے شیخ زادہ منجھو کو روانہ کیا - تاکہ راجپوت راجہ رانا سانگا کے ممکنہ حملے کو روکا جا سکے۔ (چندیری ۱۵۱۴ء سے لودھیوں کے پاس تھا اور وہاں مالوہ کا شہزادہ احمد خان سلطان کی پناہ میں رہ رہا تھا)۔

سلطان ابراہیم لودھی گوالیار کے راجہ سے بہت ناراض تھا_ کیونکہ اس نے بھاگے ہوئے شہزادے جلال خان کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ اس بات کا بدلہ لینے کے لیے سلطان نے ۳۰ ہزار گھڑ سواروں اور ۳۵۰ ہاتھیوں پر مشتمل ایک بڑی فوج روانہ کی۔ اس فوج کی کمانڈ اعظم ہمایوں خان شیروانی کو سونپی گئی (جنہیں ۱۵۱۸ء میں شہزادہ جلال کا ساتھ چھوڑنے پر کڑا کا گورنر بنایا گیا تھا)۔ جب یہ شاہی فوج گوالیار کے قریب پہنچی، تو شہزادہ جلال خان قلعے سے نکل کر مالوہ کے سلطان محمود خلجی (دوم) کے پاس بھاگ گیا۔

اعظم ہمایوں شیروانی کی مدد اور ان کے ماتحت کام کرنے کے لیے سلطان نے مزید کئی بڑے لودھی اور نوہانی سرداروں کو امدادی فوج دے کر بھیجا۔ اسی دوران گوالیار کے راجہ مان سنگھ انتقال کر گئے۔ جو اپنی بہادری اور سخاوت میں بے مثال مانے جاتے تھے۔ (راجہ مان سنگھ پہلے لودھی سلطنت کے وفادار تھے لیکن ۱۵۰۳ء میں سکندر لودھی کی گوالیار مہم ناکام ہونے کے بعد وہ ایک طرح سے آزاد ہو چکے تھے)۔

ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے راجہ بکرماجیت گوالیار کے تخت پر بیٹھے - جنہوں نے گوالیار کے قلعے کو مزید مضبوط اور محفوظ بنالیا تھا۔

کچھ وقت بعد سلطان ابراہیم لودھی خود محاصرے کی نگرانی کرنے گوالیار پہنچ گیا۔اس کے حکم کے مطابق شاہی جرنیل روزانہ مل بیٹھتے اور جنگی حکمتِ عملی پر بات کرتے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے بادل گڑھ پر حملہ کیا جائے—یہ پتھروں سے بنی ایک اونچی اور مضبوط عمارت تھی جسے راجہ مان سنگھ نے اصل قلعے کے نیچے والے حصے میں اس لیے بنوایا تھا تاکہ قلعے کو ناقابلِ تسخیر (جسے جیتا نہ جاسکے) بنایا جا سکے۔

یہ محاصرہ کافی لمبا چلا۔ جس میں دشمن کی بندوقوں اور گولیوں کی وجہ سے سلطان کے بہت سے فوجی مارے گئے۔ آخر کار شاہی فوج نے بارود کے ذریعے قلعے کی دیوار میں شگاف (سوراخ) کر دیا۔ اس طرح ایک بھرپور حملے کے بعد بادل گڑھ کو فتح کر لیا گیا۔

شاہی فوج کو قلعے کے اندر سے پیتل کی بنی ہوئی ایک گائے ملی- جس کے اندر ایسا نظام (میکانزم) تھا کہ وہ گائے کی طرح آواز (رنبھانے کی آواز) نکال سکتی تھی۔ ہندو سالہا سال سے اس کی پوجا کر رہے تھے۔ سلطان کے حکم پر اسے دلی بھیج دیا گیا اور وہاں 'بغداد گیٹ' پر نصب کر دیا گیا۔ یہ گائے ۱۵۸۵ء(۹۹۴ ہجری) تک وہیں رہی - دور کے بڑے موٴرخین (جیسے بدایونی، نظام الدین اور فرشتہ) نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس عجیب و غریب مجسمے کو اپنی آنکھوں سے دلی کے دروازے پر دیکھا تھا اور بعد میں پگھلی ہوئی حالت میں بھی دیکھا تھا- یہاں تک کہ مغل شہنشاہ اکبر کے حکم پر اسے فتح پور سیکری لایا گیا، جہاں اسے پگھلا کر گھنٹیاں، گھڑیال اور توپیں بنادی گئیں۔

ابراہیم لودھی بادل گڑھ ۱۵۱۸ء میں فتح کرنے کے بعد سلطان آگرہ واپس آ گیا۔ اب اپنے امیروں اور رشتہ داروں کے خلاف اس کا شک اور بدگمانی اتنی بڑھ چکی تھی کہ اس نے ان میں سے اکثر کو جیل میں ڈال دیا۔

مالوہ سے نکلنے کے بعد شہزادہ جلال خان گونڈوانہ کے علاقے میں 'گڑھ کٹنگا' کے راجہ کے پاس بھاگا۔ لیکن وہاں کے رہنے والے گونڈ قبیلے کے لوگوں نے اسے قید کر لیا۔ سلطان ابراہیم لودھی کی ہمدردی حاصل کرنے اور یقیناً ایک بڑا انعام پانے کی لالچ میں ان لوگوں نے شہزادے کو پکڑ کر سلطان کے سامنے پیش کر دیا۔

سلطان نے اس بدقسمت شہزادے کو اپنے سامنے پیشی کے لیے ایک بڑا شاہی دربار لگایا - جہاں شہزادہ جلال کو ہاتھ باندھ کر لایا گیا۔ سلطان نے حکم دیا کہ اسے ہانسی کے قلعے میں لے جایا جائے اور اس کے دوسرے بھائیوں کے ساتھ جیل میں بند کر دیا جائے۔ مگر سلطان کے کچھ خیر خواہوں (مشیروں) نے اسے مشورہ دیا کہ جلال کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ چنانچہ سلطان نے 'احمد خان' نامی ایک شخص کو اس کام کے لیے بھیجا۔ جس نے ہانسی پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں شہزادہ جلال کو قتل کر دیا۔

اب جبکہ سلطان کے تمام مخالفین ختم ہو چکے تھے اور اس کی حکومت کو کوئی خطرہ نہیں تھا مگر وہ اپنے والد کے زمانے کے تمام پرانے امیروں اور وزیروں پر حد سے زیادہ شک کرنے لگا اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آنے لگا۔ دوسری طرف وہ امیر بھی سلطان سے نفرت کرنے لگے اور انہیں اپنی جان کی فکر ہونے لگی۔

بدقسمتی سے سلطان یہیں نہیں رکا۔ اس نے گوالیار کے فوجی کیمپ سے اپنے سب سے وفادار جرنیل اعظم ہمایوں خان شیروانی کو فوراً دربار میں حاضر ہونے کا شاہی حکم (فرمان) بھیجا۔

یہ حکم اس وقت آیا جب گوالیار کی جنگ آخری مراحل میں تھی۔ بادل گڑھ (گوالیار کا بیرونی قلعہ) فتح کرنے کے بعد اعظم ہمایوں شیروانی کی قیادت میں شاہی فوج نے گوالیار کے اصل اور مرکزی قلعے کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ اعظم ہمایوں نے بارود اور راکٹوں کے ذریعے قلعے کی دیواریں توڑنے کی بہت کوششیں کیں، جبکہ قلعے کے اندر موجود راجپوت محافظوں نے تیل میں ڈوبے ہوئے جلتے ہوئے کپاس کے ڈھیر

شاہی فوج پر پھینک کر ہر حملے کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود شاہی فوج کی توپوں اور بموں نے قلعہ والوں کو شدید مشکل میں ڈال دیا تھا۔

جب راجہ بکرماجیت نے دیکھا کہ وہ ہار رہے ہیں۔ تو انہوں نے صلح کی بات چیت شروع کر دی۔ انہوں نے سلطان کو راضی کرنے کے لیے سات من سونا (جو اس دور کے حساب سے تقریباً ۲۸ سیر بنتا ہے)، اپنا مشہور ہاتھی 'شیام سندر' اور اپنی بیٹی دینے کی پیشکش کی۔

عین اسی وقت سلطان کا فرمان پہنچا- جس میں اعظم ہمایوں شیر وانی کو فوری واپس بلایا گیا تھا۔ اعظم ہمایوں کے بیٹوں نے انہیں خبر دار کرتے ہوئے کہا: "سلطان آپ کو مار ڈالے گا، جیسے اس نے دوسرے امیروں کو مار دیا ہے۔"

اعظم ہمایوں نے جواب دیا: "میں برسوں سے اس شاہی خاندان کا نمک کھا رہا ہوں اور اس کا خیر خواہ رہا ہوں۔ میں نافرمانی کر کے نمک حرامی کا داغ اپنے سر نہیں لوں گا۔"

ایک اور افغان سردار داؤد خان شیر وانی نے ان سے کہا: "ہمارے سلطان کا دماغ خراب ہو چکا ہے- اسے وفادار اور غدار میں فرق کرنا نہیں آتا۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ آپ کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا جو اس نے میاں بھوا اور حاجی خان کے ساتھ کیا تھا۔"

لیکن وہ وفادار خادم آگرہ جانے کے اپنے فیصلے پر قائم رہا- حالانکہ اسے راستے میں یہ خبر بھی مل گئی تھی کہ سلطان کے حکم پر محمود خان شیر وانی اور حسین خان جیسے بڑے امیروں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود وہ آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

داؤد خان اور اللہ داد خان کے سمجھانے کے باوجود اعظم ہمایوں شیر وانی نے اپنا ارادہ نہیں بدلا اور وہ آگرہ جانے کے لیے آگے بڑھتا رہا۔ لیکن جب وہ دارالحکومت آگرہ سے صرف دس میل دور رہ گیا_ تو سلطان کے سپاہیوں نے ان کا شاہی رعب و دبدبہ، رتبہ اور تمام خزانے چھین لیے۔ جیسے ہی وہ آگرہ پہنچا_ انہیں اور ان کے بیٹے فتح خان کو جیل میں ڈال دیا گیا۔

یہاں ایک بہت ہی افسوسناک اور جذباتی منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ - اتنی بے وفائی اور برے سلوک کے بعد بھی اس وفادار خادم نے سلطان سے یہ الفاظ کہے:

"میرا بیٹا (اسلام خان) ذرا شاکی طبیعت کا ہے۔ اس پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ دوسری بات یہ کہ نماز کے وضو کے لیے میرے پانی کی سپلائی اور استنجاء کے لیے مٹی کے ڈھیلے بند نہ کیے جائیں۔"

جس وقت اعظم ہمایوں شیروانی کو قید کیا گیا - اسی وقت ان کے بیٹے اسلام خان کو 'کڑا' کے گورنر (شقداری) کے عہدے سے بھی ہٹا دیا گیا۔ اسلام خان اپنے والد کی گوالیار مہم میں غیر موجودگی کے دوران وہاں ان کی جگہ کام سنبھال رہے تھے۔

سلطان ابراہیم لودھی کا یہ فیصلہ ایک بہت بڑی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ - جس کے برے انجام کو دیکھنے سے وہ بالکل اندھا ہو چکا تھا۔ اس نے بارود کے ڈھیر پر چنگاری کا کام کیا اور غصے سے بھرے ہوئے ناراض افغان امراء اور روساء کو کھلم کھلا بغاوت کا اشارہ مل گیا۔

اسلام خان شیروانی نے کڑا مانک پور میں کھلی بغاوت کر دی۔ اس نے وہاں کے نئے گورنر احمد خان لودھی کو مار بھگایا اور اپنے والد کی تمام جائیداد اور سامان پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ یاد رہے کہ یہ احمد خان لودھی وہی شخص تھا- جس نے شہزادہ جلال خان کو قتل کیا تھا اور سلطان نے اسے انعام کے طور پر کڑا کی گورنری دی تھی۔ اسلام خان نے ایک فوج اکٹھی کی۔ احمد خان پر حملہ کیا اور اسے شکست دے دی۔

دوسری طرف اعظم ہمایوں شیروانی کو واپس بلائے جانے کے بعد بھی شاہی فوج نے گوالیار میں جنگ جاری رکھی تھی اور ۱۵۱۹ء کے آس پاس انہوں نے گوالیار کو پوری طرح فتح کر لیا تھا۔

سلطان اسلام خان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے دوسری فوج بھیجنے ہی والا تھا کہ اچانک دربار میں موجود دو اور بڑے امیر —اعظم ہمایوں لودھی اور سعید خان لودھی— سلطان کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہیں ڈر تھا کہ اگلی باری ان کی ہے۔ وہ سلطان کے سامنے سے بھاگ کر لکھنؤ میں اپنی جاگیروں پر پہنچ گئے اور وہاں جا کر اسلام خان سے ہاتھ ملا لیا۔ اس طرح ایک بہت بڑی اور خطرناک بغاوت کھڑی ہو گئی۔

سلطان ابراہیم لودھی ایسی ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لیے ہمیشہ الرٹ رہتا تھا- اس لیے اس نے فوراً ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا۔ اس نے اس فوج کی کمانڈ کئی بڑے وفادار سرداروں کو سونپی، جن میں یہ لوگ شامل تھے:

احمد خان (جو باغی اعظم ہمایوں لودھی کا اپنا بھائی تھا)

حسین فرملی کے بیٹے

مجلسِ اعلیٰ بہکاری فرملی

شیخ زادہ محمد فرملی

علی خان خانان فرملی

دلاور خان (ابن احمد خان)

سارنگ خان

قطب خان (ابن غازی خان جلوانی)

بھیکن خان لوہانی

سکندر (ابن ملک آدم کاکڑ)

سلطان نے اس دیو ہیکل فوج کو باغیوں کے اتحاد کو کچلنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ شاہی فوج آگے بڑھتے ہوئے 'بنگر مئو' کے قصبے میں پہنچ گئی۔

بنگر مئو کے مقام پر سلطان ابراہیم لودھی کی بڑی فوج کو ایک بہت بڑا جھٹکا لگا۔ باغی سردار اعظم ہمایوں لودھی کے ایک کمانڈر اقبال خان (جو پہلے ایک غلام تھا) نے شاہی فوج پر گھات لگا کر اچانک حملہ کر دیا۔ اس نے اپنے ۵ ہزار گھڑ سواروں اور چند ہاتھیوں کے ساتھ ایسی زبردست جنگ لڑی کہ سلطان کے بہت سے فوجی مارے اور زخمی ہو گئے جبکہ باقی بچ جانے والے فوجی خوفزدہ ہو کر تتر بتر ہو گئے۔

جب شاہی فوج کی اس شرمناک ہار کی خبر سلطان ابراہیم تک پہنچی تو وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے اپنے جرنیلوں کو سخت ترین شاہی احکامات (فرمان) بھیجے اور انہیں خوب جھاڑا۔ سلطان نے صاف لفظوں میں وارننگ دی کہ جب تک وہ باغیوں کے قبضے سے علاقے واپس نہیں چھین لیتے - انہیں لودھی سلطنت میں "ملعون اور مردود" (لعنت کا حقدار) سمجھا جائے گا۔ اس نے فوراً اپنے دوسرے امراء اور رشتہ داروں کو ایک اور بڑی فوج دے کر ہاری ہوئی فوج کی مدد کے لیے روانہ کیا۔

دوسری طرف سلطان نے اپنے غصے کا نشانہ اپنے والد کے زمانے کے بزرگ اور معزز وزیر میاں بھوا کو بنایا اور انہیں انتہائی عبرتناک اور دردناک طریقے سے شہید کر دیا۔ اپنے برے مشیروں کے کہنے پر سلطان نے ایک نیا محل بنوایا۔ جس کے نیچے ایک خفیہ تہہ خانہ تھا۔ جب وہ عمارت تیار ہو گئی تو اس کی دیواروں کی اینٹوں کے درمیان بڑی مقدار میں بارود چھپا دیا گیا۔

اپنے قیدیوں کا ڈر دور کرنے اور انہیں دھوکہ دینے کے لیے سلطان نے میاں بھوا اور دوسرے نشانہ بننے والے امیروں کو رہا کرنے کا ڈرامہ کیا اور انہیں تحفے تحائف بھی دیے۔ ایک دن اس نے میاں بھوا اور دیگر امراء کو یہ کہہ کر بلایا کہ وہ 'اسلام خان' کی بغاوت کو کچلنے کے لیے ان سے مشورہ کرنا چاہتا ہے- - وہ انہیں اس نئے بنے ہوئے محل میں لے گیا۔ جب وہ سب وہاں بیٹھ کر بات چیت میں مصروف تھے- تو دیواروں میں چھپے بارود کو آگ لگا دی گئی۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور میاں بھوا اور ان کے ساتھی اس تباہی کی آندھی میں جل کر بھسم ہو گئے۔ ان کی راکھ ایسے اڑنے لگی جیسے طوفان میں درختوں کے پتے اڑ جاتے ہیں۔

دوسری طرف باغی امیروں نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کر لیا تھا۔ جس میں تقریباً ۴۰ ہزار گھڑ سوار اور ۵۰۰ جنگی ہاتھی شامل تھے۔ جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے آئیں اور جنگ بالکل طے تھی۔ تو اس دور کے ایک مشہور بزرگ اور صوفی شیخ راجو بخاری نے بیچ میں پڑ کر خون خرابہ روکنے کی کوشش کی۔ انہوں نے باغیوں کو جنگ نہ کرنے پر راضی کر لیا۔ باغی امراء اس شرط پر صلح کرنے اور ملک

چھوڑ کر کسی دوسری سلطنت میں پناہ لینے پر راضی ہو گئے کہ سلطان ابراہیم جیل میں بند بزرگ جرنیل اعظم ہمایوں شیروانی کو رہا کر دے گا۔ لیکن جب یہ شرائط منظوری کے لیے سلطان کے سامنے پیش کی گئیں۔ تو اس نے انتہائی غرور اور حقارت کے ساتھ انہیں مسترد کر دیا۔ امن قائم کرنے کے بجائے اس نے اپنے وفادار گورنروں ـــ دریا خان نوہانی، شیخ زادہ محمد فرملی اور غازی پور کے گورنر ناصر خان کو سخت حکم بھیجا کہ وہ باغیوں پر ہر طرف سے دھاوا بول دیں۔

جیل کے اندر اعظم ہمایوں خان شیروانی کے قتل کی خبر باہر نکل گئی۔ اب ہر کوئی جان چکا تھا کہ انہیں اور دیگر امیروں کو سلطان ابراہیم لودھی کے اشارے پر ہی موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ مؤرخ احمد یادگار بڑے دکھ کے ساتھ لکھتے ہیں:

"آخر کار سلطان نے اس مخلص اور وفادار خادم (اعظم ہمایوں) کو قید خانے میں قتل کروادیا اور اس طرح اس نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی سلطنت کی جڑیں کاٹ ڈالیں۔"

باقی بچ جانے والے امیروں کے لیے واقعہ عبرت ناک تھا- وہ جان گئے کہ آگے ان کا کیا انجام ہونے والا ہے- چنانچہ "ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر میں لگ گیا۔" اس کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ بہار کے گورنر دریا خان نوہانی، خان جہان اور میاں حسین فرملی نے سلطان کے خلاف بغاوت کر دی۔ حسین فرملی نے اپنی بغاوت کا آغاز 'چندیری' سے کیا۔

میواڑ کے راناسانگا کے ساتھ ٹکراؤ

پرانی تاریخوں میں حسین خان فرملی کی بغاوت اور پھر سلطان کے اشارے پر ان کے قتل کے حالات کا ذکر ملتا ہے ـــ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس نے لودھی سلطنت کے امیروں کی نفرت اور مایوسی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ یہ پورا معاملہ سلطان کی میواڑ مہم سے جڑا ہوا تھا۔ چندیری پر میواڑ کے راجپوت راجہ راناسانگا کے حملے کی وجہ سے دلی اور میواڑ کی افواج کے درمیان پہلی جھڑپ ہوئی۔ اگرچہ اس کی زیادہ تفصیلات نہیں

ملتی ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ راجپوتوں کی چندیری جیتنے کی کوشش کو لودھی فوج نے ناکام بنادیا تھا۔

دوسرا بڑا ٹکراؤ ۱۵۱۹ء (۹۲۵ ہجری) میں گوالیار کی مہم ختم ہونے کے فوراً بعد ہوا۔ اس واقعے کے بعد میواڑ اور دلی کی سرحدیں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئی تھیں۔ جس کی تین بڑی وجوہات تھیں:

گوالیار کی آزاد ریاست ختم ہو چکی تھی، جو پہلے دونوں سلطنتوں کے درمیان ایک بفر (حائل) ریاست کے طور پر موجود تھی۔

رانا سانگا نے مالوہ کے سلطان محمود (دوم) کو شکست دے کر قید کر لیا تھا۔ جس سے مالوہ کے پورے علاقے پر رانا سانگا کا رعب قائم ہو گیا تھا۔

رانا سانگا نے رنتھمبھور کے قلعے پر قبضہ کر لیا تھا، جس کے حاکم علی خان نے پہلے سکندر لودھی سے پناہ مانگی تھی۔

رانا سانگا نے لودھی سلطنت کے امیروں کی آپسی پھوٹ اور بغاوتوں کا فائدہ اٹھا کر بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی کوشش کی۔ اس خطرے سے نمٹنے کے لیے سلطان ابراہیم لودھی نے میاں مکھن نامی افسر کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی۔ سلطان نے میاں حسین خان فرملی اور سکندر لودھی کے زمانے کے سابق سپہ سالار میاں معروف کو حکم دیا کہ وہ میاں مکھن کے ماتحت رہ کر رانا سانگا کے خلاف کارروائی کریں۔

تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جنگ مالوہ کے علاقوں میں لڑی گئی تھی اور اس بار حملے کی شروعات رانا سانگا کی طرف سے ہوئی تھی۔

جب شاہی فوج رانا سانگا کے لشکر کے بالکل سامنے پہنچ کر خیمہ زن ہو گئی تو عین اسی وقت سلطان ابراہیم لودھی کا ایک خفیہ خط (فرمان) میاں مکھن کو ملا۔ سلطان نے اس خط میں میاں مکھن کو حکم دیا تھا کہ "جس طرح بھی ممکن ہو، کوئی چال چل کر میاں حسین فرملی اور میاں معروف کو دھوکے سے قید کر لو اور انہیں سلطان کے پاس بھیج دو"۔

میاں مکھن نے پہلی چال یہ چلی کہ وہ میاں معروف کے بیٹے کے انتقال پر افسوس (تعزیت) کرنے کا بہانہ بنا کر ان کے خیمے میں گیا تا کہ انہیں وہیں قید کر سکے۔ لیکن میاں حسین کو اس خفیہ سازش کا پتہ چل گیا۔ وہ عین وقت پر میاں معروف کے کیمپ پہنچ گئے اور میاں مکھن کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔

جب میاں مکھن نے سلطان کو اس صورتحال کی خبر دی تو سلطان نے ایک اور شاہی فرمان بھیجا۔ جس میں میاں معروف اور میاں حسین فرملی کی گرفتاری کا صاف حکم تھا۔ یہ فرمان میاں مکھن کے کیمپ میں سب کے سامنے پڑھا جانا تھا۔ جب اس فرمان کو پڑھنے کی تیاری کی جارہی تھی تو میاں حسین اپنے ایک ہزار مسلح (ہتھیار بند) جوانوں کے ساتھ میاں مکھن کے کیمپ میں گھس گئے۔ اور اس دوسری کوشش کو بھی ناکام بنا دیا۔ میاں حسین نے میاں مکھن کو للکارتے ہوئے کہا:

"ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس شاہی فرمان کا مقصد ہماری جان لینا ہے، لیکن ہم اتنی آسانی اور ذلت کے ساتھ ہار نہیں مانیں گے۔"

جب بچنے کا کوئی راستہ نہ رہا تو میاں حسین نے میواڑ کے راجپوت راجہ رانا سانگا کے پاس اپنا ایک قاصد بھیجا۔ شروع میں تو رانا سانگا کو شک ہوا کہ کہیں یہ کوئی چال نہ ہو لیکن بعد میں اس نے اپنے بھتیجے کو ایک ہزار گھڑ سواروں کے ساتھ ان کی حفاظت کے لیے بھیجا - اور یہ دونوں افغان سردار شاہی فوج چھوڑ کر رانا سانگا کے ساتھ جا ملے۔

دوسرے دن میاں مکھن اپنے بڑے جرنیلوں اور ان کے فوجیوں کے چلے جانے کی وجہ سے کافی کمزور ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی وہ ۳۰ ہزار گھڑ سواروں اور ۳۰۰ جنگی ہاتھیوں کے ساتھ رانا سانگا کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلا۔

جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے صف آراء ہوئیں - تو میاں مکھن نے میاں معروف کو ایک پیغام بھیجا اور ان سے التجا کی کہ وہ میاں حسین کی طرح غداری کا راستہ نہ اپنائیں۔ اس پر میاں معروف نے ایک بڑا ہی غیرت مندانہ اور تلخ جواب دیا:

"پچھلے ۳۰ سالوں سے ہم سلطان بہلول لودھی اور ان کی نسل کا نمک کھا رہے ہیں۔ ہم سلطان سکندر لودھی کے سپہ سالار (کمانڈر ان چیف) تھے۔ یہ ہماری ہی محنت کا نتیجہ تھا کہ چونڈ کا قلعہ اور نگر کوٹ کے علاقے فتح ہوئے۔ ہم وہ تاریخی پتھر کا مجسمہ دلی لے کر آئے جس کی ہندو تین ہزار سال سے پوجا کر رہے تھے، اور ہم بہار کے راجہ سے سات من سونا جیت کر لائے۔ لیکن جب سے سلطان ابراہیم کا دور شروع ہوا ہے، اس کے نئے اور ناتجربہ کار پسندیدہ لوگوں نے ہمیں غداروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ اس کے باوجود، میں وہ کام کروں گا جو میرے بس میں ہے (یعنی میں اپنی سلطنت سے غداری نہیں کروں گا)۔"
اپنے اس وعدے کے مطابق میاں معروف راجپوتوں کا ساتھ چھوڑ کر دوبارہ سلطان کی شاہی فوج سے جا ملے۔

جب میواڑ کی فوج قریب آئی تو میاں مکھن نے اپنی فوج کی صف بندی کی۔ اس نے سعید خان اور حاجی خان کو دائیں دستے (میمنہ) پر، اللہ داد خان اور یوسف خان کو بائیں دستے (میسرہ) پر رکھا اور خود فرنٹ لائن (ہراول دستے) کی کمانڈ سنبھالی۔ دوسری طرف میاں حسین، میاں مکھن سے سخت ناراض ہونے کے باوجود خاموش رہے اور انہوں نے شاہی فوج کے خلاف جنگ میں حصہ نہیں لیا۔

میاں معروف کے واپس آ جانے کے باوجود راجپوتوں نے اپنی روایتی اور بے خوف بہادری کے ساتھ ایسا زوردار حملہ کیا کہ کھتولی کی جنگ میں ابرہیم لودھی (پٹھان) فوج کو عبرتناک شکست ہوئی اور شاہی لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے۔

کھتولی کی ۱۵۲۰ میں ہونے والی جنگ دلی کی فوج کے لیے ایک بہت بڑی تباہی ثابت ہوئی۔ اس میدانِ جنگ میں دریا خان سمیت دلی کے پانچ نامور مسلم جرنیل مارے گئے۔ شکست خوردہ میاں مکھن میدان سے بھاگ کھڑا ہوا اور راجپوت فوجوں نے دلی کے باقی بچے کھچے فوجیوں کا 'بیانا' کے علاقے تک پیچھا کیا۔

جب سلطان ابراہیم لودھی نے اس عبرتناک ہار کی خبر سنی تو وہ فوراً ایک نیا لشکر لے کر 'دریائے گمبھیر' کے کنارے پہنچ گیا۔ اس نے فوراً ایک بزرگ شیخ طٰہٰ کو رانا سانگا کے کیمپ میں میاں حسین فرملی کے پاس بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ وہ راجپوتوں کا ساتھ چھوڑ کر دوبارہ شاہی فوج میں شامل ہو جائیں۔

میاں حسین فرملی نے رانا سانگا کو چھوڑنے کے لیے سلطان کے سامنے ایک شرط رکھی: انہوں نے مطالبہ کیا کہ جیل میں سڑنے والے دو بڑے قیدیوں—سعید خان یوسف خیل اور اعظم ہمایوں شیروانی کے بیٹے فتح خان—کو فوراً رہا کیا جائے۔

سلطان نے یہ شرط مان لی اور ان دونوں کو رہا کر دیا۔ وعدے کے مطابق میاں حسین رانا سانگا کا ساتھ چھوڑ کر شاہی فوج سے آ ملے۔ چونکہ راجپوت فوج ابھی اپنی حالیہ جیت کی خوشی منا رہی تھی اور بالکل بے فکر تھی - اس لیے شاہی فوج نے ان پر اچانک دھاوا بول دیا۔ اس اچانک حملے میں میواڑ کی فوج کا بہت بڑا نقصان ہوا اور ان کا قتلِ عام کیا گیا۔ رانا سانگا خود بھی ایک توپ کا گولا لگنے سے شدید زخمی ہوئے اور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ میدانِ جنگ سے بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔

اس بڑی جیت پر سلطان ابراہیم بہت خوش ہوا۔ اس نے میاں حسین کی پرانی غلطیوں کو معاف کر دیا۔ انہیں شاہی خلعت (عزت کا لباس) بھیجا اور انہیں اپنی پسند کے مطابق بہار، سارن، چمپارن، سنبھل یا چندیری میں سے کسی بھی جگہ کی جاگیر لینے کی پیشکش کی۔ میاں حسین نے 'چندیری' کا انتخاب کیا، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہاں وہ اپنے رشتہ داروں کے درمیان زیادہ محفوظ رہیں گے۔

میاں حسین کو چندیری کی جاگیر دینے کے لیے سلطان نے وہاں کے پرانے حاکم احمد خان کو وہاں سے نکال دیا جو مالوہ کے شاہی خاندان کا چشم و چراغ تھا اور وہاں لودھی سلطنت کی پناہ میں (ایک طرح سے قیدی بن کر) رہ رہا تھا۔

مگر یہ امن زیادہ دن قائم نہ رہ سکا۔ چندیری پہنچنے کے کچھ ہی عرصے بعد میاں حسین فرملی نے دوبارہ بغاوت کر دی - کیونکہ انہیں پتہ چلا کہ سلطان نے جیل میں بند بزرگ جرنیل اعظم ہمایوں شیر وانی کو آخر کار قتل کروادیا ہے۔

سلطان ابراہیم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انہوں نے میاں حسین کو راستے سے ہٹانے کے لیے 'شیخ فرید دریابادی' نامی شخص کو تیار کیا، اور انعام کے طور پر ۱۸۰۰ اشرفیاں (سولہ کے سکے) اور دس گاؤں کی جاگیر دینے کا وعدہ کیا۔ شیخ فرید چندیری پہنچا اور وہاں کے مقامی 'شیخ زادوں' (جو کہ ۱۲ ہزار کی تعداد میں ایک مضبوط گروپ تھا) کو بھاری رقم کا لالچ دے کر میاں حسین کے قتل پر راضی کر لیا۔ انہوں نے آدھی رات کو میاں حسین کے گھر کا گھیراؤ کیا اور انہیں قتل کر دیا۔

جب میاں حسین کو اندازہ ہوا کہ وہ گھر چکے ہیں اور بچنے کا کوئی راستہ نہیں تو انہوں نے مرنے سے پہلے اپنے نائب کے ذریعے سلطان کو ایک آخری اور دردناک پیغام بھیجا جس میں سلطان کی بے وفائی پر اسے بددعا دیتے ہوئے کہا: "میں نے کبھی تمہارا برا نہیں چاہا تھا۔ لیکن تمہارے دل میں میرے لیے نفرت تھی۔ اب بہت جلد ہم دونوں ہی مر جائیں گے اور اللہ ہی ہمارے درمیان انصاف کرے گا"۔

اس قتل کی خبر سن کر ایک اور بڑے جرنیل میاں معروف سمجھ گئے کہ اگلی باری ان کی ہے۔ وہ کسی طرح اپنی جان بچا کر بھاگ نکلے اور بہار میں دریا خان نوہانی کے باغی گروپ میں شامل ہو گئے۔

راناسانگا پر سلطان کی یہ فتح عارضی ثابت ہوئی۔ میاں حسین فرملی کے قتل کے کچھ ہی عرصے بعد راناسانگا نے ایک بار پھر زبردست حملہ کیا اور مالوہ کی سلطنت کے زوال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چندیری سمیت مالوہ کے کئی دوسرے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ جس کے بعد راجپوتوں کی سرحدیں دلی کے اور بھی قریب پہنچ گئیں۔ انہوں نے تمام شیخ زادوں کو قتل کرنے کا حکم دیا اور چندیری کا علاقہ مینی رائے کے حوالے کر دیا۔

میاں بھواں، اعظم ہمایوں شیر وانی اور حسین فرملی کے بے رحمانہ قتل نے بادشاہ (ابراہیم لودھی) اور صوبوں کے امیروں اور افسروں کے درمیان ایک ایسی خلیج (فاصلہ) پیدا کر دی جسے مٹانا ناممکن تھا۔

۱۵۲۱-۱۵۲۲ کے دوران دریا خان نوحانی کی وفات کے بعد ان کے بیٹے بہار خان نے بہار کی گورنری سنبھالی اور بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ بہار خان نے بہار کی سرحد پر ایک لاکھ گھڑسواروں کا لشکر جمع کیا۔ بادشاہ کے مخالف تمام امیر اور سردار اس کے ساتھ مل گئے اور انہوں نے سنبھل تک کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ بہار خان نے "سلطان محمد" کا لقب اختیار کیا، اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا، بہار اور اس کے گرد ونواح میں اپنے نام کے سکے جاری کیے اور کئی بار شاہی فوج کو شکست دی۔ دوسری طرف قنوج اور دریائے گنگا کے پار کے دیگر علاقوں نے بھی پٹھان (افغان) سرداروں—جیسے ناصر خان نوہانی، معروف فرملی اور دیگر کئی امیروں کی قیادت میں بغاوت کر دی (جیسا کہ بابر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے)۔ ناصر خان نوحانی کو شکست دینے کے بعد جو بھاگ کر سلطان محمد کے پاس چلا گیا تھا—سلطان ابراہیم لودھی نے سلطان محمد کے خلاف ایک بہت بڑی فوج بھیجی۔ کئی دنوں تک ایک شدید اور خونریز جنگ جاری رہی -لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس کا کوئی حتمی نتیجہ نہ نکل سکا۔ یہ جنگ کسی انجام تک نہ پہنچ سکی کیونکہ سلطنت کے دیگر حصوں سے انتہائی تشویشناک خبریں آنا شروع ہو گئی تھی۔

... پنجاب سے آنے والی تشویشناک خبروں کے سلطنت پر انتہائی برے اثرات مرتب ہوئے اور اس کی تباہی وبربادی کا عمل تقریباً مکمل ہو گیا۔

اس کے فوراً بعد مختلف امیروں اور سرداروں نے الگ الگ علاقوں میں اپنی خود مختار حکومتیں قائم کر لیں اور سلطان کی کھلم کھلا نافرمانی شروع کر دی :

سنبھل میں قاسم خان نے ، بیانہ میں نظام خان نے ، میوات میں حسن خان نے، گوالیار میں تاتار خان سارنگ خان نے، راپڑی میں حسین خان نوحانی، ایٹاوا میں قطب خان نے ، دھولپور میں محمد زیتون نے اور کالپی میں عالم خان نے اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے۔ اگر سلطان کو صرف ان باغیوں سے نمٹنا ہوتا تو وہ اکیلا ہی ان پر قابو پانے کے لیے کافی تھا- لیکن اب سلطنت کی بگڑتی صورتحال کا اصل مرکز مشرق سے مغرب کی طرف منتقل ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے صرف مشرقی صوبے ہی بغاوت کر رہے تھے۔ لیکن ۱۵۱۹

سے پنجاب نے بھی سرکشی اختیار کرلی۔ اس صورتحال نے سلطان ابراہیم لودھی کو دو باغی علاقوں کے بیچ میں لاکر کھڑا کر دیا (جیسے وہ دو پاٹوں کے درمیان پس رہا ہو)، جس کی وجہ سے وہ کسی بھی ایک طرف کی بغاوت کو پوری طرح کچلنے میں ناکام رہا۔ دولت خان لودھی جو ایک طویل عرصے سے پنجاب کا گورنر تھا۔ اس کو سلطان نے شاہی دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ دولت خان نے خود جانے کے بجائے اپنے بیٹے دلاور خان کو دربار بھیج دیا۔ اس پر سلطان نے شدید غصے کا اظہار کیا اور پوچھا کہ اس کا باپ خود کیوں نہیں آیا؟ دلاور خان نے بہانے بناتے ہوئے کہا کہ اس کے والد آرام سے خزانہ لے کر آ رہے ہیں۔ وہ خزانہ جس کا سلطان کو شدید لالچ تھا۔ سلطان نے دلاور خان کو حکم دیا کہ وہ اپنے باپ کو خط لکھے (اور اسے جلدی آنے کو کہے)۔ سلطان ابراہیم لودھی نے دلاور خان کو دھمکی دی کہ اگر اس کا باپ جلدی حاضر نہ ہوا تو وہ اسے قید کر دے گا۔ دلاور خان کو خوفزدہ کرنے کے لیے، سلطان نے واقعی اسے کچھ وقت کے لیے جیل میں ڈال دیا۔ وہاں دلاور خان نے دیکھا کہ دیگر امیروں کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا جارہا ہے اور کچھ کو دیواروں کے ساتھ باندھا گیا ہے۔ پھر اسے جیل سے باہر لایا گیا اور سلطان نے اس سے پوچھا کہ کیا اس نے ان امیروں کا انجام دیکھ لیا ہے جو سلطان کی نافرمانی کرتے ہیں؟ سلطان کے غصے سے بچنے کا کوئی اور راستہ نہ پاکر دلاور خان دہلی سے بھاگ نکلا۔ وہ چھ دنوں کے اندر لاہور میں اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا اور اپنی آپ بیتی سنانے کے بعد اسے خبردار کیا کہ وہ اپنی حفاظت کا بندوبست کرے۔ یہ جان کر کہ وہ اکیلا سلطان کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت کمزور ہے – دولت خان نے دو محاذوں پر کام شروع کیا۔ پنجاب میں اس نے اپنے دوسرے بیٹے غازی خان اور پنجاب کے دیگر امیروں اور جاگیرداروں کو اپنے ساتھ ملنے کی دعوت دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سابق سلطان سکندر لودھی کے بیٹے 'عالم خان' کو بھی بلایا – جو اس وقت گجرات کے حکمران مظفر شاہ کے پاس پناہ گزین کے طور پر رہ رہے تھے۔ سلطنت سے باہر: دوسری طرف، دولت خان نے دلاور خان کے ہاتھ کابل میں موجود (مغلیہ سلطنت کے بانی) بابر کو ایک عرضداشت (خط) بھیجی۔ اس خط میں اس نے سلطان کے ظلم و ستم اور امیروں کی ناراضگی کا حال بیان کیا

اور بابر سے درخواست کی کہ وہ آکر انہیں اس ظلم سے نجات دلائے۔ اس دعوت کو مزید پکا کرنے اور روایتی خیر سگالی کے طور پر دولت خان نے بابر کو شہد میں محفوظ کیے ہوئے ہندوستانی آم اور روایتی ہندوستانی انداز میں تیار کردہ 'پان' بطور تحفہ بھیجے۔ بابر کے ساتھ سلطان ابراہیم لودھی کی لڑائی سے ٹھیک پہلے ۱۵۲۵ میں سلطان کے اپنے وزیر افغان سردار اس کی حکمرانی سے اتنے مایوس اور بیزار ہو چکے تھے کہ انہوں نے دراصل اس کی جگہ لینے پر غور کیا۔ انہوں نے گجرات کے شہزادہ بہادر خان کو دہلی کے تخت پر بٹھانے کے بارے میں سوچا- جو اس وقت شمالی ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے۔

سلطان ابراہیم لودھی اور ظہیر الدین محمد بابر

ظہیر الدین محمد بابر ۱۴ فروری ۱۴۸۳ کو بروز جمعہ پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک طاقتور خونی خطہ سے آیا تھا۔ کیونکہ وہ تاریخ کے دو عظیم فاتحین چنگیز خان اور تیمور کی اولاد تھا۔ بابر کے والد عمر شیخ مرزا تھے ۔ جنہوں نے فرغانہ پر حکومت کی جو ایک زرخیز علاقہ ہے۔ یہ اب روسی ترکستان کا حصہ ہے۔ یہ علاقہ اس کا صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ جو کسی زمانے میں بڑی تیموری سلطنت رہی تھی۔ بابر کی والدہ قتال نگار خانم ایک منگول شہزادی اور منگولستان کے عظیم خان یونس خان کی بیٹی تھیں۔

آٹھ جون ۱۴۹۴ کو بابر کے والد کے انتقال (جو غیر معمولی موت تھی) کے بعد بابر نے علاقے کی حکومت سنبھالی۔ اسے سنبھالنا ایک بہت ہی مشکل اور پریشان کن میراث تھا۔ ان کا اصل نام ظہیر الدین محمد تھا۔ مگر اس کے لوگوں (چغتائی ترکوں) کو اس نام کا تلفظ کرنا مشکل معلوم ہوا۔ اس لیے انہوں نے اسے "بابر" کہنے کو ترجیح دی۔

جب اسے فرغانہ کا تخت ملا۔ اس وقت وہ تخت سب سے زیادہ پُر آشوب اور مشکل ترین تختوں میں سے ایک تھا۔ اس وقت بابر کی عمر محض ۱۱ سال اور ۴ ماہ تھی۔ لیکن اس چھوٹی سی عمر میں بھی وہ ایک بہترین شمشیر زن (تلوار باز)، ایک ماہر شکاری، ایک بہادر جنگجو اور ماہر نشانہ باز بن چکا تھا۔

یہاں سے اس کی بدقسمتیوں اور مشکلات کا آغاز ہوا۔ اسے اپنے ہی چچاؤں اور رشتہ داروں کی دشمنی کا سامنا کرنا پڑا۔ جنہوں نے اس کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کا فائدہ اٹھا کر اس کی موروثی سلطنت پر قبضہ کرنا چاہا۔ لیکن بابر کی شجاعت، توانائی اور پختہ عزم نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ ۱۴۹۶ء میں سمرقند کی ریاست میں (جس پر اس کا چچا حکومت کرتا تھا) شدید خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ یہ ایک قدرتی بات تھی کیونکہ جب بھی کوئی بڑی سلطنت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹتی ہے تو وہاں کے چھوٹے شہزادے ایک دوسرے سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ بابر نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھایا اور ۱۴۹۷ء میں سمرقند پر قبضہ کر لیا۔ لیکن جیسے ہی وہ سمرقند کی طرف گیا۔ پیچھے سے احمد تنبل نے اس کے اپنے علاقے فرغانہ پر قبضہ کر لیا۔ اور جب بابر فرغانہ کو بچانے کے لیے نکلا تو اس کے ہاتھ سے سمرقند بھی نکل گیا۔

اس نے ۱۵۰۰ء میں فرغانہ کو دوبارہ حاصل کیا لیکن اگلے ہی سال اسے پھر کھو بیٹھا اور اسے جلاوطنی کی زندگی گزارنی پڑی۔ اس نے فرغانہ اور سمرقند کو دوبارہ حاصل کرنے کی کچھ ناکام کوششیں کیں اور عارضی کامیابی بھی ملی لیکن بالاخر ۱۵۰۳ء میں ازبکوں کے طاقتور سردار 'شیبانی خان' نے اسے اس کے وطن سے مستقل طور پر نکال دیا۔ جب سب کچھ چھن گیا- تو بابر نے اپنے چند وفادار ساتھیوں کے ساتھ انتہائی کسمپرسی کی حالت میں دربدر ٹھوکریں کھائیں۔

پھر ۱۵۰۴ء میں اس نے اپنی زندگی کا سب سے بہادرانہ اور سب سے فائدہ مند کارنامہ انجام دیا اور وہ تھا کابل اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ یہ کامیابی اسے اس کے چچا اور کابل کے حکمران الغ مرزا کی وفات کے بعد وہاں ہونے والی خانہ جنگی کے دوران حاصل ہوئی۔

سلطنتِ کابل پر قبضے نے اسے نہ صرف اپنے دشمنوں کے چنگل سے محفوظ مقام اور دائمی جنگ کے منظر سے دور رکھا بلکہ اپنے وطن کے خلاف کارروائیوں کا ایک اڈہ بھی فراہم کیا جہاں وہ ایک غیر ملکی تھا اور ساتھ ہی ہندوستان کے زرخیز علاقوں کے خلاف بھی۔

ہجری/۱۵۰۴عیسوی ۹۱۰ میں کابل کی فتح کے بعد بابر نے اپنے آپ کو ہندوستان میں تمام تیموری سلطنتوں کا صحیح وارث سمجھنا شروع کیا جو کہ ابھی تک "غیر چھٹکارا" ہے۔ سلطان ابو سعید مرزا (تیمور کے پوتے) کے زمانے سے، تیموری سلطنت کی یکجہتی ختم ہو گئی تھی۔ اور یہ آزاد ریاستوں میں سمٹ کر رہ گئی تھی- جو اب "عالی مرتبت" کی فرمانبردار نہیں رہی۔ اس طرح کابل، زابل، مغربی تیموری ملکیت اور ہندوستانی املاک الگ ہو گئے۔

ہندوستان میں تیموری سلطنتیں جن میں پنجاب اور ملتان شامل تھے۔

کی حدود تک محدود تھی۔ کابل پر بابر کے قبضے کے وقت ان علاقوں پر سید علی خان کی حکومت تھی۔

سید علی خان غازی خان کے بیٹے اور مرزا علی بیگ کے پوتے تھے۔ سید علی خان نے خطبہ جمعہ ان کے نام پڑھ کر سلطان سکندر لودھی کی حاکمیت کا اعتراف کیا تھا۔

ہندوستان میں تیموری املاک کی باقیات کو فتح کرنے کے مقصد سے بابر نے شعبان ۹۱۰ ہجری / جنوری ۱۵۰۵ عیسوی میں بادام-چشمہ اور جگدلک روڈ کے راستے کابل چھوڑ دیا۔ یہ ان کی پہلی ہندوستانی مہم تھی۔ آدینہ پور میں ٹھہرنے کے بعد وہ درہ خیبر کے راستے جمرود آیا۔

ہندوستانی سرحد کی طرف بڑھتے ہی سید علی خان نے بھیرہ (ایک تحصیل انتظامی ذیلی ڈویژن اور شاہ پور ضلع، پنجاب کا قصبہ (۳۲.۲۸° N اور ۷۲.۵۶° E پر واقع ہے دریائے جہلم کے بائیں کنارے پر) چھوڑ دیا اور شور کوٹ میں پناہ لی۔ بگرام سے جہلم پہنچنے کے بعد دریائے سندھ کو عبور کرنے کا خیال عارضی طور پر ترک کر دیا گیا اور اس کے بجائے کوہاٹ کی طرف پیش قدمی کی گئی- جس کی وجہ سے بابر جہلم سے واپس مڑ گیا۔

بابر کی پہلی ہندوستانی مہم

بابر کی ہندوستان میں مہمات کی صحیح تعداد اور ترتیب تاریخی تنازعہ کا موضوع ہے۔ شاذ و نادر ہی دو مورخین ان پر متفق ہیں۔ جزوی طور پر بابر نامہ (بابر کی ذاتی یادداشتوں) کے بچ جانے والے متن میں خلاء کی وجہ سے- اور ایک وجہ یہ ہے کہ قرون وسطی کے مورخین نے اکثر ان چھوٹے حملوں کو چھوڑ دیا تھا- جو بابر نے ۹۳۰ ہجری / ۱۵۲۳ عیسوی مہم سے پہلے کیے تھے-(داؤل خان کی دعوت کے پر)۔ ان کا ذکر صرف ابوالفضل، فرشتہ اور عبدالباقی جیسے مورخین نے کیا ہے۔ ان میں سے بہت سی پہلے کی مہمات مختصر مدت کے حملے اور چھاپے تھے- یعنی کراسنگ کی اصل تعداد یقینی طور پر پانچ سے زیادہ تھی، حالانکہ بابر نے اپنی یادداشتوں میں اتفاق سے ذکر کیا ہے کہ اس کی پانچویں اور آخری مہم وہ تھی جس نے اسے کامیابی کے ساتھ ہندوستان کی حکومت کا تاج پہنایا- اگر نے سامان اور خزانہ اکٹھا کرنے کے لیے علاقے پر چھاپہ مارنے کا فیصلہ کیا۔ بابر نے دریائے سندھ تک ایک کامیاب حملہ کیا- بنوں اور راستے کے خشک میدانوں کو لوٹ لیا۔ ۷ مارچ ۱۵۰۴ کو اس نے گومل پاس سے واپس کابل کی طرف مارچ کیا۔ بابر کے جاتے ہی پنجاب کے گورنر دولت خان لودھی نے قدم رکھا۔ وہ قدرتی طور پر تیمور خاندان کے ایک

شہزادے کے بارے میں فکر مند تھا- جس نے ابھی کابل میں اپنا اقتدار حاصل کیا تھا اور واضح طور پر اس کی نظر ہندوستان پر تھی۔ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے دولت خان نے سید علی خان کی تمام زمینیں لے لیں اور اپنے بیٹے علی خان کے حوالے کر دیں۔

بابر کی دوسری ہندوستانی مہم

بابر کے ہندوستان پر دوسرے حملے کی وجہ ازبک رہنما شیبانی خان کا حملہ تھا۔ جس نے ۱۵۰۷ (۹۱۳ ہجری) میں قندھار شہر کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ بابر نے جنگی کونسل بلائی۔ اس کے مشیروں نے فیصلہ کیا کہ چونکہ ازبک ناقابل یقین حد تک مضبوط ہو رہے تھے اور تیموری سلطنت کی پرانی زمینوں پر قابض ہو رہے تھے - بابر کے لیے یہ ہوشیار تھا کہ وہ اپنے اور اپنے طاقتور دشمن کے درمیان زیادہ فاصلہ بنائے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اسے اپنی سلطنت کو بدخشاں کی طرف یا ہندوستان کی طرف بڑھانا چاہیے۔ بابر نے ہندوستان کو ترجیح دی - اس لیے اس نے ستمبر ۱۵۱۷ (جمادی اول، ۹۲۳ ہجری) میں کابل کو خرد کابل درہ کے راستے ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔ جب بابر قاروق سائی پہنچا تو مقامی قبائل (بشمول خضر خیل اور شمو خیل) نے ایک افواہ سنی کہ وہ کابل سے فرار ہو رہا ہے کیونکہ وہ ازبک حملے کو سنبھال نہیں سکتا تھا۔ اس گپ شپ سے حوصلہ پا کر قبائل نے اس پر حملہ کر دیا۔

قبائلی حملے اور تیسری مہم

بالآخر بابر نے قبائلی حملہ آوروں کا شکار کیا - انہیں مکمل طور پر شکست دی اور بھاری جانی نقصان کے ساتھ انہیں تتر بتر کر دیا۔ وہ آدنا پور (کابل سے چھ دن کا مارچ) پر رکا اور دریائے بیریم کو عبور کرنے کے بعد قبائلیوں کو لوٹ لیا۔ مگر بابر کو اپنا سفر مختصر کرنا پڑا اور بڈ پیچ روڈ کے راستے کابل واپس جانا پڑا - کیونکہ اسے گھر واپسی پر اپنے ہی افسروں کے درمیان دھمکی آمیز حملے اور سازش کی خبر ملی۔ اپنے سفر کو نشان زد کرنے کے لیے اس نے بڈ پیچ کے اوپر ایک چٹان میں کندہ کرنے کے لیے درہ کو عبور کرنے کا حکم دیا۔ بڈ پیچ

میں یہ وہ لمحہ تھا جب بابر نے تیمور اور اس کی اولاد کے ذریعہ استعمال ہونے والے امیر کے کم لقب کو چھوڑ کر پادشاہ (شہنشاہ) کا شاہی لقب اختیار کیا۔

بابر کی تیسری ہندوستانی مہم

(۹۲۵ ہجری) بابر نے ۱۵۱۹ تیسری بار ہندوستان میں اپنی فوج کی قیادت کی۔اس بار بھیرہ، خوشاب اور چنیوٹ کے علاقوں پر باضابطہ طور پر قبضہ کرنے کا عزم کیا۔اپنی ذاتی یادداشتوں میں بابر لکھتا ہے ____ "چونکہ میرے دل میں ہمیشہ سے ہندوستان پر قبضہ کرنا تھا اور چونکہ یہ سرزمین بھیرہ، خوشاب، چناب اور چنیوٹ پر کبھی ترکوں کی حکومت رہی تھی-اس لیے میں نے انھیں اپنا ہی سمجھا۔میں نے ان کو لینے کا تہیہ کرر کھا تھا چاہے پر امن معاہدے سے ہو یا طاقت کے ذریعے"۔

اس تیسری مہم کا وقت بالکل درست تھا۔ جس وقت دہلی میں سلطان ابراہیم لودھی اپنے سرداروں کے ساتھ سختی سے پیش آرہا تھا- جس سے بڑے پیمانے پر غصہ اور بغاوت پھیل گئی تھی۔ چونکہ لودھی سلطنت اندرونی طور پر بہت منقسم ہو چکی تھی -اس لیے وہ بیرونی حملہ آور کو اپنے دور دراز سرحدی علاقوں پر قبضہ کرنے سے روکنے میں مکمل طور پر ناکام تھی۔ ۴ جنوری ۱۵۱۹ (یکم محرم ۹۲۵ھ) کو بابر نے اپنی افواج کا رخ ہندوستان کی طرف موڑ دیا۔

بابر نے کامیابی کے ساتھ ابراہیم لودھی کی غیر مقبولیت سے فائدہ اٹھایا -یعنی کوئی بھی افغان سردار سرحد کے بیرونی کناروں کی حفاظت کے لیے نہیں آمادہ تھا۔

باجوڑ کی فتح اور دریائے سندھ کی طرف پیش قدم

سات جنوری کو بابر نے بارود اور توپ خانے کا استعمال کرتے ہوئے باجوڑ (باجوڑ وادی کا مرکزی شہر ہے۔ جو موجودہ پاکستان اور افغانستان کے سرحدی علاقے (سابقہ سرحد) میں واقع ہے) کے اہم شہر پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ وہاں عام قتلِ عام کا حکم دیا گیا اور بابر کے اپنے اندازے کے مطابق تقریباً ۳,۰۰۰ لوگ مارے گئے۔ بابر نے اس سخت کارروائی کی وجہ یہ بتائی کہ باجوڑ کے لوگ باغی اور اسلام کے

دشمن تھے اور وہاں غیر اسلامی اور دشمنانہ رسومات رائج تھیں یہاں تک کہ اس قبیلے سے اسلام کا نام و نشان مٹ گیا۔ اس کے بعد بابر نے وادی سوات کے علاقے پنجکور (کمراٹ) میں یوسفزئی قبیلے کی ایک خاتون سے شادی کی۔ یہ خاتون ملک سلیمان شاہ کی بیٹی اور یوسفزئی قبیلے کے ممتاز رہنما اور سفیر ملک شاہ منصور کی پوتی تھیں۔

پھر بابر قرامطہ (قرامطہ نویں صدی عیسوی میں اسلام سے الگ ہونے والا ایک اسماعیلی شیعہ فرقہ تھا جو روایتی نماز اور روزوں کے پابند نہیں تھے اور صوفیانہ اعداد (۷ اور ۱۲) کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کے نظریات میں آواگون (روح کا ایک جسم سے دوسرے جسم میں جانا) شامل تھا- جس کی وجہ سے انہیں ہندوؤں اور بدھ مت کے ماننے والوں میں اپنے ہم نوا تلاش کرنے میں آسانی ہوئی۔ مختلف ہندوستانی حکمرانوں کی سخت کارروائیوں کے باوجود یہ فرقہ اس علاقے میں طویل عرصے تک موجود رہا) اور انبار کے دروں سے ہوتا ہوا جہلم کے کنارے واقع شہر بھیرہ کی طرف بڑھا اور اس نے پہلی مرتبہ دریائے سندھ کو عبور کیا۔

مقامی رہنماؤں کی اطاعت اور سلطان کو پیغام

جب بابر بھیرہ کے قریب پہنچا تو دولت خان لودھی کے زیر اثر کام کرنے والے کئی افسران بشمول علی خان لودھی اور ایک ہندو افسر سکتو (ولد دیوا) نے بابر کی اطاعت قبول کرلی۔

بھیرہ اور خوشاب پر پرامن قبضے کے بعد بابر نے مُلا مُرشِد نامی ایک سفیر کو دہلی کے سلطان ابراہیم لودھی اور لاہور کے گورنر دولت خان لودھی کے پاس بھیجا۔ بابر نے ان سے ان ہندوستانی علاقوں کی واپسی کا مطالبہ کیا جو ماضی میں اس کے اجداد (تیموریوں) کے پاس رہے تھے۔

مگر اس سفارتی وفد کو لاہور میں تقریباً پانچ ماہ تک انتظار کروایا گیا۔ دولت خان لودھی نے نہ تو خود سفیر سے ملاقات کی اور نہ ہی اسے سلطان ابراہیم لودھی کے پاس جانے دیا۔

بابر نے نئے فتح شدہ علاقوں کا انتظام اپنے افسران کے سپرد کر دیا

ہندو بیگ کو بھیرہ کا انچارج بنایا گیا۔

حسین خان اور لنگر خان کو چناب اور خوشاب کے علاقوں کی ذمہ داری دی گئی۔

تیرہ مارچ ۱۵۱۹ء کو بابر اچانک بھیرہ سے کابل کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کی ممکنہ وجہ یہ تھی کہ شاہ بیگ ارغون نے بابر کے اپنے علاقوں پر حملہ کر دیا تھا اور قندھار کا محاصرہ کرر کھا تھا۔ کابل واپسی کے راستے میں بابر نے ہاتھی خان کھوکھر پر حملہ کیا جو دریائے سندھ اور بھیرہ کے درمیانی علاقے پر قابض تھا اور جس نے اپنے ہی بھائی کو قتل کر دیا تھا۔

ہاتھی خان کھوکھر نے اس سے پہلے اپنے بھائی تاتار خان کھوکھر کو لودھی سلطنت کا وفادار ہونے کی وجہ سے قتل کر دیا تھا اور اس کی بیوہ پر بھی زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن جب بابر نے ہاتھی خان کے مرکزی قلعے "پرہالہ" پر زوردار حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ تو ہاتھی خان نے ہتھیار ڈال دیے اور بابر کی اطاعت قبول کر لی۔ جیسے ہی بابر اس علاقے سے کابل واپس گیا- مقامی افغانوں نے بغاوت کر دی۔ ۲۶ اپریل ۱۵۱۹ء کو انہوں نے ہندو بیگ (جسے بابر بھیرہ کا انچارج بنا کر گیا تھا) پر حملہ کر کے اسے بھیرہ سے نکال دیا اور مقامی عوام بھی افغانوں کے ساتھ مل گئے۔ شکست خوردہ ہندو بیگ نے کابل کی طرف فرار اختیار کیا تاکہ بابر کو اپنی یہ دردناک کہانی سنا سکے۔ بابر کو دعوت اور چوتھا حملۂ ہند بابر کے ہندوستان پر چوتھے حملے کا سبب دولت خان لودھی کی وہ درخواستیں بنیں جو اس کے بیٹے دلاور خان اور عالم خان (سلطان سکندر لودھی کے بیٹے) کے ذریعے بابر تک پہنچائی گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے بڑے امیروں (امراء) نے عالم خان کو گجرات سے بلایا تھا۔ جہاں وہ گجرات کے حکمران مظفر شاہ کے وظیفہ خوار کے طور پر پناہ گزین تھا۔ اس وفد نے دولت خان کی طرف سے بابر کی خدمت میں آموں اور پان کے پتوں کا تحفہ پیش کیا۔ مؤرخ احمد یادگار کے مطابق بابر نے ملاقات کے دوران دلاور خان سے سوال کیا کہ اس کے باپ (دولت خان) نے اتنی بدسلوکی اور ناانصافی کیوں کی، جبکہ ان کا ماضی کچھ اور تھا۔ تاریخی روایات میں تھوڑا فرق ہے۔ مؤرخ نظام الدین کے مطابق عالم خان کو دولت خان اور غازی خان کے ساتھ کابل

بھیجا گیا تھا۔ جبکہ مؤرخ احمد یادگار کا کہنا ہے کہ دلاور خان نے اس وفد کی قیادت کی تھی۔ بابر کی اپنی آپ بیتی (بابر نامہ) سے بھی یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ سب ایک ہی وفد میں گئے تھے یا الگ الگ وفود کی شکل میں۔ عالم خان گجرات کے دربار میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ کیونکہ وہ شاید اپنے بھائی سلطان سکندر لودھی کا تختہ الٹنے کی سازش میں شریک تھا۔ گجرات کے حکمران مظفر شاہ نے ۹۳۰ ہجری (تقریباً ۱۵۲۳/ ۱۵۲۴ء) میں اسے "سلطان علاؤدین" کا لقب دے کر دہلی کا تخت حاصل کرنے کے لیے اپنی قسمت آزمائی کرنے کی غرض سے روانہ کیا تھا۔ بابر نے دلاور خان سے سوال کیا کہ

"ان کا خاندان پچھلے ۴۰ سال سے لودھی خاندان کا نمک کھا رہا تھا- تو پھر ان کے والد نے یہ غداری کیوں کی؟"

دلاور خان نے جواب دیا کہ:

"سلطان ابراہیم لودھی نے امراء کے ساتھ انتہائی برا سلوک کیا اور سلطنت کی بنیاد اور ستون سمجھے جانے والے ۲۳ بے قصور امراء کو بلاوجہ قتل کر دیا۔ جب بچاؤ کی کوئی اور راہ نہ رہی تو تمام امیروں نے متفق ہو کر مجھے آپ کی اس عظیم بارگاہ میں بھیجا۔"

اس گفتگو کے بعد بابر نے عالم خان کے ہمراہ ایک پیشگی لشکر روانہ کیا- جس نے سیالکوٹ (پنجاب کا ایک ضلعی ہیڈکواٹر) پر قبضہ کر لیا۔ اس کامیابی سے حوصلہ پا کر بابر خود پنجاب کی طرف روانہ ہوا۔ بابر کے ابھی ہندوستانی سرزمین پر پہنچنے سے پہلے ہی سلطان ابراہیم لودھی نے دولت خان اور غازی خان کو ان کی غداری کی سزا دینے کے لیے بہار خان کی قیادت میں ایک فوج بھیج دی تھی۔ خوفزدہ ہو کر دولت خان نے "بلوٹ" کے قلعے میں بلوچوں کے پاس پناہ لی۔ اسی دوران بابر نے دریائے سندھ کو عبور کیا- کھوکھروں کے علاقے سے گزرا اور پنجاب کی طرف بڑھتے ہوئے ۱۵۲۳ء (۹۳۰ ہجری) میں لاہور پر قبضہ کر لیا۔ وہاں اس نے سلطان کے جرنیلوں بہار خان، مبارک خان لودھی اور بھیکن خان لوہانی کو شکست دی اور فتح کے بعد لاہور کے مرکزی بازار کو آگ لگا دی۔ لاہور میں چار دن قیام کرنے کے بعد بابر جنوب کی طرف

بڑھا اور دیپالپور پر قبضہ کر لیا۔ اس کا اگلا ہدف سرہند تھا۔ لیکن سرہند پہنچنے سے پہلے ہی اس نے (کابل کی طرف) واپس مڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ مؤرخ نعمت اللہ کے مطابق افغان سردار دولت خان لودھی جسے سلطان ابراہیم نے بھاگنے پر مجبور کیا تھا اور وہ بلوٹ کے قلعے میں چھپا ہوا تھا - اسکو میر خلیفہ (بابر کے وزیر) نے بابر کے سامنے پیش کیا۔ یہ ملاقات اس وقت ہوئی - جب بابر پشاور سے مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لاہور کی فتح کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابر نے دولت خان کو دوبارہ وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ اس تقرری اور اعزاز کے بدلے دولت خان نے بابر کو ایک ہزار اشرفیاں (سونے کے سکے) اور ۲۰ ہاتھی تحفے میں پیش کیے۔ مگر جاہ طلب دولت خان کے اپنے خفیہ ارادے تھے۔ اس نے بابر کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی فوج کا ایک حصہ اسماعیل جلوانی کے خلاف لڑنے کے لیے بھیجے - جسے بابر نے فوراً قبول کر لیا۔ لیکن دولت خان کے اپنے بیٹے، دلاور خان نے بابر کو خبردار کر دیا کہ اس کے والد کا اصل مقصد مغل فوج کو تقسیم کر کے کمزور کرنا ہے۔ جب بابر کو اس چال کا پتہ چلا - تو اس نے دولت خان اور اس کے دوسرے بیٹے غازی خان کو قید کر دیا۔ مگر بعد میں دولت خان کو معاف کر دیا گیا۔ لیکن لاہور کی گورنری واپس لے کر اسے لاہور کے بجائے جالندھر اور سلطان پور کی چھوٹی جاگیریں دے دی گئیں - جس سے وہ مطمئن نہیں تھا۔ چنانچہ جیسے ہی بابر کچھ فاصلے پر گیا - دولت خان اپنی جاگیر چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا - بظاہر اس مقصد کے لیے کہ وہ وہاں سے نئی فوج اکٹھی کر سکے۔ بابر دولت خان کی اس بدنیتی کی وجہ سے اپنے پیچھے خطرہ چھوڑنے سے ڈرتا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر اسے یہ اطلاع ملی تھی کہ ازبکوں نے اس کے اپنے علاقوں پر حملہ کر دیا ہے - اس لیے وہ واپس کابل چلا گیا۔ جیسے ہی بابر نے پیٹھ موڑی - دولت خان پہاڑوں سے نیچے اتر آیا اور اس نے درج ذیل کارروائیاں کیں اس نے اپنے بیٹے دلاور خان کو گرفتار کر لیا - کیونکہ دلاور نے بابر کا ساتھ دیا تھا اور اس کے ان خفیہ ارادوں کو فاش کر دیا تھا - جنہیں دولت خان نے بظاہر خوش اخلاقی کے پردے میں چھپا رکھا تھا۔ دولت خان کے افسروں نے سلطان پور پر قبضہ کر لیا - دیپالپور کے مقام پر 'عالم خان کو شکست دی اور سیالکوٹ پر بھی قبضہ کر لیا۔ تاہم لاہور پر حملہ کرنے کی ان کی

کوشش ناکام ہو گئی کیونکہ بابر کی فوج نے انہیں روک دیا۔ دوسری طرف سلطان ابراہیم لودھی نے اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے ایک فوج بھیجی۔ لیکن دولت خان نے ان افسروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ حالات دیکھ کر عالم خان سیدھے کابل پہنچے۔ بابر کو وہاں کے حالات سے واقف کرایا اور ان سے مدد مانگی۔ بابر نے اس شرط پر مدد کرنے کا وعدہ کیا کہ 'عالم خان کو دہلی اور آگرہ کا تخت ملے گا۔ جبکہ مغربی علاقوں پر بابر کا قبضہ رہے گا۔

(نومبر ۱۵۲۵)

بابر کی روزنامچہ (ڈائری) تقریباً چھ سال کے وقفے کے بعد ۱۷ نومبر ۱۵۲۵ سے دوبارہ شروع ہوتی ہے۔ جس میں بابر کی ہندوستان پر پانچویں مہم کا پورا حال ملتا ہے۔ جب بابر نے بلخ میں ازبکوں کے مسئلے کو اچھی طرح قابو میں کر لیا تو وہ ۱۷ نومبر ۱۵۲۵ (یکم صفر ۹۳۲ ہجری) کو ہندوستان کے لیے روانہ ہوا تاکہ دولت خان کو اس کی غداری کی سزا دے سکے۔ وہ ۲۴ نومبر کو گندمک پہنچا۔ اپنے سفر کے اگلے پڑاؤ یعنی باغِ وفا میں شہزادہ ہمایوں (کابل سے) اور خواجہ کلاں (غزنی سے) اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ اس کے ساتھ آ ملے۔

تاریخی وضاحتی نوٹ (حواشی کا خلاصہ)

نوٹ ۱: فارسی کے بہت سے تاریخی ذرائع اس مہم کا ایک الگ احوال بتاتے ہیں۔ ان کے مطابق، دولت خان لودھی نے دلاور خان اور 'عالم خان کے ذریعے بابر کو دعوت دی تھی اور تحفے کے طور پر ہندوستانی آم اور پان بھیجے تھے۔ جب دلاور خان ابھی کابل ہی میں تھا تو بابر نے 'عالم خان کے ساتھ ایک نگران دستہ بھیجا جس نے سیالکوٹ اور اس کے آس پاس کے علاقے فتح کر لیے۔ یہ واقعہ ۱۵۲۳ کا ہے۔ جب بابر کو اس فتح کی خبر ملی تو وہ بہت خوش ہوا اور اس سے حوصلہ پا کر وہ ۱۷ نومبر ۱۵۲۵ کو ہندوستان کے لیے روانہ ہوا۔ یہ فارسی تاریخیں اس مہم کا ذکر نہیں کرتیں جو بابر نے خود ۱۵۲۳ میں لاہور تک کی تھی۔ لیکن بابر کے وہاں موجود افسران نے اس کے اس حملے کو ناکام بنا دیا۔ ۞

دسمبر ۱۵۲۵ کو بابر خیبر پاس میں واقع علی مسجد (درہ خیبر (خیبر پاس) میں واقع ایک گاؤں اور قلعہ ہے) کے راستے پشاور پہنچا۔ دریائے کابل کے کنارے اسے خبر ملی کہ دولت خان اور غازی خان نے ۲۰ سے ۳۰ ہزار سپاہیوں کی ایک بڑی فوج اکٹھی کر لی ہے اور وہ کلانور (ضلع گورداسپور) پر قبضہ کرنے کے بعد اب لاہور کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

بابر نے فوری طور پر لاہور میں موجود اپنے فوجی افسروں کو ایک ہنگامی پیغام بھیجا کہ جب تک وہ خود وہاں نہ پہنچ جائے-دشمن سے کوئی جنگ نہ لڑی جائے۔

۱۶ دسمبر ۱۵۲۵ کو بابر نے دریائے سندھ کو عبور کیا اور کھوکھر کے علاقے سے گزرتے ہوئے دریائے جہلم کو بھی پار کر لیا۔ راستے میں اس نے ہر زبان سے یہی سنا کہ غازی خان نے ۳۰ سے ۴۰ ہزار فوجی جمع کر لیے ہیں اور دولت خان نے (جنگ کے جنون میں) اپنی کمر پر دو تلواریں سجا رکھی ہیں۔

بابر نے اپنے جرنیلوں کو دریائے چناب کے کنارے ملنے کا حکم دیا اور خود "بہلول پور" پہنچا (یہ شاہی زمین تھی جو ستلج کے جنوب میں سرہند نہر کے پاس واقع تھی)۔ چونکہ سیالکوٹ کے لوگ تالاب کا گندا پانی پینے کی وجہ سے بیماریوں کا شکار ہو رہے تھے اور وہاں کی آب و ہوا خراب ہو چکی تھی-اس لیے بابر نے حکم دیا کہ بہلول پور (: یہ گاؤں سلطان بہلول لودھی نے آباد کیا تھا جو پنجاب کے ضلع لدھیانہ میں ہے) میں ایک نیا قلعہ بنایا جائے-سیالکوٹ کو مسمار کر دیا جائے اور وہاں کے تمام شہریوں کو بہلول پور منتقل کر دیا جائے۔ جب بابر سیالکوٹ پہنچا تو ایک تاجر کے ذریعے اسے یہ خبر ملی کہ 'عالم خان کو سلطان ابراہیم لودھی کے ہاتھوں عبرت ناک شکست ہو چکی ہے۔

اس سے پہلے ۱۵۲۵ میں 'عالم خان نے کابل میں بابر سے رخصت لی تھی کیونکہ بابر اس وقت بلخ میں ازبکوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا اور خود ہندوستان نہیں آسکتا تھا۔

لاہور پہنچنے کے بعد 'عالم خان نے وہاں موجود بابر کے افسروں سے رابطہ کیا اور ان سے کہا کہ وہ غازی خان کے ساتھ مل کر دہلی اور آگرہ پر چڑھائی کرنے میں اس کی مدد کریں۔ لیکن بابر کے افسروں نے صاف

انکار کر دیا۔ وہ غازی خان پر بھروسہ نہیں کرتے تھے - کیونکہ وہ اب بھی بابر کے خلاف جنگی پوزیشن میں تھااور افسر چاہتے تھے کہ غازی خان پہلے اپنی وفاداری کا کوئی ثبوت دے۔

'عالم خان نے بابر سے اپنا معاہدہ توڑ دیا اور اپنے بیٹے شیر خان کو دولت خان اور غازی خان کے پاس بھیجا تاکہ وہ سب مل کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنائیں۔ 'عالم خان ان کے ساتھ مل گیا اور اچانک ایک وطن پرست بن گیا۔

اس وقت 'عالم خان کا مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ ملک کو غیر ملکیوں (بابر) اور ایک ظالم حکمران (ابراہیم لودھی) دونوں سے آزاد کرایا جائے - ساتھ ساتھ ہی دہلی کا تاج اپنے سر پر سجایا جائے۔ وہ مغلوں کی مدد سے تخت حاصل کرنا پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ اس طرح مغلوں کو ملک میں قدم جمانے کا موقع مل جاتا۔ یہ بات بہت مشکوک ہے کہ اگر 'عالم خان دہلی کا تخت جیت جاتا تو وہ لاہور کو بابر کے حوالے کرنے کا اپنا وعدہ پورا کرتا۔

جغرافیائی اور تاریخی نوٹ (حواشی کا خلاصہ)

(مصنف لکھتا ہے کہ یہ بات کافی عجیب ہے کہ سیالکوٹ کے لوگ تالاب کا گندا پانی پیتے تھے - جبکہ یہ شہر ندی کے کنارے آباد تھا جس میں سارا سال پانی رہتا تھا۔ نوٹ ۳: مورخ نظام الدین نے غلطی سے شیر خان کو دولت خان کا بیٹا لکھا ہے، جبکہ وہ اصل میں 'عالم خان کا بیٹا تھا۔)

ابراہیم لودھی کے مخالف دیگر افغان امراء کو (بابر جیسے) ایک غیر ملکی شہزادے کو دعوت دینے کے بعد اپنی غلطی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے مغربی افغانوں نے اپنے تمام تر اختلافات کو پسِ پشت ڈال دیا اور ایک سنجیدہ معاہدہ کیا - جس کی رو سے دولت خان پنجاب میں بابر کے امراء کو اپنے ساتھ ملا کر دہلی کے مغرب میں واقع تمام علاقوں پر قبضہ کرے گا۔

عالم خان، دلاور خان اور حاجی خان کی مدد سے دہلی اور آگرہ کے اپنے آبائی تخت پر قبضہ کرے گا۔ یہیں سے ہندوستان کے تخت کے لیے ایک سہ رخی (تین طرفہ) جنگ کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن دولت خان اور

عالم خان نے ایک ایسا کام شروع کر دیا تھا- جو ان کی طاقت اور وسائل سے باہر تھا- - یعنی وہ سلطان ابراہیم لودھی اور غیر ملکیوں (بابر) دونوں سے ایک ہی وقت میں لڑ رہے تھے۔ اگر وہ اپنی فوجوں کو تقسیم کرنے کے بجائے متحد ہو کر یا تو بابر کا مقابلہ کرتے یا پھر ابراہیم لودھی کا- تو ان کی کامیابی کے امکانات بہت زیادہ ہوتے۔

دہلی کی طرف مارچ کے دوران عالم خان کی طاقت میں مزید اضافہ ہوا کیونکہ ان کے ساتھ درج ذیل لوگ بھی شامل ہو گئے:

اسماعیل خان جلوانی (جو سلطان ابراہیم کی فوج سے منحرف ہو کر آیا تھا)۔

شیخ زادہ سلیمان فرملی (موجودہ ضلع کرنال کے علاقے 'اندری' کا گورنر)۔

عالم خان نے اپنا شاہی لقب "سلطان عالم خان علاؤ الدین" اختیار کیا۔ اس متحدہ فوج کی تعداد تقریباً ۳۰ سے ۴۰ ہزار جنگجوؤں تک پہنچ چکی تھی، اور وہ دہلی کا محاصرہ کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ تاہم، سلطان ابراہیم (کی آمد) کی اطلاع ملتے ہی انہوں نے محاصرے کا یہ ارادہ ترک کر دیا۔

سلطان ابراہیم لودھی آگرہ سے آ رہے تھے جب عالم خان نے دہلی سے تقریباً ۱۲ میل دور ایک مقام پر جنگ کے لیے صف بندی کی۔ کچھ دنوں تک چھوٹی موٹی جھڑپوں کے بعد عالم خان نے رات کے وقت اچانک حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سلطان کی فوج میں شامل افغان سپاہی آسانی سے دغاباز بن کر ان کے ساتھ مل سکیں- کیونکہ وہ دن کی روشنی میں ایسا کرنے سے کتراتے تھے۔

مگر اس منصوبے کا نتیجہ عالم خان کے لیے فائدے کے بجائے انتہائی تباہ کن رہا۔ ابھی رات کا حملہ جاری ہی تھا کہ عالم خان کو ان کے بڑے بیٹے جلال خان، دریا خان نوحانی اور شیخ جمال فرملی نے تنہا چھوڑ دیا۔ دوسری طرف کچھ افغان رہنما ابراہیم لودھی کا ساتھ چھوڑ کر عالم خان سے جا ملے۔ اس کی وجہ سے سلطان کی فوج میں شدید افراتفری مچ گئی اور وہ تتر بتر ہو گئی۔

اس افواہ اور افراتفری کے باوجود ابراہیم لودھی انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ صبح ہونے تک ۵ سے ۶ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ صبح ہوتے ہی ابراہیم لودھی نے دیکھا کہ عالم خان کی فوج ایک آسان جیت کا جشن مناتے ہوئے لوٹ مار میں مصروف ہے اور ہر طرف بکھر چکی ہے، جب کہ عالم خان کے پاس صرف ۳۰۰ کے قریب سپاہی باقی بچے ہیں۔ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ابراہیم لودھی خود ایک ہاتھی پر سوار ہوئے اور دشمن کے مرکز پر بھرپور حملہ کر دیا۔ عالم خان کو عبرتناک شکست ہوئی، ان کے زیادہ تر سپاہی مارے گئے اور باقی بچ جانے والے "ٹوٹتے تاروں" کی طرح بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ عالم خان پہلے دوآبہ اور پھر بالآخر دون کی پہاڑیوں میں واقع گنگوٹہ کے قلعے کی طرف فرار ہو گئے۔

ہندوستان کے یہ بگڑتے ہوئے حالات مغل حملہ آور بابر کے حق میں جا رہے تھے۔ بابر جو پہلے ہی پنجاب آ چکا تھا- سیالکوٹ سے پسرور، وہاں سے کلانور اور پھر مالوٹ پہنچا۔ اس نے مالوٹ کے قلعے کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا کیونکہ اسے اطلاع ملی تھی کہ غازی خان اس قلعے میں موجود ہے۔

دولت خان لودھی نے اپنے پوتے اسماعیل خان کے ذریعے بابر کو ایک پیغام بھیجا۔ اس نے بابر کو غازی خان کے فرار ہونے کی خبر دی اور یہ پیشکش کی کہ اگر انہیں معافی کا یقین دلایا جائے تو وہ قلعہ بابر کے حوالے کرنے اور اس کے ساتھ شامل ہونے کے لیے تیار ہیں۔ بابر کی طرف سے امان ملنے پر دولت خان اپنے بیٹے علی خان کے ساتھ قلعے سے باہر آ گیا۔

دولت خان اس حال میں حاضر ہوا کہ اس کی کمر سے دو تلواریں بندھی ہوئی تھیں۔ بابر نے حکم دیا کہ یہ دونوں تلواریں دولت خان کے گلے میں لٹکا دی جائیں اور جب وہ مزید قریب آیا تو انہیں ہٹا دیا گیا اور اسے اپنے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھنے کا حکم دیا گیا جو اس نے شدید ہچکچاہٹ کے ساتھ کیا۔

بابر نے ایک ترجمان کے ذریعے غصے سے اس پر ملامت کرتے ہوئے کہ

"میں نے تمہیں باپ کہا۔ میں نے تمہیں تمہاری توقعات سے بڑھ کر عزت اور احترام دیا۔ میں نے تمہیں اور تمہارے بیٹوں کو بلوچوں کے ہاں در در کی خاک چھاننے سے بچایا۔ تمہارے خاندان اور تمہاری خواتین کو ابراہیم لودھی کے قید خانے سے آزاد کروایا۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ تم کمر کے دونوں طرف تلواریں لٹکا کر ہمارے خلاف فوج لے آئے اور ملک میں فتنہ وفساد برپا کیا؟"

دولت خان یہ سن کر بالکل ہکا بکا اور گونگا بن کر کھڑا رہ گیا اور بس چند بے معنی الفاظ ہی بڑبڑا سکا۔ بعد میں اسے قید کر لیا گیا- معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۲۳ء میں بہار خان کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد دولت خان کے حرم (خواتین) کو قید کر لیا گیا تھا اور کچھ مہینوں بعد جب بابر نے لاہور پر قبضہ کیا تو انہیں رہا کر دیا تھا۔ مالوٹ کا قلعہ اس سے چھین لیا گیا-- اس کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی اور مغل سپاہیوں میں بانٹ دی گئی۔ دولت خان کو خواجہ میر میران کی تحویل میں دینے کا حکم ہوا اور کچھ ہی عرصے بعد جب اسے بھیرا منتقل کیا جا رہا تھا، تو وہ دورانِ قید ہی انتقال کر گیا۔ مالوٹ پر قبضہ کرنے کے بعد، بابر نے غازی خان کے کتب خانے (لائبریری) کا دورہ کیا جو قیمتی کتابوں سے 'مالامال' تھا۔ غازی خان مالوٹ کے محاصرے کے دوران رات کے اندھیرے میں پیدل ہی پہاڑیوں کی طرف فرار ہو گیا تھا۔ مالوٹ کی فتح کے کوئی تین چار دن بعد، دلاور خان بابر کے لشکر میں حاضر ہوا اور اطاعت قبول کر لی۔ بابر نے دون (Doons) کی پہاڑیوں تک غازی خان کا پیچھا کیا اور گنگوٹہ کے مقام پر عالم خان پر حملہ کرنے کے لیے ایک فوجی دستہ روانہ کیا۔ جب عالم خان کو فرار کا کوئی راستہ نظر نہ آیا تو وہ اگلے ہی دن خود اطاعت قبول کرنے کے لیے حاضر ہو گیا جہاں اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ کچھ عرصے بعد اسماعیل جلوانی اور ببّن نے بھی اطاعت اختیار کر لی۔ سلطان ابراہیم لودھی کے خلاف بابر کی پیش قدمی اس کے بعد بابر نے سلطان ابراہیم لودھی کے خلاف کوچ کیا- جس کے بارے میں اسے اطلاع ملی تھی کہ وہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔ جب بابر کابل میں تھا اور ہندوستان پر اپنے پانچویں حملے کی تیاریاں کر رہا تھا تو اسے میواڑ کے رانا سانگا اور حسین خان میواتی کی طرف سے سلطان ابراہیم کے خلاف مدد کی یقین دہانیاں کرائی گئی

تھیں۔ اگرچہ بعد میں ان میں سے کسی نے بھی اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔ بابر نے دیپالپور کی طرف پیش قدمی کی اور اسے اپنے ایک جرنیل کے حوالے کر دیا۔ بابر سرہند کے سامنے روپڑ (روپڑ، ضلع امبالہ (پنجاب) کا ایک تحصیل ہیڈ کوارٹر) کے راستے کرنال کی طرف بڑھا۔ وہاں سلطان ابراہیم لودھی کا ایک سفیر پہنچا، لیکن چونکہ اس کے پاس کوئی باضابطہ سفارتی دستاویزات نہیں تھیں۔ اس لیے بابر نے بات چیت کے لیے ایک یا دو سوادی محافظوں[1] کو بھیجا۔ سلطان ابراہیم لودھی نے انہیں قید کر لیا۔ بابر گھگر ندی (گھگر ایک برساتی ندی (ندی کا نالہ) ہے جو ہمالیہ کے زیریں دامن سے نکلتی ہے اور ضلع امبالہ، ریاست پٹیالہ اور ضلع حصار سے گزرتی ہوئی ہنومان گڑھ کے قریب صحرائے بیکانیر میں گم ہو جاتی ہے) کے کنارے تک پہنچا۔ اسے دہلی سے سلطان ابراہیم لودھی کی پیش قدمی اور حصار فیروزہ سے لودھی رسالہ (گھڑ سوار فوج) کے سربراہ اور وہاں کے گورنر حامد خان کی روانگی کی اطلاع ملی۔ بابر امبالہ آیا۔ جہاں خواجہ ببّن اپنی فوج کے ساتھ اس سے آن ملا۔ بابر نے شہزادے ہمایوں کو خواجہ کلاں، عطا محمد دلدی اور خزانچی ولی کے ہمراہ حامد خان کے خلاف روانہ کیا۔ ۲۶ فروری ۱۵۲۶ء کو، ہمایوں نے حصار فیروزہ کے قریب ایک خونریز معرکے میں حامد خان (حامد خان حصار فیروزہ کا گورنر تھا۔ بارسی دروازے (حصار فیروزہ) کی اندرونی شمالی دیوار پر اس کے نام کے کتبے تحریر ہیں) پر حملہ کر کے اسے شکست دی تھی۔ جس میں بڑی تعداد میں افغان مارے گئے۔ فرار ہونے والے افغانوں کا پیچھا کیا گیا - یہاں تک کہ حصار فیروزہ کو فتح کر لیا گیا اور اسے شہزادہ ہمایوں کی جاگیر (Appanage) کے طور پر مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد بابر شاہ آباد آیا اور پھر وہاں سے بابر دریائے جمنا پار کرنے کے بعد سرساوا پہنچا۔ وہاں سلطان ابراہیم کے ایک بڑے امیر، داؤد خان لودھی اور ان کے بھائی حاتم خان کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ سلطان کے ہراول دستے کے طور پر ۵ سے ۶ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ دریا پار کر کے دوآبہ (وسطی دوآب) کے علاقے میں آچکے ہیں۔ یہ سن کر بابر نے سید مہدی خواجہ، سلطان مرزا اور جنید برلاس کو داؤد خان کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ پٹھانوں کو ایک بار پھر عبرتناک شکست ہوئی اور ان کا بڑے پیمانے پر قتلِ عام کیا گیا۔ حاتم خان کو ۶۰ یا ۷۰ ساتھیوں کے

ہمراہ زندہ گرفتار کر لیا گیا اور داؤد خان مارا گیا (۱۸ جمادی الثانی ۹۳۲ ہجری مطابق ا اپریل ۱۵۲۶ء)۔ باقی ماندہ فوج تتر بتر ہو گئی اور سلطان ابراہیم سے جا ملی۔ سلطان ابراہیم، جو داؤد خان کو اپنے ہراول دستے کا سربراہ بنا کر آگے بھیجنے کے بعد خود دہلی سے آہستہ آہستہ پیش قدمی کر رہے تھے -اس شکست کی خبر سن کر غصے سے آگ بگولا ہو گئے اور ایک لاکھ گھڑ سواروں اور ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ ہاتھیوں کے ساتھ بابر کے مقابلے کے لیے آگے بڑھے۔ جب سلطان ابراہیم بابر سے لڑنے کے لیے دہلی سے روانہ ہو رہے تھے تو انہوں نے نجومیوں سے مشورہ کیا۔ نجومیوں نے اپنے حساب کتاب سے اندازہ لگا کر انہیں بتایا کہ ہاتھیوں سمیت سلطان ابراہیم کی پوری فوج مغلوں کی طرف جا چکی ہے (یعنی مغلوں کی فتح ہو گی)۔ ابراہیم نے اس کا الٹا مطلب یہ نکالا کہ یہ ان کی ایک فیصلہ کن فتح کی نوید ہے، اور انہوں نے آگے بڑھنے کا حکم دے دیا، جبکہ نجومیوں نے وقت پر وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔ سلطان ابراہیم سے مقابلے کا فیصلہ کرتے ہوئے بابر نے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا اور اپنے سفر کے اگلے مرحلے پر ۵ سے ۶ دن کے لیے قیام کیا تاکہ جنگی ساز و سامان جمع کیا جا سکے۔ اس سامان میں ۷۰۰ گاڑیاں (عرابے) بھی شامل تھیں۔ جو بدایونی کے مطابق صرف ایک دن میں تیار کی گئی تھیں۔ استاد علی قلی کو حکم دیا گیا کہ وہ ان گاڑیوں کو کچے چمڑے کی زنجیروں سے آپس میں باندھ دیں - جنہیں سانپوں کی طرح بل دے کر مضبوط کیا گیا تھا۔ جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو بابر نے ایک جنگی کونسل (مشاورتی اجلاس) بلایا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مغل فوج پانی پت کے قصبے تک آگے بڑھ کر اپنی پوزیشن سنبھالے، جہاں مغل فوج کا دایاں بازو قصبے کے مکانات کی وجہ سے محفوظ رہے گا، بایاں بازو خندقوں کے ذریعے، اور اگلا حصہ مٹی کے بوروں کی آڑ (فصیل) سے محفوظ ہو جائے گا۔ ان کے درمیان کا کھلا میدان گھڑ سوار فوج کی بھرپور نقل و حرکت اور دشمن کو گھیرے میں لینے کے لیے بہترین جگہ فراہم کرے گا۔ جب تیاریاں مکمل ہو گئیں، تو بابر نے آگے بڑھنے کا حکم دیا اور جمعرات، ۲۹ جمادی الثانی ۹۳۲ ہجری مطابق ۱۲ اپریل ۱۵۲۶ء کو پانی پت کے میدان میں پڑاؤ ڈالا۔ اس وقت پانی پت کا قصبہ ان کے دائیں جانب تھا اور سلطان ابراہیم کا لشکر یہاں سے

۱۲ میل کے فاصلے پر تھا۔ بابر نے اپنے بائیں بازو کو دشمن کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک خندق کھدوائی اور کٹے ہوئے درختوں کی باڑ لگائی۔ اگلے حصے کو انہوں نے گاڑیوں اور مٹی کے بوروں کی آڑ سے محفوظ کیا، اور ان کے درمیان ایک ایک تیر کی مار (فاصلے) کے برابر خلا (راستے) چھوڑ دیے تاکہ حملہ آور فوجی دستے آسانی سے باہر نکل کر حملہ کر سکیں۔

بابر نے اپنے سپاہیوں کو تیموریوں کے روایتی انداز میں صف آرا کیا جو کہ ان حصوں پر مشتمل تھا: (۱) ہراول دستہ

(۲، اور ۳) دائیں اور بائیں بازو کے بیرونی حصے

(۴، اور ۵) دایاں اور بایاں بازو

(۶، اور ۷) دایاں اور بایاں مرکز

محفوظ فوج (۸)-اس نے توپ خانے اور بندوق برداروں کو سب سے آگے رکھا۔

۱۲ سے ۱۹ اپریل تک ایک ہفتے تک دونوں فوجیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی رہیں۔ مغلوں کے بازوؤں سے چھوٹے حملہ آور دستے بھیجے جاتے تھے- تاکہ پٹھانوں کو ایک عام اور بڑی جنگ پر اکسایا جا سکے۔ ان دنوں کے دوران "گھوڑوں کے ٹاپوں کی اڑتی دھول اور ہاتھیوں کی نقل و حرکت کی وجہ سے دن اور رات میں کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا تھا"۔

سلطان ابراہیم دونوں جنگجوؤں میں سے پانی پت پہنچنے والے پہلے شخص تھے۔ انہوں نے اپنے سپاہیوں کو پرانے روایتی انداز میں ترتیب دیا، یعنی: ہراول دستہ دایاں بازو، بایاں بازو، اور عقبی دستہ - بابر کے تخمینے کے مطابق ان کے ساتھ ۱,۰۰,۰۰۰ (ایک لاکھ) مرد تھے - جن میں سے کم از کم نصف فعال جنگجو تھے۔ ابراہیم کے پاس ایک سلطنت کے وسائل موجود تھے - اگرچہ وہ سلطنت بغاوتوں کی وجہ سے ہچکولے کھا رہی تھی اور ان کے پاس ایک بہت بڑا خزانہ بھی تھا جو ان کے والد اور دادا نے جمع کیا تھا۔

اس کے برعکس بابر کے پاس کابل کی غریب سلطنت کے کم وسائل تھے - کیمپ کے پیروکاروں سمیت کل ۱۲ ہزار سپاہی تھے۔ سلطان ابراہیم میدانِ جنگ میں اس سے بھی بڑا لشکر لا سکتے تھے - اگر مشرقی صوبوں میں بغاوت نہ ہوتی - اگر وہ اپنے خزانوں کو اپنے سپاہیوں میں بانٹ کر ان کا صحیح استعمال کرتے۔ ہندوستانی فوج کو امید تھی کہ وہ گھڑ سواروں، پیادہ بندوق برداروں اور ہاتھیوں کے ذریعے تمام محاذوں سے بڑے پیمانے پر حملہ کر کے محض اپنی تعداد کے بل بوتے پر دشمن کا صفایا کر دے گی۔

بابر اپنے ساتھ وسطی ایشیا کی نئی اور بہتر جنگی حکمتِ عملی لایا تھا - جو حملے میں انتہائی خوفناک تھی - جس کا طریقہ کار گھڑ سوار فوج کے چکر دار گھیراؤ کے ذریعے دشمن کو محاصرے میں لینا تھا۔ ابراہیم لودھی کے پاس یقیناً فیلڈ آرٹلری (میدانی توپ خانہ) موجود رہا ہو گا۔ جو گوالیار کی مہم میں مؤثر طریقے سے استعمال ہوا تھا اور ساتھ ہی بڑی تعداد میں مارٹر بھی تھے۔ لیکن بابر کو ہندوستانی فوج پر یہ برتری حاصل تھی کہ اس کے پاس کچھ بھاری توپیں تھیں - جو اگرچہ بہت آہستہ آہستہ فائر کرتی تھیں۔ لیکن انہیں عثمانی (ترک) توپچی چلا رہے تھے - جنہیں ان دنوں یورپ اور دنیا بھر میں بہترین مانا جاتا تھا۔ بابر جنگی حکمتِ عملی کا ماہر تھا - جو شاذ و نادر ہی کوئی غلط چال چلتا تھا - جبکہ سلطان ابراہیم غرور سے چور اور ایک فوجی کمانڈر کے طور پر ناتجربہ کار تھا - بغیر کسی منصوبے کے ان کی نقل و حرکت پر بابر نے سخت تبصرے کیے۔ اور آخر میں، "ترک جنگجوؤں" کو اپنے دشمنوں پر نہ صرف تجربے بلکہ شہرت اور خود اعتمادی میں بھی بڑی برتری حاصل تھی - موسمیاتی فوائد کی وجہ سے ان میں برداشت کی صلاحیت اور جنگی خوبیاں بہتر تھیں۔

بابر کے سپاہی اگرچہ وطن کی یاد میں اداس تھے - لیکن پٹھانوں پر اپنی حالیہ فتوحات اور مالِ غنیمت کے جمع ہونے سے ان کے حوصلے بلند تھے --- جو بلاشبہ ان غریب پہاڑیوں کے لیے ایک بڑی کشش تھی۔ لیکن پانی پت کے میدان میں وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح واقف تھے کہ شکست کا مطلب ان کی مکمل تباہی ہو گا۔ دوسری طرف ابراہیم کی فوج مختلف عناصر کا مجموعہ تھی --- جس میں راجپوت، اپنے جاگیرداروں کے تحت مختلف قبائل کے پٹھان، میواتی اور شاید منگولوں کا ایک چھوٹا دستہ شامل تھا۔ یہ

زیادہ تر ناتجربہ کار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ جو اپنے سلطان کے مقصد میں دل سے شامل نہیں تھے۔ کیونکہ ان کے بہت سے سردار سلطان کی بے رحمی کی وجہ سے دل ہی دل میں اس سے نفرت کرتے تھے۔ ذاتی بہادری اور تعداد کی برتری ہی سلطان ابراہیم لودھی کے حق میں واحد عوامل تھے۔ لیکن وہ مغلوں کی اعلیٰ حکمتِ عملی اور بہترین ہتھیاروں کا کوئی مقابلہ نہ تھے۔ ابراہیم لودھی نے ایک ہفتے تک غیر فعال رہ کر ایک مہلک جنگی غلطی کی۔ جس سے بابر کو اپنی پوزیشن مضبوط کرنے اور کامیابی کے زیادہ مواقع مل گئے۔ مغلوں کے حملوں کے باوجود ابراہیم لودھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کی کامیابی کا انحصار تیز رفتاری پر ہے۔ بابر نے ۶ صفر ۹۳۲ ہجری مطابق ۱۹ اپریل ۱۵۲۶ء کو مہدی خواجہ محمد کے تحت ۴ سے ۵ ہزار سپاہیوں کا ایک حملہ آور دستہ روانہ کیا۔

سلطان ابراہیم لودھی کو جوش دلانے کے لیے بابر نے ایک دستہ بھیجا۔ جس میں سلطان مرزا اور شہزادہ ہمایوں شامل تھے۔ ان کا مقصد رات کے اندھیرے میں اچانک حملہ کرنا تھا۔ دوسری طرف بابر خود پیچھے تیار کھڑا رہا۔ تاکہ جیت کی صورت میں آگے بڑھ سکے یا ضرورت پڑنے پر پیچھے ہٹنے والے دستوں کی مدد کر سکے۔

لیکن رات کے اندھیرے کی وجہ سے یہ حملہ ناکام ہو گیا۔ حملہ آور راستہ بھٹک گئے اور صبح ہوتے ہی خود کو افغان فوج کے کیمپ کے بالکل پاس ایک خطرناک پوزیشن میں پایا۔ تاہم، یہ دستہ محفوظ طریقے سے پیچھے ہٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ بس محمد علی جنگ کی ٹانگ پر ایک زخم آیا۔

سلطان ابراہیم کا حملہ (۲۱ اپریل ۱۵۲۶)

اس رات کے حملے نے سلطان ابراہیم کو چوکنا کر دیا۔ ۲۱ اپریل ۱۵۲۶ کی صبح (اپنے کیمپ پر حملے کے تیسرے دن) وہ ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ مغلوں پر حملہ کرنے کے لیے نکلا۔ اس نے لوہے کی زرہ پہن رکھی تھی اور اس کا لشکر سکندری دیوار کی طرح مضبوط دکھائی دے رہا تھا۔

بابر نے اپنی فوج کو جنگ کے لیے بہت منظم طریقے سے ترتیب دیا تھا

بالکل دائیں طرف کا حصہ اس کی کمان ولی قزل اور ملک قاسم کر رہے تھا- انہیں پانی پت شہر کی عمارتوں کی اوٹ (حفاظت) حاصل تھی۔

دایاں دستہ کی کمان شہزادہ ہمایوں، خواجہ کلاں، ہندو بیگ اور دیگر کے ہاتھ میں تھی۔

دایاں مرکز کی نگرانی چن تیمور سلطان اور ان کے ساتھی کر رہے تھے۔

بایاں مرکز کی کمان خلیفہ خواجہ میر میران، تردی بیگ اور دیگر کے پاس تھی۔

بایاں دستہ کی کمان محمد سلطان مرزا، مہدی خواجہ اور دیگر سنبھال رہے تھے۔

بالکل بائیں طرف کا حصہ کی کمان قرا قوزی کر رہے تھے،-اور یہ حصہ کھدی ہوئی خندقوں اور کٹے ہوئے درختوں کی وجہ سے محفوظ تھا۔

سب سے اگلا دستہ اس کے آگے خسرو کوکلداش اور محمد علی جنگ جنگ تھے۔

اضافی دستہ اس کی کمان میر آخور (گھوڑوں کے نگران) عبدالعزیز کر رہے تھے۔

سب سے آگے توپ خانے اور بندوق برداروں کو گاڑیوں اور مٹی کی عارضی دیواروں (مورچوں) کے پیچھے کھڑا کیا گیا تھا۔ یہ گاڑیاں مغلوں کے لیے دفاع اور حملے دونوں کا کام دے رہی تھیں۔ استاد علی قلی دائیں مرکز میں بھاری توپوں کے ساتھ موجود تھے، جبکہ مصطفیٰ بائیں طرف ہلکی توپوں اور بندوقوں کی کمان کر رہے تھے۔ بابر خود بالکل بیچ (مرکز) میں کھڑا ہوا تاکہ پوری جنگ کی نگرانی کر سکے۔ افغانوں نے اپنا پورا زور بابر کے دائیں دستے پر لگا دیا- لیکن پانی پت شہر کی رکاوٹ کی وجہ سے وہ ایک تنگ جگہ پر پھنس کر رہ گئے۔ یہ دیکھ کر بابر نے اپنے اضافی دستے سے عبدالعزیز کو دائیں طرف کی مدد کے لیے بھیجا۔

افغان فوجی ایک لمحے کے لیے ہچکچائے کہ آگے بڑھیں یا سنبھلنے کے لیے پیچھے ہٹیں- لیکن انہیں سوچنے کا موقع ہی نہ ملا کیونکہ ان کی اپنی ہی پچھلی فوج تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی- جس کی وجہ سے افغان صفوں میں شدید افراتفری پھیل گئی۔

بابر نے دشمن کی اس کمزوری کو بھانپ لیا اور اپنے گھڑ سوار دستوں کو حکم دیا کہ وہ گھوم کر افغان فوج کو پیچھے سے گھیر لیں (جسے 'تولغما' طریقہ کار کہا جاتا ہے) اور ان پر تیروں کی بارش کر دیں۔ ساتھ ہی مغل مرکز کو آگے بڑھنے اور توپ خانے کو آگ اگلنے کا حکم دیا گیا۔ جنگ انتہائی خوفناک اور شدید ہو گئی۔ خاص طور پر مغلوں کے بائیں دستے کی طرف زور کا مقابلہ ہوا۔

سلطان ابراہیم لودھی کردار

سلطان ابراہیم نے ۸ ذوالقعدہ ۹۲۳ ہجری سے ۸ رجب ۹۳۲ ہجری تک حکومت کی۔ قمری حساب کے مطابق ان کا کل دورِ حکومت ۸ سال اور ۸ ماہ بنتا ہے۔ جبکہ شمسی حساب (عیسوی کیلنڈر) کے مطابق یہ مدت ۸ سال، ۵ ماہ اور ۲۹ دن بنتی ہے۔ پانی پت کی جنگ کی تاریخ ہندی زبان کے درج ذیل مادۂ تاریخ (ایسا شعر یا لفظ جس کے حروف کے عدد جمع کرنے سے سنِ واقعہ معلوم ہو) میں محفوظ ہے۔

شجاعت اور فوجی مہمات

سلطان ابراہیم اپنے رشتہ داروں کے ہمراہ بڑی دلیری اور بہادری کے جذبے کے ساتھ لڑا، جس نے اس کے دشمنوں سے بھی داد وصول کی۔ اس نے اپنے بھائی کے خلاف بذاتِ خود میدانِ جنگ کا رخ کیا اور گوالیار کے خلاف فوجی کارروائیوں کی خود نگرانی کی، جسے اس نے ۱۵۱۹ء میں فتح کیا۔

جب عالم خان لودھی بابر سے ہاتھ ملانے کے بعد دہلی پر حملہ آور ہوا اور ایک رات کے اچانک حملے کے ذریعے شاہی فوج میں افراتفری پھیلا دی، تو یہ سلطان کی ذاتی شجاعت تھی کہ وہ صبح صادق تک اپنے خیمے میں ثابت قدم اور پُر عزم رہا۔ اس کے اس حوصلے نے ایک یقینی شکست کو ایک فیصلہ کن فتح میں بدل دیا۔

پانی پت کی جنگ میں جہاں اس کی موت واقع ہوئی، اس نے اس سے بھی بڑھ کر شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے دفاعی پوزیشن میں لڑنے کا انتظار کرنے کے بجائے خود حملے کی قیادت کی اور جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑنے والے (جانباز) فوجی دستوں کے ساتھ آخری سانس تک اپنے مورچے پر لڑتا رہا۔

مگر پانی پت کے میدان میں افغانوں (پٹھانوں) کی شکست کی ایک وجہ جزوی طور پر سلطان کی کمزور جنگی حکمتِ عملی اور سپہ سالاری بھی تھی۔

بطور حکمران وہ اپنے عہدے سے وابستہ فرائض کی انجام دہی میں انتہائی محنتی تھا۔ لیکن اسے دربار کے ایک ایسے مخصوص ٹولے (گروپ) کی حمایت حاصل تھی۔ جو اکثر اسے غلط راستے پر چلاتا اور انتہا

پسندی پر اکساتا تھا۔ وہ ان امراء اور جاگیر داروں کی طاقت کو کچلنے پر تلا ہوا تھا۔ جنہوں نے متاخرین تغلق کے دور سے سلطان کی حیثیت کو محض ایک علامتی اور آرائشی سربراہ تک محدود کر دیا تھا۔ وہ آخر کار اس لیے ناکام ہوا کیونکہ اس نے بہت زیادہ سخت اور پر تشدد طریقے استعمال کیے۔ چونکہ اس کا پورا دورِ حکومت شروع سے لے کر آخر تک اندرونی و بیرونی مسائل اور پریشانیوں سے گھرا رہا۔ اس لیے یہ عام عوام کے لیے فائدہ مند ثابت نہ ہو سکا۔ سلطان ابراہیم کے دور میں اشیاءِ خوردونوش اور دیگر سامان کا مضحکہ خیز حد تک سستا ہونا دراصل ملک کی انتہائی خوفناک غربت اور کٹھن حالات کا ثبوت تھا۔ جو کہ سونے چاندی (سکے بنانے والی دھات) کی شدید قلت اور پر امن تجارتی ماحول نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔

سلطان ابراہیم کے اپنے امراء اور جاگیر داروں کے ساتھ تعلقات کا جائزہ غیر جانبدارانہ اور منصفانہ جذبے کے ساتھ لینے کی ضرورت ہے۔ افغان (پٹھان) امراء جو جمہوری مساوات کی روایات کے عادی تھے۔ پہلے ہی بہلول لودھی اور سکندر لودھی کی سخت حکومت سے نالاں تھے۔ اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لیے ملک میں افراتفری پھیلانے کی سازشیں کر رہے تھے۔

ان امراء نے ماضی میں سلطان سکندر کی تخت نشینی کو روکنے کی کوشش کی تھی اور سلطان سکندر کی جگہ بہلول لودھی کے بیٹے شہزادہ فتح خان کو تخت پر بٹھانے کی سازش کی تھی مگر ناکام رہے۔ انہوں نے سلطان سکندر کی موت کے بعد سلطنت کو تقسیم کر کے مرکزی حکومت کی طاقت کو کمزور کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ ان کے دعوے اور سرکشیاں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں اور اب ناقابلِ برداشت ہو چکی تھیں۔ وہ جاگیر داروں اور چھوٹے بڑے علاقوں کے گورنروں کی حیثیت سے پورے ملک پر قابض تھے۔ ان کے مقاصد حکمران کے اختیاراتِ خصوصی اور ریاست کی خود مختاری کے لیے انتہائی نقصان دہ تھے۔

اس صورتحال سے نمٹنے کے دوران سلطان ابراہیم نے اپنی پوزیشن اور امراء کی طاقت دونوں کا غلط اندازہ لگایا اور اپنی ناتجربہ کاری اور غیر سنجیدہ اقدامات سے حالات کو مزید بگاڑ دیا۔ اگر وہ صرف ان امراء پر اپنی

بالادستی قائم کرنے تک محدود رہتا— جنہیں وہ بالکل ٹھیک طور پر ریاست کا ملازم اور خادم سمجھتا تھا— اور اگر وہ جلال خان کو شکست دے کر سلطنت کی وحدت کو بحال کرنے کے بعد رک جاتا، تو امراء بھی راضی ہو جاتے اور اس کا مقصد بھی حاصل ہو جاتا۔

لیکن اس کے بر عکس اس نے فرانس کے جیکوبنز (انتہا پسند انقلابیوں) کی طرح دہشت گردی اور خوف کے دور کا آغاز کر دیا۔ ریاست کے مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے دشمنوں کو سزا دی جائے نہ کہ اس کے وفادار حامیوں کو۔ جیسا کہ اس کا مشہور قول تھا کہ "بادشاہت کسی رشتہ داری کو نہیں جانتی" (یعنی بادشاہ کا کوئی رشتہ دار یا دوست نہیں ہوتا، سب رعایا ہوتے ہیں)، لیکن اس نے اس نظریے کو انصاف کے بجائے بے جا ظلم و ستم کا جواز بنانے کے لیے استعمال کیا۔

یہ سچ ہے کہ "بادشاہت کسی رشتہ داری کو نہیں جانتی"، لیکن سلاطین کو کسی امیر پر محض اس لیے وار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ایک امیر یا سردار ہے، نہ ہی اسے جیل میں ٹھونس کر کسی غدارانہ قتل کے ذریعے اس کی تکلیفوں کا خاتمہ کرنا چاہیے۔

ابراہیم خان لودھی بصیرت کی کمی:

تدبر (سیاسی حکمتِ عملی) اور دور اندیشی سے محروم تھا۔ اگر وہ حملہ کرنا اور فتح حاصل کرنا جانتا بھی تھا– تو وہ لوگوں کے دل جیتنا اور انہیں مطمئن کرنا نہیں جانتا تھا۔ اور یہ وہ خصوصیات ہیں جو حکمرانوں کے لیے انتہائی ضروری ہوتی ہیں۔ اس کی پالیسی سراسر جبر اور خونریزی پر مبنی تھی۔ اسے نافذ کرنے میں اس کے ارادے کبھی متزلزل نہیں ہوئے۔

اس نے اپنی قوم کی ان روایات کو یکسر چھوڑ دیا– جو سماجی مساوات پر بہت زور دیتی تھیں۔ ایک باقاعدہ تختِ شاہی کی تعمیر اور درباری آداب و ضوابط پر سخت اصرار کر کے اس نے لودھی خاندان کی تاریخ میں ایک نیا موڑ پیدا کیا۔ یہ ایک ایسی تبدیلی تھی جو ان امراء کے لیے گہرے معنی رکھتی تھی– جنہوں نے اس سے بہتر دن دیکھے تھے اور بہلول و سکندر لودھی کے زمانوں میں عزت و احترام پایا تھا۔

اس کا انتقامی جذبہ اور بے رحمی اسے لے ڈوبی- ایک بھائی کا قتل اور چار دیگر کو قید کرنا، میاں بھوا اور اعظم ہمایوں خان شروانی جیسے وفادار حامیوں کو قید و قتل کرنا ایسے اقدامات تھے جو خودکشی کے مترادف تھے۔ اپنے دشمنوں کے خلاف ملنے والی ہر کامیابی نے اس کے ظلم کے جذبے کو مزید بڑھا دیا- طاقت و اقتدار کے غرور نے اسے اس حد تک اندھا کر دیا کہ وہ یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے ہی اقتدار کی جڑیں کاٹ رہا ہے۔ فرانس میں کارڈینل رِشلو کو بھی اسی طرح کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن وہ امراء اور ہیوگیناٹس (مخالفین) کو تاج کا فرمانبردار بنانے کے بعد رک گیا تھا۔

جب قنوج سے لے کر بہار تک کا پورا مشرقی حصہ دہلی کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور مغل حملہ آور (بابر) مغربی سرحدوں پر دستک دے رہا تھا اور علاقوں پر قبضہ کر رہا تھا۔۔۔

ایک کے بعد دوسرے شہر پر قبضہ ہوتا گیا لیکن اس نے اس خطرے کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیا- اس نے نہ تو اپنے امراء کے ساتھ اختلافات دور کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی بابر کے سفیر کا استقبال کیا۔ سفارتی تحفظ کی تمام روایات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے بابر کے سفیروں کو جیل میں ڈال دیا۔ اس نے دولت خان لودھی کو صلح کی پیشکش بھی صرف اس وقت کی- جب بابر پنجاب میں داخل ہو چکا تھا اور وعدہ خلافی کے حوالے سے سلطان کے ماضی کے ریکارڈ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات انتہائی مشکوک ہے کہ اپنا مقصد پورا ہونے کے بعد وہ اپنے وعدے پر قائم رہتا یا نہیں۔ اپنے انتقام، غرور اور بے رحمی کے ساتھ ساتھ وہ دوست اور دشمن دونوں کے ساتھ غداری کا مرتکب ہوتا تھا۔ اس کے اپنے بھائی جلال خان اور حسن خان فرملی کا بیدردی سے کیا گیا قتل اس کا واضح ثبوت ہے۔ اگر امراء اپنے طرزِ عمل میں قصوروار تھے، تو ابراہیم دونوں فریقوں میں سے زیادہ بڑا قصوروار تھا۔

سیاسی تدبر کی کمی کے علاوہ، اس کی خزانے جمع کرنے کی عادت نے، جسے وہ بحران کے وقت بھی استعمال نہیں کرتا تھا، انتہائی تباہ کن نتائج پیدا کیے۔ اس کے پاس ایک بہت بڑا خزانہ موجود تھا- جس کا اندازہ بابر کی یادداشتوں (تزکِ بابری) سے لگایا جا سکتا ہے۔

اپنی مہم کے دوران اپنے بیٹوں، جرنیلوں اور تمام موجودہ فوجیوں کو نقد رقم اور قیمتی پتھروں کے تحائف دینے کے علاوہ، اور سمرقند، کاشغر، خراسان اور عراق میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے تحائف، اور مکہ، مدینہ، کربلا اور خراسان میں اولیاء کرام کے مزارات کے لیے نذرانے بھیجنے کے ساتھ ساتھ، بابر نے کابل کے ہر باشندے کے لیے چاندی کا ایک 'شاہ رخی' اور ایک 'مثقال' سکہ بھیجا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، غلام ہو یا آزاد، بالغ ہو یا بچہ، غریب ہو یا امیر۔

بابر جو خود بڑے دل کا اور سخی رہنما تھا- بالکل ٹھیک طور پر ابراہیم پر دولت کا ڈھیر لگانے کا الزام لگاتا ہے۔ اگر سلطان ابراہیم نے اپنی دولت کا صحیح استعمال کیا ہوتا اور اپنے فوجیوں کو مطمئن رکھا ہوتا- تو وہ پانی پت کے میدان میں ڈیڑھ دو لاکھ (lacs ۲/۱) مزید فوجی لا سکتا تھا- جنگ کا پورا رخ بدل سکتا تھا۔

پانی پت کی فتح کے بعد وہ (بابر) اور اس کی فوج اتنے بڑے خزانے کے مالک بن گئے کہ یہاں سے لے کر روم (یورپ) اور خطاء (چین) تک کی پوری دنیا نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ روم کے قیمتی زربفت اور خطاء کے کڑھائی والے ساٹن کے کپڑے- جو ان ممالک میں بھی نایاب ہیں - یہاں گدھوں پر لدے ہوئے بوجھوں کی مقدار میں پائے گئے۔"

محمود لودھی اور افغانوں کی آخری مزاحمت

پانی پت کی پہلی لڑائی کے نتیجے میں سلطان ابراہیم لودھی کو شکست ہوئی۔ وہ مارا گیا۔ اس جیت نے بابر کو دہلی آگرہ اور پنجاب کا مالک بنا دیا۔ تاہم ان علاقوں سے باہر بہت سے فوجی جرنیل اور گورنر مغل فاتح (بابر) کی اطاعت کرنے سے صاف انکار کر رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو سلطان ابراہیم کے دورِ حکومت میں بھی دہلی کی غلامی سے خوش نہیں تھے اور اب انہوں نے بابر کے خلاف کھلی بغاوت کر دی تھی۔

چنانچہ مختلف علاقوں پر الگ الگ رہنماؤں کا قبضہ تھا:

قاسم خان سنبھل پر قابض تھا۔

نظام خان بیانا پر قبضہ جمائے ہوئے تھا۔

حسن خان میواتی میوات اور الور کے قلعے کا مالک تھا۔ (بابر نے اپنی یادداشتوں یعنی 'تزکِ بابری' میں اس کی غداری کی وجہ سے اس کا بہت برے الفاظ میں ذکر کیا ہے)۔

حسین خان لوہانی راپڑی پر قابض تھا۔

قطب خان اٹاوا کا مالک تھا۔

عالم خان لودھی کالپی پر قابض تھا۔

تاتار خان سارنگ خانی گوالیار پر قابض تھا۔

محمد زیتون دھولپور پر قابض تھا۔

دوسری طرف، قنوج اور دریائے گنگا کے پار کا علاقہ ناصر خان اور معروف فرملی کے پاس تھا۔ یہ دونوں سلطان محمد لوحانی (بہار خان) کے نائب کے طور پر کام کر رہے تھے، جو دریا خان لوحانی کا بیٹا تھا۔

جب سلطان ابراہیم کے دورِ حکومت کے آغاز میں دریا خان نے بغاوت کی تھی- تب ہی سے اس خاندان نے بہار سے لے کر قنوج تک کے پورے علاقے پر اپنی مکمل آزاد حکومت قائم کر رکھی تھی۔

یہاں تک کہ مہاون کا قصبہ (جو آگرہ سے ۴۰ میل دور متھرا کے قریب ایک قلعہ بند شہر تھا) بھی سلطان کے ایک غلام مرغوب کے قبضے میں تھا۔ ... مہاون پر مرغوب کا قبضہ تھا۔ جو سلطان ابراہیم کا ایک غلام تھا۔ لوگ شہروں کو چھوڑ کر دیہاتی علاقوں کی طرف ہجرت کر چکے تھے اور شاہراہوں پر لوٹ مار (ڈاکوزنی) پر اتر آئے تھے۔ انسانوں اور جانوروں کے لیے کوئی اناج دستیاب نہ تھا۔ لوگ اس فاتح کے کھلم کھلا مخالف تھے۔ جسے وہ ایک حملہ آور سمجھتے تھے۔ زیادہ تر سردار اور شہزادے اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ بابر بھی تیمور کی طرح (لوٹ مار کر کے) واپس چلا جائے گا اور ان میں سے ہر ایک کے لیے علاقائی فتوحات کے وسیع مواقع چھوڑ جائے گا۔ لیکن حملہ آور کے خلاف نہ تو کوئی متحدہ مخالفت تھی اور نہ ہی ان کی رہنمائی کے لیے کوئی قائد تھا۔ ہر کوئی اپنی ہی طاقت بڑھانے اور ذاتی مفاد میں مصروف تھا- اگرچہ بظاہر ایسا لگتا تھا کہ وہ سب سلطان ابراہیم کے بھائی محمود خان لودھی کے حمایتی ہیں- جن کا تاریخ میں آخری بار ذکر سنہ ۹۲۳ ہجری/ ۱۵۱۷ء میں ہانسی میں ان کے اپنے بھائی کے قیدی کے طور پر ملتا ہے۔ پانی پت میں اپنے بھائی سلطان ابراہیم کی موت کے بعد وہ قید سے رہا ہونے میں کامیاب ہو گئے اور میواڑ کے رانا سانگا کے ہاں پناہ لے لی۔ بابر کے لیے فی الوقت صورتحال تاریک اور مایوس کن تھی۔ لیکن مغلوب پٹھانوں کے ساتھ اس کے نرم اور ہمدردانہ سلوک نے—بشمول سلطان ابراہیم لودھی کی والدہ کے جنہیں اس نے سات لاکھ "دام" کی آمدنی والا ایک پرگنہ جاگیر میں عطا کیا—بابر کے حق میں ایک اچھا ردعمل پیدا کیا۔ دوآبہ سے شیخ گھورن اور علی خان فرملی جو فرشتہ کے مطابق جسمانی جثہ (وزن اور قد کاٹھ) میں بے مثال تھے۔ ہمیشہ ان کے منہ میں 'پان' رہتا تھا اور وہ کبھی اپنی تلوار خود سے الگ نہیں کرتے تھے- شیخ بایزید، فیروز خان سارنگ خانی اور قاضی جیا نے ان پٹھانوں کے علاوہ بابر کا ساتھ اختیار کر لیا- جو پانی پت کی جنگ کے عین موقع پر ہی اس کے ساتھ وابستہ ہو چکے تھے۔ بابر کی پوزیشن کو مضبوط کرنے کی

سمت میں اگلا فیصلہ کن قدم تب اٹھایا گیا-جب موسم کی شدید، جھلسا دینے والی گرمی اور اپنے سپاہیوں کے احتجاج اور اعتراضات کے باوجود، اس نے ہندوستان ہی میں قیام کرنے کا پختہ فیصلہ کیا۔ بابن (جسے بابر نے پانی پت کی جنگ کے موقع پر مغل فوج میں شامل ہوتے وقت بابر کے سامنے بیٹھنے پر اصرار کرنے کی وجہ سے برطرف کر دیا تھا) کی طرف سے سنبھل پر حملے نے قاسم خان کو مغلوں کی پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ مغل فوج کے دستوں نے حسین خان نوحانی سے راپڑی اور قطب خان سے ایٹاوا فتح کر لیا۔ اس کے فوراً بعد ناصر خان نوحانی اور معروف فرملی نے اپنے آقا بہار کے سلطان محمد کے نام پر کارروائی کرتے ہوئے ۳۰ سے ۴۰ ہزار سپاہیوں کے ساتھ دریائے گنگا کو عبور کیا اور قنوج پر قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف راناسانگا جس نے سلطان ابراہیم کے خلاف بابر سے مدد کا وعدہ کیا تھا- میاں مکھن کے بیٹے حسن خان سے کانڈیر چھیننے کے بعد چتوڑ سے بیانہ کی طرف پیش قدمی کی۔ افغانوں کے حملے کو دونوں (خطروں) میں سے زیادہ خوفناک اور سنگین سمجھتے ہوئے بابر نے پہلے اس کے خلاف کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے شہزادہ ہمایوں کی قیادت میں ایک مہم جو فوج روانہ کی جس نے شکست دی...

راستہ خان شیروانی، ولد اعظم ہمایوں خان شیروانی نے ڈلماؤ میں مغل فوج میں شمولیت اختیار کی اور بابر کو پیش کیے جانے پر انہیں ایک کروڑ اور چھ لاکھ سے زیادہ کے والد کے اعزاز سے ایک جاگیر سے نوازا گیا۔ خانِ خانان اس کا بیٹا محمود خان بابر کے ساتھ یرغمال بنا رہا۔ ہمایوں نے جونپور پر قبضہ کیا اور ناصر خان کا غازی پور تک پیچھا کیا اور پٹھان سردار عالم خان جگت کے ساتھ کارا میں شامل ہوا۔ بیانہ کے نظام خان نے راناسانگا کی طرف سے دھمکی دی، بیان کو بابر کے حوالے کر دیا اور اس کے بدلے دوآب میں پرگنہ حاصل کر لیا۔ پٹھان سردار یسین خان کے ساتھ مل کر گوالیار کے راجہ مان سنگھ کی اولاد منگت رال کے حملے نے تاتار خان کو گوالیار کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا- حالانکہ اس نے اپنا وعدہ پورا کرنے میں تاخیر کی تھی۔ بابر نے مدد کے وعدے کو پورا کرنے میں ناکامی کے لیے راناسانگا پر بدعقیدگی کا الزام لگایا، ایک وعدہ جو کہ قدیم قصبہ جاجماؤ جس نے اپنا نام کاون پور پرگنہ اور تحصیل کو دیا تھا اب کانپور چھاؤنی کے مشرق میں گنگا

کے کنارے ایک بوسیدہ جگہ ہے اور شہر سے چار میل دور ہے رانا نے بابر پر اپنے وعدے کے تحت کالپی، دھول پتیر اور بیانا کے حوالے کرنے میں ناکامی کا الزام لگایا۔ جب رانا سانگا نے ۲,۰۱,۰۰۰ سپاہیوں کے ساتھ بابر کے خلاف پیش قدمی کی۔ تو تنازعہ اسلام اور ہندو مت کے درمیان ایک ہو گیا کیونکہ سانگا کا مقصد ایسا لگتا ہے کہ یہ تھا۔ "ہندو راج" کا قیام اور اس نے محمود لودھی کو ایک ٹول اور ٹرمپ کارڈ کے طور پر استعمال کرنے کا سوچتے ہوئے اس کا بیڑا اٹھایا۔ رانا سانگا جو پوری قوت سے بیانہ کی طرف آرہا تھا۔ اس نے اپنی چھاؤنی کو مضبوط کرنے کے لیے تعینات بابر کی فوج کو شکست دی۔ اور ایک پٹھان سردار سنگر خان جنجوعہ کو قتل کر دیا۔ اس کے سپاہیوں کو کسی ملک میں فوجی مہمات کی سخت مشقوں سے مایوسی ہوئی تھی جس کی خصوصیات اور آب و ہوا وہ ناپسند کرتے تھے۔ بہادر راجپوتوں کے خلاف تازہ مشقت کے خیال سے وہ ناخوش تھے۔ نجومیوں نے آپ شگن کہا اور اس کے رئیسوں نے اسے دہلی اور آگرہ کو چھوڑ کر پنجاب کی طرف واپس آنے کا مشورہ دیا۔ یہ پٹھانوں کے لیے ایک زبردست جدوجہد کرنے، ہر طرف انتشار پیدا کرنے اور کھوئی ہوئی زمین واپس لینے کا اشارہ تھا۔ حسین خان نوحانی نے راپڑی پر قبضہ کیا، قطب خان نے چاندور، رستم خان کول (علی گڑھ) اور قنوج کو پٹھانوں نے واپس لے لیا۔

مقامی ہندو افواج، جس کی قیادت ممکنہ طور پر منگت رائے اور اس کے پیروکار کر رہے تھے، نے ایک بار پھر گوالیار کے اندر مغل افواج کو گھیرے میں لے لیا۔ ایک بار پھر ہیبت خان نے، جسے "بھیڑیا مار" کا لقب دیا گیا تھا اس نے بابر کا ساتھ چھوڑ دیا اور سنبھل کی طرف چلا گیا- جبکہ بیانا کے حسن خان راجپوتوں (ہندوؤں) کے ساتھ جا ملے۔

بابر نے اس صورتحال کا سکون اور سمجھداری سے سامنا کیا اور راجپوتوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ رانا سانگا کے لشکر میں کئی چھوٹے راجے اور راول (ماتحت حکمران) شامل تھے۔ ان کے ساتھ محمود لودھی بھی موجود تھا جو ۱۰,۰۰۰ پٹھان سپاہیوں کے ساتھ رانا کے ساتھ اس امید پر شامل ہوا تھا کہ راجپوتوں کی مدد سے دہلی اور آگرہ کو دوبارہ حاصل کیا جا سکے۔

مگر افغانوں کی ایک بڑی تعداد بابر کے ساتھ بھی تھی۔ مغل فوج کے بائیں وسطی حصے میں بہلول لودھی کے بیٹے سلطان علاؤ الدین موجود تھے - دائیں بازو میں پنجاب کے گورنر دولت خان لودھی کے بیٹے خانِ خاناں دلاور خان، ملک داد کرانی اور شیخ گھورن شامل تھے۔ کچھ فوجی دستوں کی قیادت علاؤ الدین لودھی (عالم خان) کے بیٹوں جلال خان اور کمال خان، علی خان، شیخ زادہِ فرملی اور بیانہ کے نظام خان کر رہے تھے۔

۱۷ مارچ ۱۵۲۷ء کو ہونے والی کینوا (خانوا) کی خونریز جنگ نے ہندوستان پر مغلوں کے قبضے پر مہر ثبت کر دی۔ اگرچہ راجپوتوں نے بڑی بہادری سے جنگ لڑی - لیکن بابر کی اعلیٰ جنگی حکمتِ عملی نے اسے ایک شاندار اور فیصلہ کن فتح دلائی۔ رانا سانگا، محمود لودھی کے ساتھ چتوڑ کی طرف فرار ہو گیا اور اس طرح ایک ہندو سلطنت قائم کرنے کی کوشش ناکام ہو گئی اور لودھی سلطنت کے دوبارہ عروج پر آنے کی امیدیں دم توڑ گئیں۔

خانوا کی فتح کے فوراً بعد بابر نے کول (موجودہ علی گڑھ) کی طرف ایک فوج روانہ کی جس کے نتیجے میں رستم خان (الیاس خان) کو شکست ہوئی - وہ پکڑا گیا اور بابر کے حکم پر اس کی کھال زندہ ادھیڑ دی گئی۔ جنگی حکمتِ عملی کی بنا پر بابر نے میواڑ پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا، لیکن اس کے بجائے میوات کو لوٹنے اور اس پورے علاقے کو فتح کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ آگرہ واپس آنے کے بعد بابر نے ایک فوجی دستہ روانہ کیا - جس نے ابو محمد سے چاندوار، راپڑی اور شمس آباد دوبارہ چھین لیے۔ بابن کو شکست دی گئی - اور خیر آباد تک اس کا پیچھا کیا گیا۔ شیخ بایزید جو اس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا - اس کے خلاف ایک فوج بھیجنے کے بعد بابر خود چندیری کی طرف بڑھا۔

چندیری اس وقت ایک بہت ہی مضبوط، امیر اور گنجان آباد شہر تھا۔ بابر نے ایک شدید اچانک حملے کے ذریعے اس پر قبضہ کر لیا اور اس کے سردار میدنی رائے سمیت بڑی تعداد میں راجپوتوں کو قتل کر دیا۔ میدنی رائے سلطان ابراہیم کی رانا سانگا کے ہاتھوں شکست کے بعد سے، رانا سانگا کے قبضے کے وقت سے ہی

اس شہر پر قابض تھا۔ چندیری کا انتظام احمد شاہ (ولد محمد خان) کے سپرد کر دیا گیا، جو مالوہ کے سلطان ناصر الدین کے بیٹے سلطان سکندر کا پسندیدہ تھا۔ تاہم اسے ایک فوجی گورنر (فوجدار) کی سخت نگرانی میں رکھا گیا۔

جس وقت بابر چندیری پر حملے کی تیاریاں کر رہا تھا، اسے قنوج اور شمس آباد کے زوال اور بابن اور بایزید کے ہاتھوں شاہی فوج کی شکست کی تشویشناک خبریں موصول ہوئیں۔۔۔

بابن اور بایزید کے ہاتھوں شاہی فوج کی شکست کی تشویشناک خبریں موصول ہوئیں۔ ان افغان باغیوں نے مغلوں کی سپاہ کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا اور مشرقی سرحدوں پر اپنی طاقت کا لوہا منوا رہے تھے۔

ان پریشان کن خبروں کے باوجود بابر نے اپنے حوصلے پست نہ ہونے دیے اور چندیری کی مہم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے بعد فوراً اپنا رخ مشرق کی طرف موڑ لیا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک بابن اور بایزید جیسے سرکش افغان سرداروں کو مکمل طور پر کچلا نہیں جاتا، تب تک ہندوستان پر مغلوں کی حکومت کبھی محفوظ نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس نے اپنی تجربہ کار فوج کو دوبارہ اکٹھا کیا اور باغیوں کو عبرت ناک شکست دینے کے لیے پیش قدمی شروع کر دی۔ مشرقی علاقوں میں بابر کی مہم جوئی بابر راپری، فتح پور، اٹاوہ اور کرائی سمیت کئی علاقوں سے گزرتا ہوا دریائے گنگا پار کر گیا۔ جب افغان فوج کو بابر کی آمد کی خبر ملی تو محمود لودی ایک ہلکی سی جھڑپ کے بعد چنار سے پیچھے ہٹ گیا اور شیر خان نے سراسیمگی (گھبراہٹ) میں بنارس چھوڑ دیا۔ جس دوران افراتفری میں اس کی دو کشتیاں بھی ڈوب گئیں۔ بابر نے دریائے ٹونس اور گنگا کے ملاپ کے مقام سے دریا پار کیا اور چنار اور غازی پور پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ محمود لودھی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ جس نے دریائے سون کے پاس ایک نیا مورچہ سنبھال رکھا تھا۔ غازی پور پہنچ کر کئی افغان (پٹھان) سرداروں نے بابر کی اطاعت قبول کر لی، کیونکہ وہ ایک دوسرے سے حسد کی وجہ سے زیادہ دیر تک متحد رہنے کے اہل نہیں تھے۔ ان سرداروں میں محمود خان لوحانی، جلال خان لوحانی (بہار کا نوجوان جلاوطن بادشاہ)، شیر خان سور، فرید خان اور الاؤل خان سور شامل تھے۔ اب یہ کوئی قومی سطح کی مزاحمت

نہیں رہی تھی- بلکہ صرف محمود خان لودھی کی قیادت میں ایک مخصوص دھڑے کی مخالفت رہ گئی تھی۔ بابر نے چوسا اور بکسر کے سامنے پڑاؤ ڈالا اور سلطان محمود لودھی کا پیچھا کیا- جس کی فوج پے در پے شکستوں کی وجہ سے مکمل طور پر مایوس ہو چکی تھی اور روزانہ فوجیوں کے فرار ہونے کی وجہ سے کمزور پڑ رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے پاس صرف ۲,۰۰۰ آدمی رہ گئے۔ محمود لودھی بغیر کوئی جنگ لڑے بھاگ نکلا اور اپنے پیچھے دو ہاتھی اور کچھ آدمی چھوڑ گیا- جو مغلوں کے ہاتھ لگ گئے۔ اس نے اپنے خاندان سمیت بنگال کے بادشاہ نصرت شاہ کے ہاں پناہ لی۔ نصرت شاہ نے سلطان ابراہیم لودھی کی بیٹی سے شادی کر لی اور اپنے رشتہ دار (سسرالی چچا) محمود لودھی کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ بعد میں جب شیر شاہ سور نے بنگال فتح کیا- تو محمود لودھی اپنی جان بچانے کے لیے وہاں سے اڑیسہ بھاگ گیا- کیونکہ دہلی کے تخت پر دعوے دار ہونے کی وجہ سے اسے اپنی جان کا خطرہ تھا۔ آخر کار ۱۵۴۲ء میں اڑیسہ کے اندر جلاوطنی کی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا۔ افغانوں کا پیچھا کرتے ہوئے بابر کا سامنا بنگال کی فوج سے ہوا- جو دریائے گھاگھرا اور گنگا کے ملاپ کے مقام پر ایک بحری بیڑے کی مدد سے جارحانہ انداز میں کھڑی تھی۔ بنگال کی فوج کی شکست اور پسپائی کے ساتھ ہی مشرق میں مغلوں کے خلاف تمام بڑی مزاحمت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد بابر نے بابن اور بایزید کی قیادت میں افغان فوج کے باقی ماندہ دستوں کا پیچھا کیا اور انہیں بندیل کھنڈ کی طرف دھکیل دیا۔ محمود لودھی (آخری لودھی حکمران) کی شکست کے ساتھ ہی تاریخ کے صفحات میں لودھی خاندان کا ذکر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ سلطان ابراہیم لودھی کا اکلوتا بیٹا (جس کا نام بابر نے غالباً اس کی کم عمری کی وجہ سے نہیں لکھا) قندھار کی جیل میں قیدی بنا کر بھیج دیا گیا تھا۔ یہ قدم اس وقت اٹھایا گیا جب ابراہیم لودھی کی ماں نے ۳۰ اگست ۱۵۲۷ء کو بابر کو زہر دے کر مارنے کی ناکام کوشش کی۔ اگرچہ بابر نے اس خاتون کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا تھا- لیکن اس کے دل میں اپنے بیٹے کے قاتل اور افغان سلطنت چھیننے والے سے بدلہ لینے کی آگ سلگ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم لودھی کا بیٹا جیل ہی میں مر گیا تھا- کیونکہ اس کے بعد وہ تاریخ سے بالکل غائب ہو جاتا ہے۔ ان مشکل اور ہنگامہ

خیز حالات میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک انتہائی باصلاحیت اور مضبوط کردار کے مالک انسان کی ضرورت تھی۔

جو اس قوم کے قومی ہیرو کا کردار ادا کر سکے مگر افغان قوم قومی یکجہتی (اکٹھے ہونے) کے بجائے اپنے الگ الگ قبیلوں کی آزادی کو زیادہ پسند کرتی تھی۔ پانی پت کی جنگ میں ایک بہت بڑی شکست کے بعد یہ قوم پوری طرح بددل، مایوس اور بکھر چکی تھی۔

محمود لودھی نے اپنی زندگی کے تقریباً آٹھ سال قید میں گزارے تھے، جہاں اسے بہت سی بیگمات کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی کھلی چھوٹ ملی ہوئی تھی۔ اس آرام پسندی کی وجہ سے وہ عملی طور پر کوئی بڑا قدم اٹھانے کی صلاحیت کھو چکا تھا اور اس میں اپنی قوم کی قیادت کرنے کی کوئی خوبی باقی نہیں رہی تھی۔ ایک ایسے وقت میں جب کسی غیر ملکی حملہ آور کا راستہ روکنے کے لیے ایک مضبوط اور متحد محاذ کی ضرورت تھی- محمود لودھی جیسا عیاش اور رنگ رنگیلا انسان— جس کا پسندیدہ مشغلہ رقاصاؤں کے ساتھ وقت گزارنا تھا— قومی ہیرو بننے کے بالکل لائق نہیں تھا۔

اگر یہ لوگ (پٹھان / افغان) متحد ہوتے تو اوسط درجے کی صلاحیت کا حامل کوئی عام لیڈر بھی مغل سلطنت کے مضبوط ہونے تک بہار میں اپنا قبضہ برقرار رکھ سکتا تھا۔ لیکن یہ کام شیر شاہ (سوری) کے حصے میں آنا تھا جس نے اپنے ہم نسلوں کی ناکامیوں سے سبق سیکھا۔ اس نے ایک مضبوط قومی تحریک تیار کی- جس کے نتیجے میں بالا آخر مغل بادشاہ ہمایوں کو ملک سے باہر بھاگنا پڑا اور لودھی خاندان کے قریبی رشتہ دار 'سوری خاندان' کے تحت دوسری پٹھان سلطنت قائم ہوئی۔

لودھی سلاطین کے ادارے

حصہ الف

مرکزی حکومت

ہمارے پاس سید اور لودھی دور کے دوران حکومتی مشینری کے طریقہ کار کی اس طرح کی مکمل تفصیلات موجود نہیں ہیں -جیسے کہ مغل دور کی 'آئینِ اکبری' یا 'دستور العمل' کے ذریعے ملتی ہیں۔ انتظامی نظام بنیادی طور پر اس نظام سے مختلف نہیں تھا جو خلجی، تغلق اور سید دور میں رائج تھا۔ فطری طور پر ہمارے مواد کا ایک بڑا حصہ لودھی دور سے پہلے اور لودھی دور کے بعد کی حکومتوں کے طریقہ کار پر مبنی ہے۔ مؤرخین ان افسران کا صرف سرسری ذکر کرتے ہیں جن کے فرائض کا تعین بعض اوقات عباسی یا فاطمی خلافتوں کے تحت قائم کردہ اسی طرح کے عہدوں کے حوالے سے کرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ بہلول لودھی کے ۳۴وزیر اور سکندر لودھی کے وزیر تھے۔ لیکن بہت کم وزیروں کا ذکر عہدے داروں کے طور پر ملتا ہے۔ تقریباً تمام وزیر کوئی نہ کوئی عہدہ رکھتے تھے اور وہ محض درباری یا حاشیہ بردار نہیں تھے -جو شاہی عنایات کے منتظر رہیں۔ اس کے باوجود ہمارے پاس حکومتی مشینری کے ڈھانچے کو دوبارہ تشکیل دینے کے لیے کافی مواد موجود ہے۔

شمالی ہندوستان نے برسوں کی عدم تحفظ اور بدامنی کے بعد نہ صرف لودھیوں کے تحت ایک مستحکم حکومت حاصل کی۔

اور بدامنی لیکن پرانے عناصر کا خاتمہ کر کے اور انتظامیہ میں نئی روح پھونک کر ایک تنظیمی ڈھانچہ وضع کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ لودھی سلاطین کے عہدِ حکومت میں شمالی ہندوستان کو جو امن، تحفظ اور خوشحالی نصیب ہوئی وہ ان کی فوجی کامیابیوں یا صوبائی انتظامیہ کے سربراہوں کے طور پر جنگجو سرداروں کی موجودگی کی مرہونِ منت اتنی نہیں تھی- جتنی کہ اس انتظامی مشینری کو باقاعدہ بنانے کا نتیجہ تھی جو لودھیوں کے زوال کے بعد بھی باقی رہی۔ شیر شاہ (سوری) کو ورثے میں خالصتاً لودھیوں کی انتظامی

مشینری ملی تھی- جو ہندوستان کے پہلے دو مغل حکمرانوں کے دور سے گزر کر تبدیل ہوئے بغیر اس تک پہنچی تھی۔ یہ ایک ایسا نظام تھا جس کی اس نے اپنے ماضی کے تجربات کی روشنی میں تفصیل سے نئی تنظیم نو کی۔

علماء کے معاملے میں لودھی سلاطین عام طور پر علمی رائے کا احترام کرتے تھے۔ ملا قادن کی طرف سے بہلول کے منہ پر پٹھانوں کی ایک غیر مہذب قوم کے طور پر مذمت، اور سلطان سکندر لودھی کی طرف سے روزے اور نماز چھوڑنے، داڑھی منڈوانے اور شراب نوشی پر قاضی عبدالوہاب کی سرزنش کا فراخدلانہ استقبال اس کی واضح مثالیں ہیں۔

تاہم، امورِ سلطنت پر مشاورت کے لیے بادشاہ کی معاونت ایک کونسل کرتی تھی جس کا اجلاس اس کے نجی دیوانِ خاص (Audience Hall) میں ہوتا تھا اور یہ کونسل منتخب امرا پر مشتمل ہوتی تھی جن میں وزیر سب سے اہم رکن ہوتا تھا۔ یہ کوئی باقاعدہ کابینہ نہیں تھی- اس میں نہ تو وزراء کی کوئی اجتماعی ذمہ داری تھی اور نہ ہی کثرتِ رائے سے ووٹنگ ہوتی تھی۔ ارکان کے پاس محض مشاورتی اختیار ہوتا تھا۔ یہ بالکل فرانس میں مطلق العنان بادشاہت کے دنوں میں قائم بادشاہ کی کونسل 'کونسل دو روا' کی طرح تھی۔

تاہم، تخت کے جانشین کے انتخاب میں بادشاہ کی کونسل کا اہم کردار ہوتا تھا- جیسا کہ شہزادہ نظام خان اور ابراہیم کی تخت نشینی کی تاریخ سے ثابت ہے۔ اور اگرچہ عام طور پر باپ کی طرف سے نامزد وارث کا تقرر ہی قاعدہ تھا- لیکن اس نامزدگی کو قانونی حیثیت دینے کے لیے امرا کی رضامندی اسی طرح ضروری تھی جیسے کسی قبائلی سردار کا انتخاب اسی وقت جائز ہوتا تھا- جب قبیلے کے ارکان اس سے متفق ہوں۔ لیکن ایک بار منتخب ہونے کے بعد حکمران مطلق العنان ہو جاتا تھا اور ایک کامیاب بغاوت کے سوا کوئی چیز اسے تخت سے محروم نہیں کر سکتی تھی۔ کسی فوجی مہم کی نگرانی کے دوران، سلطان اپنی جنگی کونسل سے مشاورت کرتا تھا- جس میں وزیر کے علاوہ (اگر وہ دارالحکومت میں نہ رکا ہو) فوجی افسران بھی شامل

ہوتے تھے.... (اگر وہ دارالحکومت میں بادشاہ کے نائب کے طور پر نہ رکا ہو) موجود ہوتے تھے۔(۱) فوجی مہمات چلانے کے لیے دارالحکومت سے روانہ ہوتے وقت سلطان ممتاز امراء کے تحت ایک نائب یا نائبوں کی ایک کونسل چھوڑ جاتا تھا جو اس کی غیر موجودگی میں فرائض سرانجام دیتے تھے۔ ایسے عہدیدار کو 'وکیل' یا نائب کہا جاتا تھا، جو پہلے کے سلاطین کے ہاں 'نائبِ غیبت' کہلاتا تھا۔ چنانچہ بہلول لودھی نے پہلی بار ملتان کی طرف مارچ کرتے وقت (۸۵۵ ہجری / ۱۴۵۱ء) شہزادہ بایزید کو دہلی میں اپنا وکیل مقرر کیا۔ اور دوسری بار قطب خان اور خانِ جہاں کے تحت ایک کونسل قائم کی۔ سلطان سکندر کے بیٹے شہزادہ جلال خان کالپی میں مقیم رہے جبکہ جونپور کی حکومت ان کے وزیر اور نائب فتح خان شیروانی نے چلائی۔ جب سلطان عدالت میں صدارت نہ کر سکتا ہو یا دیگر فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہو، تو شاہی عدالت کے صدر کے طور پر ایک مستقل وکیل یا نائب موجود ہوتا تھا۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سلطان سکندر لودھی نے اپنے نائب دریا خان کو ہدایت کی تھی کہ "وہ رات کے پہلے پہر تک عدالت کی نشست پر موجود رہے۔ مرکزی حکومت اچھے منظم محکموں کے ذریعے کام کرتی تھی۔ لودھی جس طرح تخت کے وارث بنے - اسی طرح وہ اپنے پیشروؤں کے اداروں کے بھی جانشین بنے۔ یقیناً قبائلی تنظیم کے اداروں کا اطلاق ہندوستان جیسے برِصغیر کی حکومت پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مرکزی حکومت کے عہدیداران درج ذیل تھے: ابراہیم لودھی جیسا ضدی حکمران بھی بادل گڑھ کا محاصرہ کرتے وقت روزانہ اپنی جنگی کونسل سے مشورہ کرتا تھا۔ طبقاتِ اکبری، جلد ۱، صفحہ ۳۴۷۔ عبداللہ، تاریخ داؤدی، ایلیٹ، جلد ۴، صفحہ ۴۵۴۔

لودھی سلاطین کے ادارے (صفحہ ۲۱۷) الوزیر: یعنی وزیرِ اعظم۔ عریضِ لشکرِ ممالک (مملکت) یا بخشیِ ممالک: وزیرِ جنگ اور لڑاکا افواج کا پے ماسٹر (تنخواہ بانٹنے والا)۔ سپہ سالار: یعنی کمانڈر انچیف۔ دبیر: محکمہ خط و کتابت (سیکرٹریٹ) کا سربراہ۔ میر عدل: یعنی چیف جسٹس۔ الصدر: مذہبی اوقاف اور خیرات کا وزیر اور شرعی قانون کا چیف جسٹس۔ الحاجب: یعنی چیمبرلین (درباری نگران)۔ کوتوال یا شحنہ: شہر کی پولیس کا ناظم۔ محتسب: عوامی اخلاقیات کا نگران اور بازاروں کا سپرنٹنڈنٹ۔ داروغہ ءڈاک چوکی: محکمہ

ڈاک کا سپر نٹنڈ نٹ اور خفیہ انٹیلی جنس کا سربراہ۔ (امیر) میر کوہی: زراعت اور آبپاشی کا سپر نٹنڈ نٹ۔ چیف قاضی: شرعی قوانین کا جج۔ میر شکار یا شکار بیگ: شاہی شکار کا نگران۔ میرِ عمارت: شاہی عمارات کا سپر نٹنڈ نٹ۔ میر بحر: بحری یا دریائی بیڑے کا سربراہ۔

خاصہ خیل: بادشاہ کی گھڑ سوار فوج کا سربراہ۔

وکیلِ در: محل کا میئر یا نگران۔

سلیحدار یا سرِ سلیحدار: اسلحہ خانہ کا سربراہ یا شاہی اسلحہ بردار۔

سرِ جاندار: بادشاہ کے گھڑ سوار باڈی گارڈز (محافظ دستے) کا سربراہ۔

سراپردہ دار: حرم سرا (خواتین کے حصے) کا چیف خواجہ سرا۔

آخور بیگ یا میرِ آخور: شاہی اصطبل کا نگران۔ شحنہ ءِ پیل: شاہی فیل خانہ (ہاتھیوں) کا سپر نٹنڈ نٹ۔

باربک: شاہی دربار کا نقیب یا تشریفات کا نگران کتاب دار: شاہی لائبریرین۔

دوات دار: شاہی قلم دان یا سیاہی کا برتن سنبھالنے والا۔

قرآن خوان: قرآن پاک کی تلاوت کرنے والا۔

نجم: درباری نجومی۔ ریاست کا سب سے اہم عہدیدار وزیر تھا۔ ایک جدید مؤرخ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ بہلول کا کوئی وزیر نہیں تھا اور سکندر کے دور میں میاں بھوا وزیر کے اختیارات کا مالک تھا۔ درحقیقت ہمیں وزیروں کا ایک تسلسل ملتا ہے۔بہلول کا ایک وزیر عمر خان شیروانی تھا

میاں بھوا سکندر کے عہد میں اس عہدے پر فائز رہے یہاں تک کہ ابراہیم نے انہیں قید کر دیا اور ان کی جگہ ان کے بیٹے دلاور خان کو مقرر کیا۔

...لودھیوں نے وزیروں کی طرف سے اختیارات پر غاصبانہ قبضے کا خاتمہ کر دیا۔ جنہوں نے بعد کے تغلقوں اور سادات (سید خاندان) کے کمزور دورِ حکومت میں خلافتِ عباسیہ کے 'وزیرِ مطلق' کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ اب ہمیں خانِ جہاں جیسے بااختیار اور خود مختار وزیروں کا ذکر سننے کو نہیں ملتا۔ جو فیروز

تغلق کے بڑھاپے کے دور میں ملک کے اصل حکمران بن بیٹھے تھے۔ یا سرور الملک جس نے اپنے مربی مبارک شاہ سید کو قتل کر کے نمک حرامی کی تھی یا حسام خان اور حامد خان جنہوں نے علانیہ طور پر اپنے سرپرست علاؤ دین عالم شاہ کی نافرمانی کی اور دہلی پر قبضہ کر لیا تھا۔ لودھیوں کے وزراء تاج و تخت کے فرمانبردار ملازم اور بنیادی طور پر سول افسران تھے، اور اپنے پیشروؤں کے برعکس انہوں نے شاذونادر ہی کسی فوجی مہم کی قیادت کی۔ اگرچہ عملی طور پر وزیر دیوان یعنی محکمہء مال کا سربراہ ہوتا تھا۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ دیگر تمام محکموں پر بھی عام نگرانی رکھتا تھا۔ وہ بادشاہ کی کونسل کا سب سے اہم رکن ہوتا تھا۔ بادشاہ کی بیماری یا معذوری کی صورت میں اس کے قائم مقام کے طور پر کام کرتا تھا، وسیع البنیاد پالیسی کے معاملات پر بادشاہ کو مشورہ دیتا تھا۔ تمام مالیاتی لین دین پر اپنے دستخط ثبت کرتا تھا۔ جو ان کی قانونی حیثیت (توثیق) کے لیے ضروری سمجھے جاتے تھے۔ سرکار (ضلعی) خزانوں کے کھاتوں کی پڑتال کرتا تھا، مالگزاری (محصولات) کے تنازعات یا زمین کی ملکیت سے متعلق جھگڑوں کو طے کرتا تھا۔ شاہی فرامین پر اپنے دستخط کرتا تھا۔ وہ بادشاہ اور. عمر خان شیروانی جو جونڈ کی جنگ میں لودھیوں کے کمانڈر انچیف تھے۔ ان دنوں وزیر کے عہدے پر فائز نہیں تھے۔... قدیم اسلامی روایت کے مطابق بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ایک رابطے کا ذریعہ تھا۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ آیا چیف وزیر (وزیرِ مملکت یا ممالک) کے ماتحت کام کرنے والے نائب وزراء بھی تھے یا نہیں، یا پھر 'دستور' کا عہدہ موجود تھا جو کہ براہِ راست فارس (ایران) سے مستعار لیا گیا ایک خطاب تھا اور بابر نے اس کا تذکرہ 'سب سے بڑے وزیر' کے طور پر کیا ہے۔ لیکن چیف وزیر کی طرف سے اختیارات کی آگے منتقلی پر یقین کرنے کی وجہ موجود ہے، کیونکہ سلطان سکندر اور ابراہیم کے وزیر میاں بھوا، محکمہء انصاف (میر عدل) کے سربراہ بھی تھے۔ نہ ہی ہمیں یہ معلوم ہے کہ آیا شاہی اراضی (دیوانِ خالصہ) کے محصولات کے لیے اور تنخواہوں کے لیے (دیوانِ تن) الگ الگ وزراء موجود تھے۔ انتہائی مرکزی انتظامی مشینری کے پیشِ نظر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ محکمہء مال کی مختلف شاخیں سیکرٹریوں کے ذریعے کام کرتی تھیں۔ مشرفِ ممالک (مملکت)

بطور اکاؤنٹنٹ جنرل اور مستوفیِ ممالک بطور آڈیٹر جنرل یقیناً موجود تھے، جن کا تذکرہ آخری بار سید دور کے دوران ملتا ہے۔ سلطان کے مذہبی اوقاف، خیرات اور لگان سے آزاد زمینوں (مددِ معاش، ائمہ اور سیورغال جاگیروں) کی دیکھ بھال کے لیے 'صدر' کا عہدہ موجود تھا، کیونکہ لودھی حکمران غیر معمولی حد تک فیاض اور سخی تھے۔ بابر نے ہندوستان کی فتح کے کچھ ہی عرصے بعد شیخ زین کو اس عہدے پر فائز کیا تھا۔ دیوان کی ایک ماتحت شاخ کے طور پر 'نذر' اور 'پیشکش' (تحائف) کے لیے ایک الگ محکمہ بھی قائم تھا - بالخصوص سکندر روزانہ خزانے کے کھاتوں کی پڑتال کر کے اس پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ 'عریضِ ممالک' (مملکت) یا سرِ لشکر، جسے اکثر 'عماد الملک' کا خطاب دیا جاتا تھا- اور جو دیوان العرض یا "فوجی معائنہ کے دفتر" کا سربراہ ہوتا تھا-وزیر کے بعد دوسرا اہم ترین عہدیدار تھا۔ عریضِ ممالک کی اس کے دفتر میں معاونت 'نائبِ عرضِ ممالک' کرتا تھا۔ بہلول کے عہدِ حکومت میں یہ عہدہ دریا خان نوہانی کے رشتہ دار ایک امیر کے پاس تھا۔ ملک اودھو، حسین شاہ شرقی کا نائبِ عرض تھا جسے لودھیوں نے ۸۸۴ ہجری / ۱۴۷۹ء میں دریائے گنگا کی جنگ میں قید کیا تھا۔ عریضِ ممالک کابینہ اور جنگی کونسل کا ایک اہم رکن ہوتا تھا۔ اس کے فرائض موجودہ دور کے وزیرِ دفاع جیسے تھے اور اس کا تعلق فوج کو اکٹھا کرنے اور جنگی گولہ بارود کی فراہمی سے تھا۔ وہ فوجی رجسٹر کا نگران تھا جس میں فوجیوں کو زمینوں کی الاٹمنٹ کا ریکارڈ شامل ہوتا تھا، اور وہ شاہی افواج کا پے ماسٹر (تنخواہیں دینے والا) بھی تھا۔ ہمیں سلطان ابراہیم لودھی کے عہد میں اس عہدیدار کا تذکرہ 'بخشی' کے لقب سے ملتا ہے، جب ابراہیم لودھی نے کالپی میں اپنے بھائی جلال خان کی بغاوت کے موقع پر اپنے بخشیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ فوجیوں کو ایک ماہ کی پیشگی (ایڈوانس) تنخواہ ادا کریں۔ قیاس یہی ہے کہ یہ عہدہ سکندر لودھی کے دورِ حکومت میں 'بخشی گری' کے نام سے جانا جانے لگا۔ یہ عریض کا فرض تھا کہ وہ ان گھوڑوں اور جوانوں کا وقتاً فوقتاً معائنہ کرے جن کے نام پر تنخواہ نکالی جاتی تھی، اور نئے... نئے بھرتی ہونے والوں کی تنخواہ یا رتبہ طے کرنا [بخشی کا کام تھا]۔ ایک چیف بخشی (میر بخشی) کے ماتحت کئی بخشی کام کرتے تھے۔)

بخشی سلطنت کے چار بڑے عہدیداروں میں سے ایک تھا اور شاہی مجلسِ خاص میں اس کی نشست ہوتی تھی۔ ہر فوج کا ایک الگ بخشی ہوتا تھا۔ مہم ختم ہونے پر میر بخشی اس سے متعلقہ حساب کتاب کے اعداد و شمار دیوان کے دفتر میں جمع کرواتا تھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک سول افسر تھا جس کا کام خود جنگیں لڑنے کے بجائے جنگی وسائل اور رسد فراہم کرنا تھا۔

اگرچہ سلطان افواج کا سپہ سالارِ اعلیٰ ہوتا تھا- لیکن ایک مستقل سپہ سالار رکھنے کا رواج بھی قائم تھا- جو سلطان کی عدم موجودگی میں شاہی فوج کی بنیادی کمان سنبھالتا تھا، اور جب سلطان خود فوج کے ساتھ ہوتا تو وہ دوسرے نمبر پر کمانڈر (نائب سپہ سالار) کے طور پر کام کرتا تھا۔ چنانچہ ہم سنتے ہیں کہ میاں معروف فرملی، سلطان سکندر اور ابراہیم کے تیس سالہ دورِ حکومت میں سپہ سالارِ اعلیٰ تھے۔

دبیر، "دیوانِ الانشاء" کا سربراہ ہوتا تھا۔ وہ مقامی گورنروں اور آزاد حکمرانوں کو بھیجے جانے والے سلطان کے خطوط، شاہی فرامین اور اسناد کے مسودے تیار کرتا تھا اور سلطان کی منظوری کے بعد ان پر مہر لگاتا تھا۔ وہ صوبوں سے آنے والی خط و کتابت بشمول اشیاء کی قیمتوں کی فہرست کو خلاصے کی شکل میں سلطان کی پیشی میں لاتا تھا اور جوابات کے بارے میں ہدایات لیتا تھا۔

سلطان ہفتے کے مخصوص دنوں میں عام دربار (دیوانِ عام) میں انصاف فراہم کرتا تھا (سکندر لودھی یہ کام روزانہ کرتا تھا)۔ اس کا دربار ابتدائی سماعت کی عدالت کے ساتھ ساتھ اپیل کی سب سے بڑی عدالت کے طور پر بھی کام کرتا تھا، جہاں ہر وقت سائلین کو آنے کی اجازت تھی۔ سلطان کی عدم موجودگی یا دیگر مصروفیات کی صورت میں وکیل اس کے قائم مقام کے طور پر کام کرتا تھا۔ پیچیدہ عدالتی اور فوجداری مقدمات کی سماعت خود سلطان کرتا تھا۔ سکندر لودھی، جو الجھے ہوئے مقدمات کا فوری فیصلہ کرنے کی مہارت رکھتا تھا، نے ایک بار سلطنت کے تقریباً تمام جید علماء پر مشتمل ایک خصوصی عدالت قائم کی، جب بودھن (یودھن) نامی ایک برہمن پر مسلمانوں کے سامنے یہ اعلان کرنے کا الزام لگایا گیا تھا کہ "ہندومت اور اسلام دونوں سچے مذاہب ہیں"۔ درخواستیں حاجب کے ذریعے پیش کی جاتی تھیں-

جو فریقین کو سلطان کے فیصلوں سے بھی آگاہ کرتا تھا۔ لیکن عام طور پر قاضیوں کے ذریعے سلطان کسی خاص مقدمے کے فیصلوں سے باخبر رہتا تھا، جنہیں قانونی نکات اور نظائر تلاش کرنے میں مفتیانِ کرام کی مدد حاصل ہوتی تھی۔ جب قاضیوں میں اختلاف ہوتا، تو دارالحکومت اور اس کے باہر کے جید فقہاء سے قانونی نقطے کی وضاحت طلب کی جاتی تھی۔

عدالتِ عالیہ، جسے "دارالعدل" کہا جاتا تھا، میرِ عدل کے زیرِ نگرانی تھی۔ شاید میرِ عدل کے فرائض قاضی القضاۃ (چیف قاضی) جیسے ہی تھے، کیونکہ ہمیں لودھی دور میں چیف قاضی کی عدالت کا کوئی الگ ذکر نہیں ملتا۔

﴿امیر علی، ہسٹری آف دی ساراسینز ((Hist. of the Saracens، 418۔ اس کا تذکرہ پچھلے خاندانوں کے دور میں بھی کثرت سے ملتا ہے۔

موازنہ کریں: تاریخِ مبارک شاہی، ۱۸۳، ۲۰۱؛ طبقاتِ اکبری، جلد ۱، ۲۶۶۔﴾

لودھی دور کے دوران دارالحکومت میں [چیف قاضی کی عدالت کا کوئی الگ ذکر] نہیں ملتا۔ اس نئے لقب (میرِ عدل) کے تحت یہ عہدہ بہلول لودھی کی ایجاد تھا- جس کے دورِ حکومت میں ہمیں اس کی تخت نشینی کے سال ہی میں عماد الملک کی شکل میں پہلے 'میرِ عدل' کا ذکر ملتا ہے۔ لودھی عدلیہ سے متعلق سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ چیف جج (میرِ عدل) کا عہدہ کسی دوسرے عہدے کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ عماد الملک 'عارضِ ممالک' (وزیرِ دفاع / فوج کا سربراہ) بھی تھے- سکندر لودھی کے وزیر میاں بھوا اور ان کے بیٹے بھی میرِ عدل ہونے کے ساتھ ساتھ اسی نوعیت کے عہدے پر فائز تھے۔ شاید یہ حکمتِ عملی انتظامیہ کو مرکزی دھارے میں لانے اور عدلیہ کو بدعنوانی سے پاک کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔

سلطان کی طرح میرِ عدل بھی محض عدالت کا صدر ہوتا تھا جو صرف پیچیدہ مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا، جن کے فیصلے قاضی لکھتا تھا اور قانونی نکات کی وضاحت مفتیانِ کرام کرتے تھے۔ یہ 'دارالعدل' فوجداری اور

دیوانی دونوں طرح کے مقدمات کی سماعت کرتا تھا۔ سکندر لودھی، جو روزانہ دربار لگاتا تھا، پیچیدہ عدالتی مقدمات کے فیصلے خود کرتا تھا۔

محکمہ ڈاک

داروغہ ڈاک چوکی (جو عباسیوں کے دور کا صاحب البرید اور دیوانِ برید کا سربراہ کہلاتا تھا) انٹیلیجنس (خفیہ معلومات) کے شعبے کا سربراہ بھی ہوتا تھا۔ وہ باقاعدگی سے ڈاک کی روانگی کی نگرانی کرتا تھا-صوبوں میں پیش آنے والے واقعات، زراعت اور کسانوں کی حالتِ زار، مقامی حکام کے رویے، ٹکسالوں کی صورتحال اور ڈھالے گئے سونے اور چاندی کی مقدار کے بارے میں روزانہ رپورٹیں پیش کرتا تھا؛ نیز خفیہ پولیس کے ذریعے ملنے والی صوبائی پوسٹ ماسٹروں کی رپورٹوں کا خلاصہ تیار کرتا تھا۔

سلطان سکندر لودھی کے دور میں گھوڑاڈاک (گھوڑوں کے ذریعے ڈاک کی ترسیل) کا نظام دوبارہ بحال کیا گیا، اور گھوڑوں کی چوکیاں ہر وقت تیار رکھی جاتی تھیں جو ڈاک کو ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک پہنچاتی تھیں۔ سڑک کے کنارے مناسب فاصلوں پر چاروں طرف سے کھلے خیمے یا سائبان بنائے گئے تھے جو 'چوکی' کا کام دیتے تھے۔ اگر وہ زمین خالصہ (شاہی زمین) ہوتی تو وہاں کے عملے کی تنخواہ اور گھوڑوں کی دیکھ بھال کے اخراجات قریبی گاؤں سے وصول کیے جاتے تھے اور اگر وہ جاگیر ہوتی تو یہ اخراجات جاگیر دار سے لیے جاتے تھے۔

ڈاک کے ذریعے جاسوسی کا یہ نظام اس قدر کامیابی سے کام کرتا تھا اور سلطان ہر چھوٹے بڑے واقعے (یہاں تک کہ انفرادی امراء کے گھریلو معاملات) سے اس حد تک مکمل باخبر رہتا تھا کہ سادہ لوح لوگ یہ یقین کرنے لگے تھے کہ سلطان سکندر لودھی کے پاس ایک جادوئی چراغ ہے جس کے دو موکل (جنات) اسے تمام معلومات فراہم کرتے ہیں۔ سلطان ابراہیم کو اسلام خان (ابنِ اعظم ہمایوں خان شیروانی) اور ان کے اتحادیوں کے خلاف شاہی افواج کی فتح کی پہلی خبر اسی محکمہ ڈاک کے عملے کے ذریعے ملی تھی۔

دارالحکومت کے سب سے معزز اور اہم عہدوں میں سے ایک 'کوتوال' یعنی شہری پولیس کے سربراہ کا عہدہ تھا۔ حاجب کا نگرانِ اعلیٰ) سلطنت کا ایک اہم عہدیدار تھا۔ حاجب کے فرائض میں سائلین کی درخواستیں وصول کرنا تاکہ انہیں بادشاہ کی بارگاہ میں پیش کیا جاسکے - فریقین کو سلطان کے فیصلوں سے آگاہ کرنا، درباری تقاریب اور آداب کو منظم کرنا سلطان کے خصوصی سفیر کے طور پر کام کرنا شاہی فرامین پہنچانا، معززِ غیر ملکی مہمانوں کو شاہی دربار تک لانا، ان کے سفر کے لیے سہولیات فراہم کرنا اور شاید شاہی خاندان کے اندرونی اخراجات کا حساب کتاب رکھنا بھی شامل تھا۔ ہمیں یہ یقینی طور پر معلوم نہیں ہے کہ آیا لودھی دور میں کوئی 'حاجب الحجاب' (چیف حاجب) یا 'میر حاجب' ہوتا تھا یا نہیں، لیکن چونکہ ہمیں سکندر لودھی کے دربار میں چھ حاجبوں (حاجبِ خاص) کا ذکر ملتا ہے، اس لیے قیاس یہی ہے کہ مختلف حاجبوں کو سلطان کے مختلف ذاتی فرائض سونپے گئے تھے۔ باربک (Barbæk / نقیبِ خاص یا نگرانِ دربار) سلطان کی آمد کا اعلان کرتا تھا اور دیوانِ عام میں موجود لوگوں کو نظم وضبط بر قرار رکھنے کی ہدایت دیتا تھا۔ خاصہ خیل (سرِ خاصہ خیل) بادشاہ کے رسالے (گھڑ سوار رجمنٹوں) کا افسرِ اعلیٰ ہوتا تھا۔ (سرِ) جاندار، بادشاہ کے سوار باڈی گارڈز کے چھوٹے سے دستے (جاندار دستہ) کا انچارج افسر ہوتا تھا- جو بادشاہ کی جان کی حفاظت پر مامور تھے۔ وہ (بادشاہ کا باڈی گارڈ دستہ) اس وقت بادشاہ کی جان کی حفاظت کرتے تھے جب بھی بادشاہ سواری پر باہر نکلتا یا دربار لگاتا تھا۔ عام طور پر جانداروں کی دو ٹولیاں ہوا کرتی تھیں - جو بالترتیب دائیں اور بائیں جانب تعینات ہوتی تھیں۔ ہر سرکار (صوبے / ضلع) کے گورنر یا بڑے جاگیر دار کے پاس اپنے جاندار ہوتے تھے۔ محتسب، عوامی اخلاقیات کا نگران اور بازاروں کا سپرنٹنڈنٹ ہوتا تھا۔ محتسب کے فرائض میں شریعت کے ممنوعہ کاموں کو روکنا، یہ دیکھنا کہ نمازیں باقاعدگی سے ادا کی جارہی ہیں اور بدعات سے بچا جارہا ہے، جوئے کے اڈوں اور شراب خانوں کو مسمار کرنا، عوامی مقامات پر فحش حرکات اور ناپسندیدہ جگہوں پر جانے سے روکنا، غلط ناپ تول کو روکنا، اس بات کی نگرانی کرنا کہ اشیاء مقررہ قیمتوں پر فروخت ہوں - جعلی سکے بنانے کی روک تھام کرنا، عوامی

راستوں پر نجی مکانات یا بازاروں کے ناجائز قبضے کو ہٹانا، سر عام شراب کی فروخت پر پابندی لگانا، سودی لین دین کو روکنا، غلاموں اور بوجھ اٹھانے والے جانوروں کو ان کے مالکان کے ظلم و ستم سے بچانا اور بیواؤں کے لیے مناسب شوہر (رشتوں) کا انتظام کرنا شامل تھا۔ اگر مجرم فریق جرمانہ وغیرہ ادا کر کے اپنی غلطی کی تلافی کرنے پر راضی ہو جاتا، تو محتسب خود ایک جج کے طور پر بھی کام کرتا تھا اور اگر وہ انکار کرتا تو محتسب اسے باقاعدہ عدالت کے حوالے کر دیتا تھا۔

سلاطینِ لودھی کے ادارے

مرکزی حکومت کے عہدیدار

سید خاندان کے دور تک امیر کوہ (وزیرِ زراعت و تعمیراتِ عامہ) ایک اہم سرکاری افسر تھا۔ سلطان محمد تغلق نے شروع میں یہ عہدہ قحط کے دنوں میں کھیتی باڑی کو فروغ دینے کے لیے بنایا تھا۔ بعد میں یہ ایک مستقل ادارہ بن گیا اور لودھی بادشاہوں کے زمانے میں بھی قائم رہا۔

امیر کوہ کی ذمہ داریاں یہ تھیں:

بڑی نہروں اور پانی کی گزرگاہوں کی تعمیر اور دیکھ بھال کرنا (جبکہ چھوٹی نہروں کا کام مقامی انتظامیہ کے ذمے تھا)۔

بنجر زمینوں کو آباد کر کے کاشتکاری کو بڑھاوا دینا۔

فصلیں خراب ہونے پر کسانوں کو نقد قرضے یا بیج دے کر ان کی مدد کرنا۔

دربار کے دوسرے افسران، جن کا اثر و رسوخ تو زیادہ نہیں تھا لیکن ان کے کام طے شدہ تھے، یہ تھے:

آخور بیگ (یا امیر آخور): شاہی اصطبل (گھوڑوں کے تھان) کا انچارج۔

شحنۂ پیل: شاہی ہاتھیوں کا نگران۔

سلحدار (یا سرِ سلحدار): بادشاہ کا خاص ہتھیار بردار۔

میر عمارت: شاہی عمارتوں کا نگران۔

میر شکار (یا شکار بیگ): شاہی شکار کا انچارج۔

دوات دار: بادشاہ کی دوات اٹھانے والا اور شاہی مہروں کا محافظ۔

قرآن خوان: شاہی قاری۔

کتاب دار: شاہی لائبریری کا انچارج جو سلطان کو کتابیں پڑھ کر سناتا تھا۔

جامہ دار: بادشاہ کے کپڑوں کا محافظ۔

منجم (درباری نجومی) سے ہمیشہ بادشاہ کی تاج پوشی یا جنگی مہمات کے لیے مبارک وقت معلوم کرنے اور فتح و شکست کی پیشگوئی کے لیے مشورہ لیا جاتا تھا۔ لودھی سلاطین کے دور میں یہ عہدہ عام طور پر ہندو برہمنوں کے پاس ہوتا تھا۔

شاہی حرم اور کارخانے

حرم (خواتین کے محل) کے اندرونی حصے کی حفاظت خاتون 'داروغہ' اور مسلح خواجہ سرا کرتے تھے، جن کا سربراہ 'سراپردہ دار' کہلاتا تھا۔ حرم کے باہر اور محل کے دروازوں پر باقاعدہ فوجی پہرہ دیتے تھے۔ حرم کے اندر حساب کتاب کا ایک الگ دفتر تھا جسے خاتون کلرک چلاتی تھیں۔

مختلف شاہی کارخانے بشمول 'ٹکسال' (جہاں سکے بنتے تھے) داروغوں کی نگرانی میں کام کرتے تھے، اور اس پورے نظام کی دیکھ بھال دیوان (مرکزی وزارت) کا ایک افسر کرتا تھا۔ اس دور میں 'میر ساماں' یا 'خانِ ساماں' اور غلاموں کے محکمے کے سربراہ 'امیر غلماں' کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ بحری یا کشتیوں کا محکمہ بہت چھوٹا تھا، جو صرف فوجیوں، ان کے سامان اور جنگی مواد کو ندی پار کرانے یا عارضی پل بنانے کے کام آتا تھا۔

صوبائی حکومت

تیمور کے حملے کے بعد ملک میں پھیلی افراتفری کی وجہ سے بعد کے تغلق بادشاہوں کے دور میں سلطنت کا انتظامی نظام پوری طرح تباہ ہو چکا تھا۔ سید حکمرانوں نے اسے ٹھیک کرنے کی مخلصانہ کوشش کی۔ بنگال، جونپور، مالوہ اور گجرات کے آزاد ہو جانے سے سلطنت کا رقبہ اور وسائل بہت کم ہو چکے تھے، اور اس چھوٹے سے علاقے میں بھی مرکزی حکومت کی طاقت نہ ہونے کے برابر تھی۔

سرکاری زمینیں بہت گھٹ چکی تھیں کیونکہ پچھلے راجوں نے اندھا دھند جاگیریں (اقطاع) بانٹ دی تھیں۔ ان جاگیروں کے مالکان (مقاطع یا امراء) اپنے علاقوں میں آزاد راجاؤں کی طرح حکومت کرتے تھے اور اپنے مرکزی بادشاہ کی کھلم کھلا نافرمانی کرتے تھے۔ بادشاہ کو انہیں قابو کرنے کے لیے مسلسل اپنی طاقت اور وسائل لگانے پڑتے تھے، اور بادشاہ کی فوجی کامیابی کے بعد بھی ان کی وفاداری کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا تھا۔ ایسے حالات میں ایک منظم حکومت کی امید صرف مضبوط اور طاقتور صوبائی سلطنتوں میں ہی کی جا سکتی تھی۔

دہلی کے ماتحت علاقوں میں بڑی صوبائی اکائیوں کو 'ولایت' (جو غالباً سرکار تھے) کہا جاتا تھا، جیسے اٹاوا، بیانہ، لاہور اور ملتان۔ علاقوں کی چھوٹی تقسیمات کو 'خطہ'، 'عرصہ' اور 'شق' کہا جاتا تھا جو 'شق دار' کے ماتحت ہوتی تھیں۔ عام طور پر ایک 'شق' کئی 'پرگنوں' (اضلاع) کا مجموعہ ہوتی تھی۔

مثال کے طور پر:

میاں دوآب کا علاقہ لودھی، سوری اور مغل دور میں ایک 'سرکار' تھا اور اسے 'شق' بھی کہا جاتا تھا۔

غزنی سے لے کر ملتان کی سرحدوں تک کا علاقہ بھی ایک 'شق' تھا۔

اس کے علاوہ حصار فیروزہ، سنبھل، کول (علی گڑھ)، بیانہ اور بدایوں وغیرہ کی شقیں بھی موجود تھیں۔

اگرچہ ان شقوں کے گورنروں کو 'شق دار' کہا جاتا تھا، لیکن میاں دوآب کے شق دار کو 'فوجدار' (ملٹری کلیکٹر) کہا جاتا تھا، جو وہاں کا سب سے بڑا فوجی اور انتظامی افسر تھا۔ ان دنوں یہ سب سے اہم صوبائی

گورنری تھی کیونکہ اس علاقے میں دارالحکومت واقع تھا، یہ مشرقی اضلاع کی طرف جانے والا اہم راستہ تھا، اور یہی وہ واحد سرکاری زمین تھی جہاں سلطان کا کچھ کنٹرول تھا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں دوآب کی یہ شق محمود تغلق نے دولت خان لودھی کو اور خضر خان نے اختیار خان کو دی تھی۔

ولایات (صوبے) دراصل 'سرکار' تھے جو والیوں، حاکموں یا نائبوں کے ماتحت ہوتے تھے۔ تاہم، یہ حکام اکثر ان طاقتور جاگیرداروں کے سامنے دب جاتے تھے جن کے پاس بطور جاگیر کئی کئی پرگنے ہوتے تھے۔

یہ سلطان سکندر لودھی ہی تھا جس نے پرانی صوبائی سرحدوں کو نئے سرے سے ترتیب دے کر صوبائی انتظامیہ کو دوبارہ زندہ کیا۔ اس کام کا آغاز اس کے والد (بہلول لودھی) نے کیا تھا، جنہوں نے اپنے فتح کیے گئے ہر پرگنے میں شق دار مقرر کیے، لیکن جو علاقے جنگ کے ذریعے حاصل نہیں ہوئے تھے وہاں انہوں نے پرانے انتظامی حصوں کو ویسے ہی رہنے دیا۔ ان کے دور میں سنبھل، اٹاوا اور لاہور جیسے سرکاروں کا ذکر ملتا ہے، لیکن صوبائی نظام کی مکمل اصلاح سکندر لودھی کی پالیسیوں سے ہی ممکن ہو سکی۔

افغان سلاطین کا اپنے بیٹوں کو جاگیریں عطا کرنا اور اور رشتہ داروں کے لیے خود مختار علاقے (اقطاع) قائم کرنا ایک منظم اور مرکزی حکومت کی طرف بڑھتے قدم کے بالکل برعکس تھا۔ ایک منظم نظامِ حکومت اس وقت تک وجود میں نہ آسکا جب تک ان خود مختار علاقوں کا خاتمہ نہیں ہو گیا- سرکش گورنروں نے اطاعت قبول نہیں کر لی اور جونپور کی سلطنت کا حتمی الحاق مکمل نہیں ہو گیا۔ سرکاروں اور پرگنوں کے ذریعے حکومت کا یہ نظام سید خاندان کی طرف سے لودھیوں کو ورثے میں ملا تھا اور یہ مغلوں اور سوریوں کے دورِ حکومت میں بھی برقرار رہا۔

پوری سلطنت کو سرکاروں میں تقسیم کیا گیا تھا جو کہ کم و بیش برطانوی ہندوستان کے 'ڈویژنوں' کے برابر تھیں، اور یہ رقبہ یقیناً موجودہ اضلاع سے بڑا تھا۔ صوبائی انتظامیہ کا ایک مکمل ڈھانچہ نعمت اللہ کے ایک ہی جملے میں ملتا ہے جو آگرہ کی بنیاد رکھنے کے سلسلے میں ہے۔ وہ عبارت یہ ہے:

"چنانچہ بیانہ سرکار کے پرگنہ ڈولی (دیولی) کے دیہات باشی اور پویامیں یہ شہر تعمیر کیا گیا اور بیانہ سرکار کے کل باون (۵۲) پرگنوں میں سے ۹ پرگنے اس میں (یعنی آگرہ کی سرکار میں) شامل کر دیے گئے۔"
بابر نے اپنی توزک (توزکِ بابری) میں سرکاروں کا مفصل احوال ان سے حاصل ہونے والے محصول (ریونیو) سمیت بیان کیا ہے۔ ابراہیم لودھی کے دورِ حکومت کے ابتدائی حصے میں کل ۳۲ سرکاریں تھیں۔ یہ سرکاریں درج ذیل تھیں:

سرہند

حصار فیروز

دہلی اور

میانِ دوآب

ترنس ستلج سرکار بمعہ بھیرا، لاہور، سیالکوٹ اور دیپالپور

ملوٹ

بیانہ

آگرہ

گوالیار (سلطان ابراہیم کے الحاق کے بعد)

میانِ ولایت، وسطی علاقے (ایٹاوا)

کالپی اور سیہونڈہ (موجودہ ضلع باندا)، ریوا

قنوج

سنبھل

لکھنؤ اور بکسر (ضلع اناؤ)

خیر آباد

اودھ اور بہرائچ

جونپور

کڑہ اور مانک پور

سرور (گورکھپور)

بہار

سارن

چمپارن

کانڈلا

ترہت

رنتھمبھور

ناگور

کالنجر

سوئی سوپار (موجودہ ریاست گوالیار میں)

۲۸۔چندیری (سکندر کے عہد میں ایک باجگذار ریاست تھی اور ابراہیم نے اسے سلطنت میں شامل کیا) رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑی سرکار تھی اور اس میں پہاڑی علاقے بھی شامل تھے، بہلول کے وقت کے حوالے سے ملاحظہ ہو:

﴿طبقاتِ اکبری، جلد ۳، صفحہ ۴۴۹۔

(۲) فرشتہ، جلد ۱، ۱۸۵ اور ۱۸۶؛ عبد اللہ، ایلیٹ، جلد ۴، ۴۶۶۔)﴾

نروار (سکندر نے اسے الحاق کیا)

میرٹھ

منڈلائر (موجودہ ریاست کرولی)

کٹھیر (روہیل کھنڈ)

ان انتظامی تقسیمات کو عام زبان میں 'ولایت' بھی کہا جاتا تھا- یہ ایک ایسی اصطلاح تھی جو کثرت سے گجرات اور مالوا جیسے خود مختار علاقوں کے لیے استعمال ہوتی تھی اور ان کے منتظمین کو 'حاکم' (ایک عام لقب جو پرگنہ کے انتظامی سربراہ کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا) یا 'والی' کہا جاتا تھا۔ سرکار کے گورنروں کا اصل لقب 'نائب' تھا، جو کہ 'نائبِ سلطان' (سلطان کا نائب یا قائم مقام) کا مخفف تھا۔

اودھ، سارن، چندیری اور کٹھیر (روہیل کھنڈ) کے گورنروں کو 'ضابط' کا نام دیا گیا تھا، جس کی وجہ غالباً وہاں زمینداروں کی موجودگی اور ان علاقوں کا سرحدوں پر واقع ہونا تھا، جس کی وجہ سے وہاں فوجی چھاؤنیاں رکھنا ضروری تھا۔ سرکاروں کے تقریباً تمام گورنر بڑے افغان امراء تھے - جن کے پاس 'منصب' یا فوجی عہدے ہوتے تھے، یعنی وہ اتنے سواروں (گھڑ سوار فوجیوں) کے کمانڈر ہوتے تھے جس سے ان کی تنخواہ کا تعین ہوتا تھا۔

سرکار کی حکومت مرکزی حکومت کا ہی ایک چھوٹا روپ (عکس) تھی۔ 'نائب' یا سرکار کے گورنر سرکار کے انتظامی سربراہ ہوتے تھے جن کے فرائض میں پرگنہ کے 'شقداریوں' کی نگرانی کرنا، سلطان کے فرامین کو نافذ کرنا، فوج رکھنا اور مسلح خدمات فراہم کرنا شامل تھا۔

﴿(۱) عباس، ایلیٹ، جلد ۴، ۳۳۲؛ بدایونی، جلد ۱، ۳۰۹۔

(۲) مخزن، ایم۔ یو۔ ایم ایس، ۱۰۷۔

(۳) یادگار، بہار ۲۸۔

(۴) دیکھیے فرشتہ، جلد ۱، لکھنؤ ۱۷۹؛ بابر نامہ، مسز بیوریج، جلد ۲، ۵۸۲، ۶۶۲۔﴾

... اس کے ساتھ ساتھ جب بھی سلطان کو ضرورت ہو اسے مدد فراہم کرنا شامل تھا- اپنے دائرہ اختیار میں بغاوتوں کو کچلنا، پرگنوں کے درمیان سرحدی تنازعات طے کرنا، اور قاضیوں کے فیصلوں کے

خلاف اپیل کی سماعت کرتے ہوئے انصاف فراہم کرنا اور ابتدائی عدالت (عدالتِ اول) کے طور پر کام کرنا؛ اس بات کو یقینی بنانا کہ مذہبی قانون کے تحت مقرر کردہ ٹیکسوں کی وصولی انصاف کے ساتھ کی جائے، اور اس امر کی نگرانی کرنا کہ فوجداری انصاف غیر جانبداری سے فراہم کیا جارہا ہے۔

اسے مالیاتی امور (محصولات) پر کوئی اختیار حاصل نہیں تھا، سوائے اس کے کہ وہ ٹیکسوں کی وصولی اور انتظامیہ کے ہموار کام کاج کے لیے سہولیات فراہم کرے اور نہ ہی اسے اپنے دائرہ اختیار کے تحت شقداروں اور دیوانوں کے تقرر یا برطرفی کا کوئی حق حاصل تھا۔

سرکار (ضلع) میں مالیاتی انتظامیہ 'دیوان' کے سپرد تھی جو گورنر کا ماتحت نہیں ہوتا تھا، بلکہ دونوں اپنے اپنے دائرہ کار میں خود مختار اختیار رکھتے تھے اور ایک دوسرے کے طرزِ عمل پر نظر رکھتے تھے۔ سرکار کے دیوان کا تقرر مرکزی حکومت، بلکہ خود سلاطین کرتے تھے اور وہ محصولات یا اس کا تخمینہ براہِ راست مرکزی خزانے کو بھیجتے تھے۔ دیوان بنیادی طور پر بادشاہ کا ملازم ہوتا تھا۔

بابر نے، جس نے لودھی سلاطین کے انتظامی نظام کو جوں کا توں برقرار رکھا- بہار کی دیوانی اپنے ایک جرنیل مرشد عراقی کے سپرد کی اور دہلی سرکار کی دیوانی محمد دوست کو دی۔ سرکار کے دیوان کو پرگنہ کے مالیاتی افسران پر نگرانی کا اختیار حاصل تھا اور وہ غبن یا دھوکہ دہی کو روکنے کے لیے پرگنہ کے خزانوں کے کھاتوں کی جانچ پڑتال کرتا تھا۔ سرکار کے دیوان کے ساتھ اس کے ماتحت ملازمین منسلک تھے، جیسے مشرف (اکاؤنٹنٹ / محتسبِ حسابات)، مستوفی (آڈیٹر / پڑتالیہ)، اور کلرکوں کی ایک بڑی تعداد سرکار کے دیگر عہدیداروں میں بخشی (فوج کا تنخواہ بانٹنے والا)، قاضی (فوجداری قانون کا جج)، کوتوال (شہری پولیس کا سربراہ)، اور محتسب (عوامی اخلاقیات کا نگران اور بازاروں کا داروغہ) شامل تھے۔ اس طرح سرکار کی حکومت اپنے آپ میں مکمل تھی۔

پرگنہ کو انتظامی اکائی بنانے کی شروعات بہلول (لودھی) نے کی تھی اور اسے سکندر لودھی نے مکمل کیا۔ شق یا پرگنہ ایک مالیاتی اکائی تھا جو کئی دیہاتوں پر مشتمل ہوتا تھا اور اس کے گورنر کو 'شقدار' کہا جاتا

تھا۔ وہ اپنے دائرہ اختیار کا انتظامی سربراہ، فوج کا قائد، اور ایک محدود علاقے کا گورنر ہوتا تھا۔ وہ پرگنہ کی پولیس کا سربراہ ہوتا تھا، جس کی ذمہ داری امن و امان قائم رکھنا، ڈکیتی اور جرائم کو سزا دینا، اور چھوٹی موٹی بغاوتوں کو کچلنا تھا۔ وہ زراعت کو فروغ دیتا اور لگان (زمین کے محصول) کی وصولی میں مدد فراہم کرتا تھا۔ شقدار ایک فوج بھی رکھتا تھا اور اس فوج کے اخراجات کے لیے اسے جاگیر دی جاتی تھی۔ پرگنہ کے دیگر عہدیدار درج ذیل تھے:

عامل: محصولات (لگان) اکٹھا کرنے والا، جس کا واسطہ مرکزی یا صوبائی دیوان سے ہوتا تھا۔

فوتہ دار یا خزانچی: پرگنہ کا کیشئیر / خزانچی۔

داروغہ: خزانے کا سپرنٹنڈنٹ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ داروغہ وہی فرائض انجام دیتا تھا جو دارالحکومت یا سرکاروں میں 'مشرف' کے ہوتے تھے۔

کارکن: یعنی کلرک۔ پرگنہ کے دیگر چھوٹے افسران میں امین، قانونگو، منصف، تھانیدار اور پٹواری شامل تھے۔ تقریباً ہر بڑے پرگنہ کے قصبے کا اپنا قاضی ہوتا تھا۔

دیہاتوں کی خودمختاری کو بالکل نہیں چھیڑا گیا۔ دیہاتی پنچائتیں یا برادری کی عدالتیں ثالثی بورڈز کے ذریعے مقامی مقدمات کا فیصلہ کرتی تھیں، اور کم سنگین نوعیت کے دیوانی و فوجداری مقدمات میں جرمانے عائد کرتی تھیں۔ اگرچہ کسی عدالتی فیس کا مطالبہ نہیں کیا جاتا تھا اور انصاف بہت جلد مل جاتا تھا، پھر بھی دیہاتی اپنے مقدمات کو برادری کی عدالتوں میں لے جانے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس کی وجہ وہ فاصلہ تھا جو ان کے علاقے کو شہر میں قاضی کی عدالت سے الگ کرتا تھا، اور یہ بھی کہ انہیں سرکاری عدالت کے چھوٹے ملازمین کی مٹھیاں گرم کرنے کے لیے کچھ پیسوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ ان کے علاوہ زمینداروں کی عدالتیں بھی تھیں جو ان کے مزارعین (کاشتکاروں) کے لیے کھلی رہتی تھیں۔ وہ کڑی جو مرکزی حکومت کو مقامی حکومتوں سے جوڑتی تھی – وہ جاسوسی کا ادارہ (خفیہ نظام) تھا جو انتہائی خوفناک حد تک مستعدی سے کام کرتا تھا– اور اسی کی وجہ سے دہلی اور آگرہ جیسے بڑے شہروں میں پولیس اس کے

تابع تھی- سربراہ کو کوتوال (یاشاہنہ) کہا جاتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا اور عزت دار عہدہ ہوتا تھا- یہاں تک کہ بعض اوقات کوتوال کو ترقی دے کر وزیر بھی بنا دیا جاتا تھا۔ کوتوال کے اہم کام: امن و امان قائم کرنا تھا- اس کا بنیادی کام شہر کی حدود میں چوری، ڈکیتی اور لڑائی جھگڑوں کو روکنا تھا۔ پولیس رات کا گشت اور جاسوسی کرتی تھی۔ وہ اپنے جاسوسوں کے ذریعے خفیہ معلومات اکٹھی کرتا تھا- کوتوال رات گئے خود شہر کی گلیوں میں گشت کرتا تھا تاکہ مجرموں یا مشکوک افراد کو پکڑ سکے۔ اس کے علاوہ شہر میں آنے والے ہر نئے بندے پر بھی نظر رکھتا تھا۔ عدالت اور جیل کے معاملات: وہ بے گناہ لوگوں کو رہا کرتا تھا، مجرموں کو قاضی (جج) کی عدالت میں پیش کرتا تھا- سیاسی قیدیوں کو اپنی تحویل میں رکھتا تھا اور بادشاہ یا قاضی کے حکم پر موت کی سزا پر عمل درآمد کرواتا تھا۔ کوتوال کا دائرہ اختیار صرف شہر تک محدود ہوتا تھا۔ قصبوں اور دیہاتوں کی پولیس (تھانیدار اور چوکیدار) شہروں سے باہر دیہی علاقوں اور چھوٹے قصبوں میں نظامِ امن کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا- چھوٹے شہروں اور اہم دیہی علاقوں میں پولیس کی چوکیاں ہوتی تھیں جنہیں تھانہ کہا جاتا تھا۔ وہاں کا انچارج تھانیدار ہوتا تھا- جو امن و امان قائم رکھتا تھا اور ضرورت پڑنے پر سرکاری لگان (ٹیکس) اکٹھا کرنے میں بھی مدد کرتا تھا۔ یہ تھانیدار اپنے علاقے کے بڑے افسر، جسے شِق دار کہتے تھے کے ماتحت ہوتے تھے۔ دیہی چوکیدار: عام دیہاتوں میں حفاظت کی ذمہ داری مقامی چوکیداروں پر ہوتی تھی۔ یہ سرکاری ملازم نہیں ہوتے تھے، بلکہ گاؤں کے لوگ خود انہیں رکھتے تھے اور گاؤں کی زمین یا فنڈز سے ہی ان کا خرچہ چلاتے تھے۔ خطرناک اور باغی علاقے اگر کوئی علاقہ بہت زیادہ پر امن نہ ہوتا یا وہاں بغاوت کا خطرہ ہوتا تو سلطان وہاں عام پولیس نہیں بھیجتا تھا۔ ایسے علاقوں کا کنٹرول طاقتور پٹھان (افغان) سرداروں اور ان کے لشکروں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ ان سرداروں کو وہاں جاگیریں (زمینیں) دی جاتی تھیں، اور بدلے میں وہ اپنی فوجی طاقت کے ذریعے وہاں امن و امان بحال رکھتے تھے اور بغاوتوں کو کچلتے تھے۔

فوج، باقاعدہ دستے، جاگیر دار اور امراء

فوج دو طرح کے دستوں پر مشتمل ہوتی تھی: ایک باقاعدہ بھرتی شدہ سپاہی جن کا خرچہ سلطنت اٹھاتی تھی اور جنہیں جاگیریں دی جاتی تھیں اور دوسرے غیر مستقل دستے جو صوبہ داروں اور جاگیر داروں کی طرف سے فراہم کیے جاتے تھے اور جن کا ساز و سامان اور تنخواہ وہی ادا کرتے تھے۔ باقاعدہ فوج مختلف افغان قبیلوں، راجپوتوں اور میواتیوں پر مشتمل تھی جبکہ سلطان اور شہزادوں کی ذاتی ملازمت میں مغلوں کا ایک دستہ بھی شامل تھا۔ فوج کی بھرتی 'میر بخشی' (بخشیِ ممالک) کے ذریعے کی جاتی تھی۔ جس کا عہدہ وزیرِ جنگ کی مانند ہوتا تھا اور اس کی معاونت نائب بخشی کرتا تھا۔ وہ فوج کے تنخواہ دار (پے ماسٹر) کے طور پر ایک دوہرا کردار بھی ادا کرتا تھا اور اس حیثیت میں وہ تاج و تخت کا ایک سول افسر ہوتا تھا۔ سکندر لودھی نے سپاہیوں کو جاگیریں دینے کا طریقہ اپنایا اور ان سے کہا کہ وہ اپنے گھوڑے اور ہتھیار اپنی جاگیروں ہی سے حاصل کریں۔

باقاعدہ فوج فیل سواروں (ہاتھیوں)، رسالے (گھڑ سواروں)، پیادہ فوج، بندوقچیوں، تیر اندازوں اور توپ خانوں پر مشتمل ہوتی تھی، اور جنگ کے وقت یہ ایک سپہ سالار (کمانڈر ان چیف) کے ماتحت کام کرتی تھی، جو بادشاہ کی میدانِ جنگ میں ذاتی موجودگی کے دوران جنگ کا سب سے بڑا مشیر ہوتا تھا۔ چنانچہ قطب خان لودھی بہلول لودھی کے سپہ سالار تھے - میاں معروف نے سلطان سکندر اور ابراہیم لودھی کے عہدِ حکومت میں ۳۰ سال تک اس عہدے کے فرائض انجام دیے، اور اعظم ہمایوں خان شیروانی سلطان ابراہیم لودھی کے سپہ سالار تھے۔ اس عہدے پر فائز شخص کو 'امیر الامراء' کہا جاتا تھا۔ دس سپاہیوں پر مقرر افسر کو 'میر دہا' یا 'میر دہا' کہا جاتا تھا، سو سپاہیوں کے افسر کو 'صدی' اور ایک ہزار کے افسر کو 'ہزاری' کہا جاتا تھا۔ یہ لقب اب بھی کئی بنگالی خاندانوں کے ناموں کے ساتھ جڑا ہوا ہے جو بگڑ کر 'میر دھا' یا 'مریدھا' بن گیا ہے۔

سلطان کی مستقل کھڑی فوج کا قطعی اندازہ اعداد و شمار میں لگانا مشکل ہے۔ بہلول لودھی کے چچا اور سرہند کے گورنر اسلام خان لودھی کے پاس ۱۲ ہزار افغان اور مغل سپاہی تھے۔ سلطان ابراہیم لودھی نے پانی پت کی جنگ میں تقریباً ۱,۰۰,۰۰۰ سپاہیوں کی کمانڈ کی تھی، جن میں باقاعدہ فوج اور جاگیر دارانہ لشکر (ملیشیا) دونوں شامل تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ سلطان کی مستقل فوج ۵۰ ہزار سے بہت زیادہ نہیں تھی۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ لودھی سلاطین نے جعلی یا دھوکے پر مبنی حاضریوں کو روکنے کے لیے گھوڑوں کو داغنے کی رسم دوبارہ شروع کی تھی یا نہیں۔ سکندر لودھی خود بھرتی ہونے والوں کا معائنہ کرتا تھا- تاکہ ان کا مرتبہ اور تنخواہ متعین کی جا سکے۔ کسی کم ذات یا ادنیٰ شخص کو اس کی ملازمت میں آنے کا کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔

بہلول لودھی کی خدمت میں تین راجپوت جرنیل شامل تھے۔ یہاں تک کہ کٹر مذہبی سکندر لودھی کے پاس بھی رائے جگر سین کچھواہا نامی جرنیل موجود تھا۔

جاگیر دارانہ نظام اور صوبہ دار

فوج کا بڑا حصہ جاگیر دارانہ لشکر پر مشتمل تھا۔ ہر مقامی صوبہ دار اور جاگیر دار (جس میں دربار کے کئی امراء بھی شامل تھے) سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ اپنے رتبے یا 'منصب' کے مطابق گھڑ سواروں کا ایک دستہ رکھے، جس سے اس کی تنخواہ کا تعین ہوتا تھا۔

بہار سرکار کے گورنر دریا خان لوحانی، غازی پور (سرکار) کے گورنر نصیر خان لوحانی، اور اودھ (سرکار) کے گورنر شیخ زادہ محمد قربان فرملی ۳۰ سے ۴۰ ہزار کا منصب رکھتے تھے۔ کالپی سرکار کے گورنر اعظم ہمایوں شیروانی ۱۲ ہزار اور بھکھن خان ۷ ہزار کا منصب رکھتے تھے۔ صوبائی گورنروں کو ان کے فوجی رتبے کے مطابق سرکار کے خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ پوری فوج جنگی مالِ غنیمت میں حصہ پاتی تھی اور مہم ختم ہوتے ہی اسے تحلیل کر دیا جاتا تھا۔

جیسے ہی بادشاہ نے انہیں جانے کی اجازت دی۔ جاگیر داروں اور گورنروں کے ہاتھوں میں فوجی طاقت کا مرکوز ہونا ریاست کے لیے طاقت کے بجائے کمزوری کا باعث تھا، جس نے مرکز گریز (علیحدگی پسند) اور مرکز مائل (اتحاد پسند) قوتوں کے درمیان ایک مستقل رسہ کشی کو جنم دیا۔ اس کشمکش کا سب سے برا نتیجہ سلطان ابراہیم لودھی کے دورِ حکومت میں سامنے آیا۔

فوج کی روانگی یا متحرک ہونے کا حکم سرخ خیمے نصب کر کے اور نقارے (ڈھول) بجا کر دیا جاتا تھا۔ سفر کے دوران ایک ہراول دستہ (آگے چلنے والی ٹولی) راستے کی رہنمائی کرتا تھا اور رات کے وقت پڑاؤ ڈالنے کے بعد، فوجی کیمپ ایک شہر کی وسعت اختیار کر لیتے تھے۔ سامانِ سفر ذخائر، خیمے اور سلطان کے خاندان کی خواتین پیچھے رہتی تھیں- اناج کی فراہمی گھومنے پھرنے والے اناج کے تاجروں یعنی 'بنجاروں' کے ذریعے کی جاتی تھی۔

جنگی حکمتِ عملی اور صف بندی

جنگی صف بندی روایتی طور پر پانچ حصوں پر مشتمل ہوتی تھی: ہراول دستہ (آگے کا حصہ)، دایاں حصہ، بایاں حصہ، وسط (مرکز) اور عقب (پیچھے کا حصہ)۔ کبھی کبھی مختلف افغان قبیلے دائیں، بائیں یا وسط میں اپنی پوزیشن لیتے تھے اور پوری فوج کی کمان سپہ سالار (کمانڈر ان چیف) کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ حملے اور دفاع کا بنیادی ذریعہ گھڑ سوار فوج اور تیر اندازوں کو اٹھائے ہوئے ہاتھی ہوا کرتے تھے، کیونکہ ان دنوں توپ خانہ کمزور اور سست رفتار تھا۔ سپہ سالار یا سلطان وسط میں ایک ہاتھی پر سوار ہو کر اپنی پوزیشن لیتا تھا، جو اکثر دشمن کے حملے کا نشانہ بنتا تھا اور جس کی فرار معذوری یا موت جنگ کے فیصلے کا تعین کرتی تھی۔ کسی قلعے کے محاصرے میں پتھر اور راکٹ پھینکنے کے لیے گوپھن اور غلایل نما مشین کا استعمال کیا جاتا تھا؛ جبکہ دیواروں کو توڑنے کے لیے تپکیں مارٹر، توپ خانہ اور بارود استعمال ہوتا تھا۔ جنگی آلات، فوجی حکمتِ عملی اور تربیت نے انسان کی بہتر ہوتی ہوئی ایجادات کے ساتھ قدم نہیں ملایا، اور اس کا کھلا پن اس وقت ثابت ہو گیا-جب ۱۲ ہزار مغلوں نے ۱ لاکھ ہندوستانیوں کو شکست دے دی۔

جنگ کا آغاز عام طور پر ایک چھوٹی جھڑپ سے ہوتا تھا پھر دونوں فریق رات کے وقت آرام اور تازہ دم ہونے کے لیے پیچھے ہٹ جاتے تھے - لیکن رات کا حملہ (شب خون) ہمیشہ دشمن کی طاقت کو پرکھنے کا ایک بہت مؤثر طریقہ سمجھا جاتا تھا۔ یرغمال بنانے کا رواج بہت عام تھا اور جنگی قیدیوں خاص طور پر اعلیٰ کمانڈروں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔ جونپور میں قید قطب خان لودھی کی دیکھ بھال حسین شاہ شرقی کی والدہ بی بی راجی نے کی تھی۔ بہلول (لودھی) نے ایک بار حسین شاہ کی بیوی بی بی ملکہ جہاں کو جو جنگ میں اسیر ہوئی تھیں، ان کے شوہر کے پاس پہنچا دیا تھا۔ کسی سفیر کے تحفظ کی خلاف ورزی کا واحد واقعہ ہمیں اس وقت ملتا ہے جب سلطان ابراہیم لودھی نے لاہور کی فتح کے بعد آگرہ بھیجے گئے بابر کے سفیر کو قید کر لیا تھا۔

مال گزاری (لینڈ ریونیو) کا انتظام

ریاست کی آمدنی کے ذرائع درج ذیل تھے:

خراج: لگان یا زمین کا ٹیکس۔

زکوٰۃ اور صدقہ: یعنی شرعی صدقات۔

خمس: یعنی مالِ غنیمت، معدنیات کی پیداوار اور چراگاہوں کا پانچواں حصہ۔

جزیہ: غیر مسلموں سے فوجی خدمت کے عوض لیا جانے والا ٹیکس۔

خراج / نذرانہ: ماتحت راجوں اور رائیوں (مقامی حکمرانوں) کی طرف سے دیا جانے والا نذرانہ۔

اور آبکاری (ایکسائز)، منڈی کے محصولات، منڈی کے کرائے، اور ان کے علاوہ قدیم زمانے سے چلے آنے والے متعدد 'ابواب' (مروجہ ٹیکس) یا غیر قانونی چنگیاں۔ کھیت کی اضافی پیداوار، مویشیوں، ذخائر، سونے اور چاندی پر زکوٰۃ اسلام کے مقرر کردہ طریقہ کار کے مطابق نافذ کی جاتی تھی۔ ان دنوں جب سپاہ گری کو ایک معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا اور فوجیوں کو زیادہ تر جاگیروں کی شکل میں تنخواہ دی جاتی تھی، مالِ غنیمت ایک بڑی کشش تھا۔ بہلول نے روہ (افغانستان کا پہاڑی علاقہ) سے لالچی مہم جوؤں کو ہندوستان

آنے کی دعوت دی تھی اور مالِ غنیمت فوجیوں میں تقسیم کیا تھا، اور یہی طریقہ اس کے جانشینوں نے بھی جاری رکھا۔ ایسا لگتا ہے کہ درآمدی محصولات بہت کم تھے - ان کا اطلاق صرف زمینی تجارت پر ہوتا تھا کیونکہ سلطنت کا کوئی بھی حصہ سمندر سے نہیں لگتا تھا۔ ملکیتی حقوق (ٹینور) کے لحاظ سے اراضی کی تین اہم اقسام تھیں: خالصہ اراضی (شاہی اراضی)۔ جاگیر میں دی گئی اراضی۔ لگان سے مستثنٰی (ٹیکس فری) اراضی، جو فلاحی اوقاف کے لیے نسل در نسل وراثت میں دی جاتی تھی، یعنی یہ مددِ معاش، ائمہ، یا سیورغال کے مالکانہ حقوق کے تحت آتی تھی۔ لودھی حکمرانوں کی فیاضی کی وجہ سے اس دور میں لگان سے مستثنٰی اراضی میں حد سے زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جہاں پورا کا پورا پرگنہ (ضلع کا حصہ) مددِ معاش میں دے دیا گیا تھا۔ صرف خالصہ اراضی ہی مالگزاری (ریونیو) کے قوانین کے تابع تھی۔ کیونکہ جاگیر دار اور زمیندار ریاست کو یکمشت ایک مقررہ رقم ادا کرتے تھے، قطع نظر اس کے کہ زمین سے کتنی پیداوار حاصل ہوئی ہے۔ سکندر لودھی نے جاگیر داروں اور زمینداروں کے ذمے واجب الادا رقم میں اس وقت بھی اضافہ نہیں کیا جب بعد کے سالوں میں زمین سے زیادہ پیداوار اور آمدنی حاصل ہوئی۔ ہر سپاہی، محکمہ مال (ریونیو) کے افسران، اور سرکار (اضلاع) اور پرگنوں کے تقریباً تمام گورنروں (جو مالگزاری کے انتظامیہ کے نچلے درجے کے علاوہ زیادہ تر افغان ہی تھے) کے پاس اپنی تنخواہ پوری کرنے کے لیے ایک جاگیر ہوتی تھی۔ بہلول لودھی نے جاگیروں کے علاوہ اپنے بیٹوں اور رشتہ داروں کے لیے جاگیر داری حقوق بھی پیدا کیے تھے۔ لیکن سکندر لودھی نے نہ صرف ان حقوق کو ختم کیا، بلکہ وہ بڑے جاگیر داروں کے ہاتھوں میں زمین اور طاقت کی منتقلی سے پیدا ہونے والے شر سے بھی واقف تھا، اسی لیے وہ اکثر مختلف اور بکھرے ہوئے مقامات پر جاگیریں عطا کرتا تھا۔ بڑی جاگیر کے ساتھ اس کا آخری تجربہ اس وقت ختم ہوا - جب اس نے اپنے رشتہ دار جلال خان لودھی (ابن محمود خان لودھی) کو کالپی کی پوری 'سرکار' کی جاگیر سے دوبار محروم کیا۔ ابراہیم لودھی نے اپنے بھائی جلال خان کو کچلنے کی بے تابی میں جاگیروں کی تعداد اور وسعت میں اضافہ کر دیا تھا، اور اس کے دورِ حکومت کے آخری سالوں میں

سلطنت کی ابتر صورتحال کا یہ اثر ہوا کہ شمالی ہندوستان کی حالت اس دور سے مختلف نہ رہی جو تغلق اور سادات (سید) کے آخری ادوار میں مروجہ تھی، جب مقطعے (صوبیدار) اور امراء وراثت کے طور پر اقطاع (جاگیروں) پر قابض ہو جاتے تھے اور مرکزی حکومت کی نافرمانی کرتے تھے۔ جاگیریں اصولی طور پر موروثی نہیں تھیں بلکہ تاحیات برقرار رہتی تھیں - بشرطیکہ ان کے پانے والوں کو سلطان کی طرف سے پہلے ہی بے دخل نہ کر دیا گیا ہو۔ سکندر لودھی بدچلنی یا بدعنوانی کی پاداش میں جاگیرداروں کو ان کی جاگیروں سے مسلسل محروم کرنے اور انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے طریقے پر کاربند رہا۔ درآمدی محصولات: (امپورٹ ڈیوٹی)۔ یہ حتمی طور پر طے کرنا مشکل ہے کہ خالصہ (شاہی) اراضی سے لگان کے تعین اور اس کی وصولی کے سلسلے میں کون سا طریقہ کار اپنایا جاتا تھا۔ لیکن یہ بتانا بے جا نہ ہو گا کہ اکبر کے وضع کردہ مالگزاری کے قوانین، اگر تفصیلات میں نہ بھی ہوں تو اصولاً، اس وقت کے مروجہ رسوم ورواج اور طریقوں کی ہی ایک تدوین تھے اور لودھیوں کے دور میں بھی افسران اور ان کے فرائض اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔ مالگزاری کے انتظام کی اکائی 'پرگنہ' تھی، جو کئی دیہاتوں کا مجموعہ ہوتا تھا۔ پرگنہ کے محکمہ مال کے افسران درج ذیل تھے: عامل، عملدار، یا عمل گزار: یعنی وصول کنندہ (ٹیکس کلکٹر)۔ فوتہ دار، تحویل دار، خازن، یا خزانچی: یعنی خزانے کا نگران۔ داروغہ خزانہ اور کارکن (کلرک): ان کے علاوہ دیگر چھوٹے کلرک بھی ہوتے تھے۔ امین: یعنی زمین کی پیمائش کرنے والا (سرویئر)۔ قانون گو: ایک موروثی افسر جو اراضی کے ملکیتی حقوق کے رسوم ورواج سے بخوبی واقف ہوتا تھا۔ تھانیدار، منصف، جراب کش (پیمائشی زنجیر پکڑنے والا)، ضابط پٹواری یا اراضی کا حساب رکھنے والا، مقدم (دیہات کا مکھیا یا نمبردار) اور چوہدری-) جیسے شق دار پرگنہ کا مجسٹریٹ (حاکمِ عدالت) ہوتا تھا، اسی طرح عامل پرگنہ کا ٹیکس وصول کنندہ تھا۔ عامل اپنے دائرہ اختیار میں خود مختار تھا - وہ اس 'سرکار' (ضلع) کے دیوان کے ماتحت اور اس کی نگرانی میں کام کرتا تھا - جس میں وہ پرگنہ واقع ہوتا تھا۔ جمع کیا گیا ٹیکس پرگنہ کے خزانے کے مضبوط کمرے میں رکھا جاتا تھا اور وہاں سے سرکار کے خزانے کو بھیجا جاتا تھا -

جہاں سے اسے مرکزی خزانے میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔ لودھی دور میں ہمیں پرگنہ کے کسی ایسے عامل کا ذکر نہیں ملتا- جسے مرکزی حکومت نے براہِ راست مقرر کیا ہو- اور مواصلات کے ناقص نظام کے اس دور میں ایسا کرنا دانشمندانہ بھی نہیں تھا- سوائے آگرہ کے عملدار کے، جسے دارالحکومت ہونے کی وجہ سے ایک انتہائی اہم افسر سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ شہر عامل کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ عامل دوہری حیثیت کا حامل افسر تھا، وہ ایک طرف 'کاشتکار کا دوست' تھا اور دوسری طرف "سلطانِ اعلیٰ کا نمائندہ" اور ریاست اور کسانوں کے درمیان ایک ثالث (واسطہ) تھا۔ بنیادی طور پر اس کے فرائض یہ تھے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ طے شدہ ٹیکس وصول کر لیا گیا ہے، 'مقدموں' کی طرف سے تیار کردہ مالگزاری کے رجسٹروں اور زیرِ کاشت رقبے کی فہرستوں میں کوئی ہیرا پھیری نہیں ہوئی- اس کے ساتھ ہی وہ کاشتکاری کو فروغ دے۔ وہ قرضوں کی بروقت فراہمی اور (ٹیکسوں میں) چھوٹ دے کر اور بنجر زمینوں کو زیرِ کاشت لانے کی ترغیب دے کر کاشتکاری کو فروغ دیتا تھا۔ کسانوں سے حکومتی واجبات کا تعین کرنے اور مقدموں کی تیار کردہ یادداشتوں کی پڑتال کرنے کے اپنے فرائض میں، اسے ان کلرکوں (کارکنوں) کی مدد حاصل ہوتی تھی -جو انفرادی طور پر کاشتکار اور اجتماعی طور پر گاؤں کے زیرِ کاشت رقبے اور پیداوار کی مقدار کا تمام ریکارڈ رکھتے تھے۔ وہ رقم خزانچی کے حوالے کرتے تھے، جو عامل اور شق دار کی مہر اور دستخط کے ساتھ خزانے میں موصول ہونے والی رقم کا باقاعدہ حساب رکھتا تھا اور کاشتکاروں کو تمام ادائیگیوں کی رسیدیں دیتا تھا۔ عامل پرگنہ میں جزیہ سمیت تمام ٹیکسوں کے تعین اور وصولی پر عمومی نگرانی رکھتا تھا۔ عامل پر عائد کردہ گوناگوں فرائض کے پیشِ نظر ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک ایسا افسر تھا جس کا تعلق زیادہ تر ریکارڈ کی جانچ پڑتال، تصدیق اور لگان و ٹیکسوں کی وصولی سے تھا۔ داروغہ خزانہ، جو اکبر کے عہد میں خزانچی کا ایک مددگار ہوتا تھا- لودھیوں کے دور میں خزانے کا آڈیٹر (حسابات کی پڑتال کرنے والا) اور بنیادی طور پر ایک شاہی افسر معلوم ہوتا ہے جس کا کام غبن یا خرد برد کو روکنا تھا۔ قانون گو، جو کہ ایک "چلتی پھرتی لغت" (معلومات کا خزانہ) تھا، "پٹواریوں (اراضی کے محاسبوں) سے سیلابی مٹی کے جمع ہونے یا کٹاؤ کے

نئے معاملات، زمین کی خرید و فروخت، پٹے (لیز) اور اراضی کے عطیات وغیرہ کی رپورٹیں وصول کرتا تھا- جس کے نتیجے میں "انتقالِ اراضی (تبدیلیِ ملکیت) کے رجسٹر میں تبدیلی کرنا لازم ہوتا تھا- امین کے فرائض بظاہر زمین کی پیائش کرنا تھا۔ پٹواری، مقدم اور چوہدری مالگزاری کے انتظامیہ میں سب سے نچلے درجے پر تھے، اگرچہ ان کا تعلق براہِ راست مالگزاری (لینڈ ریونیو) کے تعین سے تھا۔ پٹواری کاشتکاروں اور ان کی قابلِ کاشت زمینوں کا ریکارڈ رکھتا تھا۔ مقدم ٹیکس وصول کرتا تھا اور وصول شدہ مالگزاری کا ایک خاص فیصد نقد یا جنس کی صورت میں حاصل کرتا تھا۔ آمدنی کا دوسرا ذریعہ راجوں اور بڑے زمینداروں سے ملنے والے نذرانے اور خراج تھے۔ سکندر (لودھی) نے جونپور کی سلطنت کی مالگزاری مبارک خان لوحانی کو ٹھیکے پر بھی دے دی تھی، جس سے اس نے "بادشاہ کے ساتھ طے پانے والے معاہدے کے مطابق" بقایا جات وصول کیے۔ اس نے یہ تجربہ اس وقت ترک کر دیا جب اس نے اپنے (مرکزی) نظام کے مطابق جونپور کی صوبائی انتظامیہ کو باقاعدہ شکل دی۔ اس مفروضے کی قوی وجہ موجود ہے کہ سلطان سکندر لودھی نے ایک یکساں پیمانے 'گزِ سکندری' کے ذریعے زمین کی پیائش (سروے) کا نظام متعارف کرایا تھا، جس کے چلانے کے لیے مکمل ساز و سامان مہیا کیا گیا تھا۔ سلطان اور وزیرِ اعظم میاں بھوا کے درمیان ہونے والی ایک گفتگو میں جب سلطان نے بدعنوانی کے خاتمے کے طریقوں کے بارے میں استفسار کیا تو وزیرِ اعظم نے جواب میں تجویز دی کہ اس کا واحد مؤثر علاج یہ ہے کہ (زمین کی پیائش کی جائے۔ پیائشی زنجیر (جریب) کا ایک سرا سلطان کے ایک معتمد (وفادار) ملازم نے اور دوسرا سرا وزیر نے پکڑا ہوا تھا۔ یہ اس بات کا حتمی ثبوت ہے کہ سلطان سکندر—"جو بعد کے تمام ہندوستانی مالیاتی نظاموں کی کارکردگی میں ایک ایسے مدد و معاون رہے ہیں۔ جن کا اعتراف نہیں کیا گیا"—نے اراضی کی پیائش اور سروے کے لیے ایک معیاری زنجیر متعارف کرائی- جو شرح (ٹیکس) مقرر کرنے سے پہلے مٹی کی نوعیت کو مد نظر رکھتی تھی۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ ریاستی مطالبے (ٹیکس) کا حصہ کیا تھا اور قانون کے ماہرینِ ٹیکس کی طرف سے دی گئی۔ وسیع گنجائش کے پیشِ نظر محض اندازے سے کوئی عدد بتانا بھی

درست نہیں۔ مٹی کی زرخیزی اور آبپاشی کی سہولتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اراضی کا ٹیکس لگانے کے قدیم روایتی اسلامی اصول کی ہی پیروی کی گئی ہوگی۔ اراضی کے تخمینے (اسیسمنٹ) کا نظام ان طریقوں پر مشتمل تھا: اراضی کے ٹیکس کی ایک مقررہ رقم کا تعین کرنا جو نقدی یا جنس کی شکل میں واجب الادا ہو (محاسبہ)۔ زمین کی اصل پیداوار کی تقسیم (یعنی نظام بٹائی، مقاسمہ) جب فصل کاٹ کر ڈھیروں کی شکل میں جمع کر لی جائے- یا کھیت میں ہی اس وقت حد بندی کر دی جائے جب فصل ابھی کھڑی ہو۔ چھوٹے افسران— ضابط، نویسندہ (رائٹر)، امین، قانونگو، پٹواری، مقدم اور تھانیدار—اپنے فرائض کی انجام دہی کے بدلے جمع کیے گئے ریونیو (محصول) کا ایک خاص فیصد حاصل کرتے تھے، جیسا کہ اس وقت تک رواج تھا جب تک اکبر نے اپنے آئینِ اکبری کے ذریعے ان کے معاوضے کے حصے کو باقاعدہ نہیں بنا دیا۔ یہ تخمینہ سال میں دو بار—خریف (خزاں) اور ربیع (بہار) کی فصلوں کے لیے—کیا جاتا تھا اور کاشتکاروں کو کی گئی ادائیگیوں کی باقاعدہ رسیدیں دی جاتی تھیں- اور بقیہ رقوم کو روک لیا جاتا تھا تاکہ انہیں اگلی فصل کے دوران وصول کیا جا سکے۔ سلطان ابراہیم لودھی کے دورِ حکومت کے آغاز تک ٹیکس (ریونیو) نقدی یا جنس کی شکل میں ادا کیا جاتا تھا- لیکن ابراہیم لودھی نے ایک 'فرمان' کے ذریعے جاگیروں سمیت تمام زمینوں کے لیے نقدی کی شکل میں ہر قسم کی ادائیگی کو روک دیا- اور اناج کے علاوہ زمین کی پیداوار پر کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا۔ اس طرح پھل دار درختوں، معدنیات اور لکڑی کو براہِ راست ٹیکس سے استثنٰی حاصل ہو گیا۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ فصلوں کی خرابی کے باعث پیدا ہونے والے قحط کا مقابلہ کرنے کے لیے کون سے مؤثر اقدامات اختیار کیے گئے تھے۔ ۹۰۱ ہجری/۱۴۹۶عیسوی میں، جب سلطنت میں قحط پڑا، تو سکندر لودھی نے ایک 'فرمان' کے ذریعے اناج پر زکوٰۃ (ٹیکس) کی وصولی کو روک دیا، غالباً اس کا مقصد قیمتوں کے نظام کی ہموار کارکردگی کو آسان بنانا اور ساتھ ہی ساتھ (عوام کی) سختیوں اور مشکلات کا تدارک کرنا تھا۔ کل محصول (ٹوٹل ریونیو) لودھی عہد کے دوران ریاست کے کل محصول کا سب سے مستند احوال ہمیں تزکِ بابری (بابر کی یادداشتوں) سے ملتا ہے۔ بابر لکھتا ہے، "اس ملک کا کل محصول جو

اب (۹۳۵ ہجری / ۱۵۲۸ عیسوی) بھیرا سے بہار تک میرے قبضے میں ہے، ۵۲ کروڑ تنکے ہے" (ارسکن کے تخمینے کے مطابق یہ ۴,۲۱۲,۰۰۰ پاؤنڈ بنتا ہے)۔ لیکن ان دنوں اشیاء کی حیرت انگیز ارزانی (سستے پن) کی وجہ سے رقم کی قوتِ خرید آج کے مقابلے میں کم از کم ۱۵ سے ۲۰ گنا زیادہ تھی۔ وہ مزید لکھتا ہے، "اس میں سے ۸ یا ۹ کروڑ (ٹنکے) ان پر گنوں، 'راؤوں' اور راجاؤں سے حاصل ہوتے ہیں جو قدیم دور سے فرمانبردار چلے آرہے ہیں - الائونس (وظائف) اور نان نفقہ پاتے ہیں۔" یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ لودھی حکومت کے عروج کے دور میں یہ محصول نمایاں طور پر زیادہ تھا کیونکہ سلطنت کا رقبہ وسیع تر تھا- اس میں وہ پرگنے اور سرکاریں (اضلاع) بھی شامل تھیں - جن پر راناسانگا کی نظریں لگی ہوئی تھیں اور جو اس وقت تک زوال پذیر سلطنتِ مالوہ کا حصہ ہوا کرتی تھیں۔ بابر نامہ میں دیا گیا چارٹ — جس میں سرکاروں یا جاگیرداروں کے نام اور ان سے حاصل ہونے والے محصول کی رقم درج ہے — مکمل نہیں ہے اور اس میں بہت سے خلا (خامیاں) موجود ہیں - جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بابر مستند اعداد و شمار فراہم کرنے میں ناکام رہا۔ کسی پرگنے کے محصول کا اندازہ بابر کے جابجا حوالوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس نے سلطان ابراہیم لودھی کی والدہ کو ۷ لاکھ (دام) کا ایک پرگنہ عطا کیا- سرہند کے ۱۵ لاکھ کے عوض محمد سلطان مرزا کو ۳۰ لاکھ کی آمدنی کا قنوج عطا کیا؛ ۳۸ محمد زمان مرزا کو بہار کا علاقہ دیا- جس میں سے ۱ کروڑ ۲۵ لاکھ شاہی خزانے کے لیے مخصوص کر دیے- اور پھر ۱۵۲۹ء میں خالصہ (شاہی زمین) کے لیے ۱ کروڑ مخصوص کرنے کے بعد بہار سے ۵۰ لاکھ محمود خان نوحانی کو عطا کیے؛ اور ۳۰ لاکھ مالیت کا نارنول کا پرگنہ بھی عطا کیا- بابر نے پرگنہ بٹالہ کا گاؤں 'منجھر خیل' قاضی جلال کو چھ سال کے لیے سیورغال (مددِ معاش / جاگیر) کے طور پر دیا-- جس کا کل رجسٹرڈ محصول ۵,۰۰۰ سیاہ ٹنکے (ٹنگہِ سیاہ) بنتا تھا-

﴿ملاحظہ ہو: بابر کا فرمان، ذوالقعدہ ۹۳۳ ہجری / جولائی ۱۵۲۷ عیسوی۔ ایپو گرافیا انڈیکا، جلد ۲، ۱۸۹۳ء، صفحہ ۴۸۰)۔﴾

تمام مورخین لودھی دورِ حکومت میں نہ صرف ہندوستان کے امن وخوشحالی کا راگ الاپتے ہیں، بلکہ اس بات پر بھی.. یہ شاید 'بہلولی' ہو، جو کہ تانبے اور چاندی کا ملا ہوا ایک سکہ تھا- جسے عرفِ عام میں 'سیاہ ٹنکہ' کہا جاتا تھا- اس طرح کے ۷/۸ سکے مل کر ایک چاندی کا روپیہ بناتے تھے۔ اشیائے ضرورت کی بے مثال ارزانی (سستا پن)، جس کی ممکنہ وجہ سونے اور چاندی کی قلت تھی، اور سلطان ابراہیم کے عہدِ حکومت کے آغاز سے ہی جاری بغاوتوں اور عدم تحفظ کے پیشِ نظر لوگوں کی طرف سے سکوں کو چھپا دینے کی وجہ سے اس ارزانی کو مزید شہ ملی۔ 'عبداللہ کی 'تاریخِ داؤدی' کا ایک اقتباس یہاں نقل کرنا موزوں ہوگا: "سلطان ابراہیم کے عہدِ حکومت کے عجائبات میں سے ایک یہ تھا کہ اناج، کپڑا اور تمام اشیائے ضرورت اتنی سستی ہوگئیں کہ کسی دوسرے دور میں کبھی ایسی نہ تھیں۔ سلطان ابراہیم کے دور کی یہ ارزانی گویا آسمانی تحفہ تھی۔ اگرچہ (سلطان) سکندر کے دور میں بھی سستا پن تھا، لیکن اس حد تک نہیں تھا جتنا سلطان ابراہیم کے زمانے میں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک 'بہلولی' (تانبے اور چاندی کا ملا جلا سکہ) کے عوض ۱۰ من اناج، ۵ سیر گھی اور ۱۰ گز کپڑا خریدا جا سکتا تھا، اور دیگر اشیاء بھی اسی تناسب سے سستی تھیں۔ اس ارزانی کی وجہ یہ تھی کہ بارشیں بکثرت ہوئیں اور فصلیں خوب لہرائیں۔" سلطان ابراہیم کے اس قانون نے جس کے تحت لگان (ٹیکس) کی نقد ادائیگی پر پابندی لگا دی گئی تھی - مارکیٹ میں اناج کی ریل پیل کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امراء اور جاگیردار اپنی فصلیں سستے داموں بیچنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے، جس کے نتیجے میں "ایک بہلولی میں ۱۰ من اناج ملنے لگا۔ لیکن اس وجہ سے سونا اور چاندی نایاب ہو گئے - ایک شخص جس کی ماہانہ تنخواہ ۵ ٹنکے (اشرفی) تھی - وہ اپنے خاندان اور وابستگان کے ساتھ باوقار زندگی گزار سکتا تھا- ۲۳ ٹنکے ماہانہ کمانے والا شخص سواری (گھوڑا) رکھنے کی استطاعت رکھتا تھا- ایک ٹنکہ اتنی بڑی رقم تھی - جو کسی بھی شخص کے لیے دہلی سے آگرہ تک گھوڑے اور ملازم کے ساتھ باآسانی سفر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کافی تھی۔" چاندی اور تانبے کی ملاوٹ سے بنا ایک سکہ۔ سفر کے اخراجات باآسانی پورے ہو جاتے تھے۔ شاید اس دور میں بھی

زمینداروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں کاشتکاروں (کسانوں) کا استحصال کیا جاتا تھا۔ یہ کوئی جادو کی چھڑی کا کمال نہیں تھا(اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ بادشاہ کی سلطنت کی توسیع کے ساتھ جاگیر کی زمینوں میں بھی اضافہ ہوا تھا) کہ جاگیرداروں اور زمینداروں نے سکندر لودھی کے عہدِ حکومت کے پہلے ہی سال تخمینہ شدہ مالیہ کے سات لاکھ کے بجائے نو لاکھ، دوسرے سال گیارہ لاکھ، اور تیسرے سال چودہ لاکھ روپے وصول کیے۔ اور اس کے ساتھ ہی 'ابواب' (مختلف اضافی ٹیکسوں یا سیس) کا برقرار رہنا۔ جنہیں لودھی حکمران اپنی بہترین کوششوں کے باوجود ختم نہ کر سکے ـــ یقیناً کاشتکاروں کے سکون اور خوشحالی پر اثرانداز ہوا ہو گا۔ (حواشی): ﴿موازنہ کریں: تاریخِ داؤدی، ایلیٹ، جلد ۴، صفحہ ۴۵۳۔

کتابیات (Bibliography)

تاریخ مبارک شاہی

(اے۔ایس۔بی پبلیکیشن، لائبریری انڈیکا سیریز؛ انگریزی ترجمہ از کے-کے باسل؛ گائیکواڑ اور ینٹل سیریز؛ ایلیٹ، جلد چہارم، ص ۶ اور اس سے آگے)۔ مصنف: یحییٰ بن احمد بن عبداللہ۔ یہ کتاب انہوں نے اپنے سرپرست مبارک شاہ کی مدح و ثنا کی غرض سے لکھی تھی۔ اس کا آغاز خاندانِ غوریہ کی بنیاد سے ہوتا ہے اور یہ اچانک ۸۳۴ ہجری / ۱۴۳۰ عیسوی پر ختم ہو جاتی ہے، جو محمد شاہ سید کے عہدِ حکومت کا دوسرا سال ہے۔ یہ نام نہاد "سید دور" پر دستیاب واحد معاصر (ہم عصر) تصنیف ہے۔ نظام الدین، فرشتہ اور بدایونی نے اس دور کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے مکمل طور پر اسی کتاب پر انحصار کیا۔ لودھی خاندان کے عروج کے اسباب جاننے کے لیے یہ انتہائی مفید کتاب ہے۔

۲۔ بابر نامہ، تزکِ بابری، یا واقعاتِ بابری

(فارسی ترجمہ از خانِ خانان عبدالرحیم، ۹۹۸ ہجری / ۱۵۸۹ عیسوی؛ انگریزی ترجمہ از ارسکن؛ اور مسز بیوریج، دو جلدوں میں؛ ایلیٹ، جلد چہارم، ص ۲۱۸ اور اس سے آگے)۔ یہ لودھی دور کے آخری حصے کا سب سے پہلا معاصر احوال ہے۔ چونکہ یہ یاداشتیں (تزک) ایک علم دوست انسان اور گہرے مشاہدے کے مالک شخص کے قلم سے لکھی گئی ہیں جس نے اپنے عہدِ تخت نشینی سے لے کر ۱۵۲۹ عیسوی تک کے واقعات میں خود حصہ لیا اور کھل کر اپنے کردار کو قلمبند کیا، اس لیے (متعدد مقامات پر تسلسل ٹوٹنے اور اس وجہ سے تاریخی اعتبار سے وقتی خلا پیدا ہونے کے باوجود) یہ کتاب سلطان ابراہیم لودھی کے ساتھ بابر کے تعلقات، بہار میں پٹھانوں کی حتمی شکست، اور ہندوستان کی بتدریج فتوحات کو سمجھنے کے لیے ہمارا سب سے اہم ماخذ ہے۔ اس میں ملک کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور علمی حالات کی ایک واضح تصویر ملتی ہے۔

طبقاتِ بابری

مصنف: شیخ زین (ایلیٹ، جلد چہارم، ص ۲۸۸ اور اس سے آگے؛ مسز بیوریج، میموئرز آف بابر، جلد دوم، ص ۵۵۹ اور اس سے آگے)۔ مصنف بابر کے سیکرٹری تھے جنہوں نے جزوی طور پر اپنے ذاتی مشاہدات کی بنیاد پر اسے تحریر کیا۔ یہ کتاب ہمیں ۱۵۲۷ عیسوی میں ہونے والی "کنواہ کی جنگ" (Battle of Kanwa) کا احوال سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

تاریخِ رشیدی

(انگریزی ترجمہ از الیاس اور راس، لندن، ۱۸۹۵)۔ مصنف: مرزا محمد حیدر دُغلت کورکانی، جو بابر کے فرسٹ کزن (خالہ زاد / چچازاد بھائی) تھے اور خود بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، ماہر مورخ اور مبصر تھے۔ اگرچہ یہ کتاب بابر کی ابتدائی تاریخ، ان کی پیدائش وغیرہ کے بارے میں جاننے، بابر نامہ کے تاریخی خلا کو پُر کرنے، اور شیر شاہ (سوری) کے ساتھ ہمایوں کی کشمکش کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے، لیکن لودھی خاندان کی تاریخ کے لیے ہمیں اس سے زیادہ مدد نہیں ملتی۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔

واقعاتِ مشتاقی

مصنف: رزق اللہ مشتاقی (۱۴۹۲–۱۵۸۰)۔ مصنف ایک جید عالم اور سیاح تھے۔ انہوں نے اپنی اس تصنیف کا آغاز بہلول لودھی کے دور سے کیا اور اس کا اختتام محمد عادل (شاہ) پر کیا، جس میں گجرات اور مالوہ کی علاقائی سلطنتوں کا احوال بھی شامل ہے۔ نظام الدین احمد نے (اپنی تاریخ لکھتے ہوئے) اس کتاب سے استفادہ کیا تھا- یہ سوری اور لودھی پٹھانوں کی سب سے پہلی تاریخ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عبداللہ نے اپنی کتاب "تاریخِ داؤدی" میں اس کے اقتباسات بڑے پیمانے پر نقل کیے ہیں۔ میں "واقعاتِ مشتاقی" کے حوالے سے صرف ایلیٹ (جلد چہارم، ص ۵۳۴ اور اس سے آگے) کے اقتباسات ہی استعمال کر سکا ہوں۔

تاریخِ الفی

(اے-ایس-بی کلکتہ، انڈیا آفس، نواب بہادر آف مرشد آباد اسٹیٹ لائبریری، مرشد آباد؛ ایلیٹ، جلد پنجم، ص ۱۵۰ اور اس سے آگے)۔ اس کتاب کا آغاز ۹۹۳ ہجری / ۱۵۸۵ عیسوی میں علماء کے ایک گروہ نے کیا تھا (اور یہ ۹۹۶ ہجری / ۱۵۸۸ عیسوی میں مکمل ہوئی)، جس میں ٹھٹھہ کے ملا احمد بنیادی معاون تھے (دیگر معاونین میں نقیب خان، بدایونی اور آصف خان شامل ہیں)۔ یہ ایک عالمگیر تاریخ ہے جو اسلام کے ایک ہزار سال کی کرونولوجی (تاریخی ترتیب) پر مشتمل ہے، جسے اکبر کی سرپرستی میں مرتب کیا گیا تھا۔

اس کا نام "ایک ہزار سال کی تاریخ" اس لیے رکھا گیا کیونکہ مھدوی تعلیمات و تبلیغ کے زیرِ اثر اکبر کا یہ گمان تھا کہ دیگر تمام مذاہب کی طرح اسلام کا زوال بھی اس کے وجود کے ایک ہزار سال مکمل ہونے کے بعد ناگزیر ہے۔ اس کتاب میں تواریخ ہجری سالوں کے بجائے "رحلت" (وفاتِ نبویؐ) کے سالوں کے حساب سے دی گئی ہیں، اور مصنف کے مقدمے کے مطابق یہ تین جلدوں پر محیط ہے۔ نواب بہادر آف مرشد آباد کی لائبریری میں اس تصنیف کے دو سیٹ موجود ہیں جو تقریباً مکمل ہیں اور دونوں چار جلدوں پر مشتمل ہیں۔

اگر علمی اور تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ واقعات کا ایک خشک احوال (روزنامچہ) یا تفصیلی ٹائم چارٹ ہے، جسے قدیم عرب مورخین کے اندازِ تحریر میں قلمبند کیا گیا ہے۔ تمام اسلامی ممالک میں ایک سال کے دوران پیش آنے والے واقعات کو یکے بعد دیگرے بیان کیا گیا ہے، اور اس کے بعد ہی اگلے سال کی تاریخ شروع کی جاتی ہے۔ یہ تصنیف بغیر کسی وقفے یا صنف کی تبدیلی کے نشان کے، تقریباً چھ ہزار باریک لکھے ہوئے صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ جب ایک ملک کے واقعات کی تفصیل درج کر دی جاتی ہے، تو دوسرے ملک میں رونما ہونے والے واقعات کا ذکر (جیسے کہ مرشد آباد کے قلمی نسخے میں ہے) ان الفاظ کے ساتھ کیا جاتا ہے: "اور اسی (سال کے دیگر واقعات)

حواشی (Footnotes):

^[۱] بروشر آف انڈین ہسٹوریکل ریکارڈز کمیشن، میسور ۱۹۴۲، ص۱۰۸ اور اس سے آگے)۔

ایضاً (ایڈم)، ص۱۱۱-۱۱۲۔

"اس کتاب میں بنیادی طور پر ہندوستان میں پیش آنے والے واقعات کو (مجموعی تاریخ کے تناظر میں) قدرے کم جگہ ملی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کے کسی طالب علم کے لیے یہ تواریخ کی تصحیح کے حوالے سے تو مفید ہے، لیکن اس میں سے ہندوستان سے متعلقہ مواد کو ڈھونڈ نکالنا واقعی ایک جوئے شیر لانے (نہایت کٹھن کام) کے مترادف ہے۔ کتاب میں کئی مقامات پر "رحلت" اور "ہجرت" کی تواریخ کے درمیان خلط ملط (الجھاؤ) کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

۷۔ طبقاتِ اکبری / طبقاتِ اکبر شاہی

قرونِ وسطیٰ کے مورخین میں یہ کتاب "تاریخ نظامی" کے نام سے زیادہ مشہور ہے (لکھنؤ پبلیکیشنز، لائبریری انڈیکا سیریز، ۳ جلدیں؛ انگریزی ترجمہ از بی-ڈے؛ ایلیٹ، جلد پنجم، ص۱۷۷ اور اس سے آگے)۔ اس کے مصنف نظام الدین احمد بخشی ہیں۔ یہ کتاب سبکتگین کے دور سے لے کر ۱۰۰۲ ہجری / ۹۴-۱۵۹۳ عیسوی یعنی اکبر کے عہدِ حکومت کے ۳۸ویں سال تک کی ہندوستانی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ ہندوستان کی پہلی باقاعدہ تاریخ ہے جو خصوصی طور پر صرف ہندوستان کے معاملات پر بحث کرتی ہے، اور یہ پورے لودھی دور کے لیے ہمارا سب سے مستند اور بنیادی ماخذ ہے۔

اگرچہ یہ کتاب تواریخ کی غلطیوں سے پاک نہیں ہے (کیونکہ اس میں شمسی اور قمری تواریخ آپس میں الجھ گئی ہیں)، تاہم ان کی یہ تصنیف بعد میں لکھی جانے والی تاریخوں کی بنیاد بنی۔ بدایونی، نعمت اللہ، فرشتہ، عبداللہ اور عبدالباقی نے اس کتاب کے احسان کا اعتراف کیا ہے اور اس کے اقتباسات کو کثرت سے نقل کیا ہے۔ بدایونی نے تو بالکل صاف گوئی سے

اعتراف کیاہے کہ ان کی کتاب "منتخب التواریخ" بنیادی طور پر اسی "طبقات" کا خلاصہ ہے۔ نظام الدین کا اندازِ تحریر اگرچہ سادہ اور بناوٹ سے پاک ہے، لیکن وہ ایک ایسی نفاست اور اختصار کے ساتھ لکھتے ہیں جو خاص انہی کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ کتاب ہر طرح کی جانبداری سے پاک ہے- تواریخ سے مالامال ہے اور اگرچہ لودھی دور ان کے اپنے زمانے سے لگ بھگ ایک صدی پرانا تھا- لیکن مقامات اور شہروں کے ناموں کی بالکل درست شناخت ان کا ایک بہت بڑا اور قابلِ تعریف کارنامہ ہے۔

طبقاتِ اکبری کا ایک قلمی نسخہ (مخطوطہ) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری (سبحان اللہ کلیکشن) میں بھی موجود ہے۔ اسے مصنف کی تصنیف کے دو سال بعد، یعنی ۱۰۰۳ ہجری / ۱۵۹۵ عیسوی میں ایک شخص عبدالحیٔ قریشی نے نقل (تحریر) کیا تھا۔ یہ ایم۔یو لائبریری میں نستعلیق کا سب سے خوبصورت ترین مخطوطہ ہے۔ میں نے مطبوعہ متن میں مقامات کے ناموں اور دیگر مشکوک الفاظ کی تصدیق کے لیے اس کا استعمال کیا۔ "منتخب التواریخ' یا 'تاریخِ بدایونی' (ببلیو تھیکا انڈیکا سیریز، تین جلدوں میں؛ انگریزی ترجمہ از رینکنگ، لو اور ہیگ، ایلیٹ جلد پنجم، صفحہ ۴۷۷ اور اس کے بعد) ملا عبدالقادر بدایونی کی تصنیف ہے، جو نظام الدین احمد کے دوست اور ہم عصر تھے جن کی وفات پر انہوں نے انتہائی اثر انگیز الفاظ میں تعزیت کا اظہار کیا ہے، اور وہ ابوالفضل اور فیضی جیسے آزاد خیال مفکرین سے شدید نفرت کرنے والے تھے۔ منتخب التواریخ کا آغاز نظام الدین کی وفات کے سال یعنی ۱۰۰۳ ہجری / ۱۵۹۵ عیسوی میں ہوا اور یہ جمادی الثانی ۱۰۰۴ ہجری، ۲۳ فروری ۱۵۹۶ عیسوی کو مکمل ہوئی۔ یہ غزنویوں کے دور سے لے کر اکبر کے عہدِ حکومت کے ۴۰ویں سال تک کی ہندوستان کی ایک عمومی تاریخ ہے، اور اس میں راسخ العقیدہ (قدامت پسند) نقطہ نظر سے اکبر کی مذہبی پالیسی سے متعلق مفید مواد موجود ہے جو کہ خوشامدانہ مبالغہ آرائی سے پاک ہے۔ جہاں تک سادات اور لودھی دور کا تعلق ہے، یہ 'تاریخِ مبارک شاہی' اور 'طبقاتِ اکبری' کا خلاصہ ہے۔ پھر بھی یہ ہمیں سکندر لودھی کے عہد کے ادبی اور ثقافتی پہلو کے بارے میں ایسی نئی معلومات فراہم کرتی ہے جو کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملتی۔ ۹۔ 'اکبر نامہ' (ببلیو تھیکا انڈیکا سیریز پبلیکیشن، لیتھو ایڈیشن لکھنؤ، انگریزی ترجمہ از ایچ۔ بیوریج؛ ایلیٹ جلد ششم، صفحہ ۱ اور اس کے بعد) اور 'آئینِ اکبری' (دہلی متن؛ ترجمہ از گلیڈون؛ از بلوچمین اور جیرٹ) میں سے بلوچمین مؤخر الذکر (آئینِ اکبری) کو ایک الگ تصنیف قرار دیتے ہیں۔ اول الذکر (اکبر نامہ) ۱۰۰۴ ہجری / ۱۵۹۶ عیسوی میں مکمل ہوا تھا- تاریخ حقی اسے ذکر الملوک (بانکی پور مخطوطہ؛ ایلیٹ، جلد ۶، صفحہ ۱۷۵) بھی کہا جاتا ہے۔ اسے دہلی کے ایک مشہور بزرگ شیخ عبدالحق حقی نے اکبر کے عہدِ حکومت کے ۴۲ویں سال یعنی ۱۰۰۵ ہجری میں مکمل کیا۔ تاریخی واقعات اور

تاریخوں (سن) کے معاملے میں اس پر زیادہ بھروسا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مصنف خود اعتراف کرتا ہے کہ اس نے کتاب کا وہ حصہ، جس سے ہمارا تعلق ہے-زبانی روایات اور مشاہدات کی بنیاد پر لکھا ہے۔ ۱۱۔ تاریخِ شیر شاہی یا تحفۂ اکبر شاہی: (حبیب گنج مخطوطہ، بانکی پور اور اے. ایس. بی مخطوطہ، ایلیٹ، جلد ۴، صفحہ ۳۰۱)۔ اسے شیر شاہ سوری کے ایک رشتہ دار (بذریعہ اہلیہ) عباس خان شیروانی نے شہنشاہ اکبر کے حکم پر لکھا تھا۔ ڈاکٹر قانونگو اسے نظام الدین کی "طبقاتِ اکبری" سے پہلے کی تصنیف مانتے ہیں۔ نعمت اللہ، یادگار اور عبداللہ نے شیر شاہ کے دورِ حکومت کے سلسلے میں اسی کتاب سے مواد اور اقتباسات لیے ہیں۔ لودھیوں کی تاریخ کے لیے یہ کتاب زیادہ کارآمد نہیں ہے، سوائے محمود لودھی کی قیادت میں پٹھانوں کی بابر کے خلاف آخری جدوجہد کے (جسے عباس نے غلطی سے ہمایوں لکھا ہے) اور دوسری پٹھان (سوری) سلطنت کے بتدریج عروج کے تذکرے کے۔ ۱۲۔ تاریخِ سلاطینِ افاغنہ: جسے "تاریخِ لودھی و سوری" بھی کہا جاتا ہے (اے. ایس. بی مخطوطہ؛ بہار مخطوطہ؛ ایلیٹ، جلد ۵، صفحہ ۱؛ جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ سے "تاریخِ شاہی" کے عنوان سے شائع ہوئی)۔ اس کے مصنف احمد یادگار ہیں جو ایک پٹھان تھے۔ جیسا کہ انہوں نے دیباچے میں بتایا ہے، یہ کتاب انہوں نے بنگال کے بادشاہ داؤد شاہ (۷۶-۱۵۷۲ / ۸۴-۹۸۰) کے حکم پر لکھی تاکہ منہاج سراج یا عفیف کی تصانیف کا مقابلہ کر سکیں اور اس طرح اپنے سرپرست کا نام زندہ رکھ سکیں۔ یہ کتاب "طبقاتِ اکبری" کی تصنیف کے کچھ عرصے بعد مکمل ہوئی، جس کا مصنف نے اعترافِ ممنونیت بھی کیا ہے، اور یہ عبداللہ کی تصنیف سے پہلے، غالباً بنگال کے کسی شہر میں لکھی گئی۔ یہ کتاب بہلول لودھی کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے اور ہیمو کی گرفتاری و موت پر ختم ہوتی ہے۔ اس کا طرزِ تحریر سادہ اور بعض اوقات غیر فارسی ہے، اور یہ غلطیوں سے بھری ہوئی ہے، جو مجھے ڈر ہے کہ صرف کاتب کی لاپرواہی کا نتیجہ نہیں ہیں۔ تاریخوں کے لیے کالم بنے ہوئے ہیں جو شاذ و نادر ہی بھرے گئے ہیں، اسی وجہ سے کتاب میں تاریخیں بہت کم ہیں۔ بہلول لودھی اور سکندر لودھی کے ادوار کے لیے یہ کتاب انتہائی ناقابلِ اعتبار ہے، اور یہ تاریخ اور بازاری گپ شپ کا ایک بے ترتیب مجموعہ ہے، جس میں کچھ ناقابلِ یقین کہانیاں بھی شامل ہیں؛ جیسے دُم والے انسان، چھوٹے درختوں کے بڑے پتوں سے پینے کا پانی نکلنا، یا سلطان سکندر کا مردوں کو زندہ کرنا۔ لیکن سلطان ابراہیم لودھی کے دورِ حکومت کے بیان میں وہ غیر متوقع طور پر بہت محتاط اور تاریخی انداز اپناتا ہے اور ایسی بہت سی نئی معلومات فراہم کرتا ہے جو کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملتیں۔ وہ پہلا مؤرخ ہے جس نے لودھی سلاطین کے میواڑ کے ساتھ تعلقات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اے. ایس. بی لائبریری میں موجود مخطوطہ نسبتاً جدید ہے، اور میرا خیال ہے کہ یہ کسی نہ کسی مرحلے پر بہار (امپیریل لائبریری، کلکتہ) کے مخطوطے سے نقل کیا گیا تھا، کیونکہ

غلطیاں دونوں میں مشترک ہیں اور اے. ایس. بی کے مخطوطے میں زیادہ ہیں، جو اگرچہ پڑھنے میں زیادہ آسان ہے، لیکن اسے کسی کم مہارت رکھنے والے کاتب نے لکھا تھا۔ ۱۳۔ روضۃ الطاہرین: (اے. ایس. بی مخطوطہ؛ جے. آر. اے. ایس کلکتہ، نئی جلد ۱۳، ۱۹۱۷ء، صفحہ ۲۶۹؛ ایلیٹ، جلد ۶، ۱۹۵)۔ یہ طاہر محمد کی لکھی ہوئی ایک عمومی تاریخ ہے، جس کا آغاز اکبر کی وفات سے تین سال پہلے ۱۰۱۱ ہجری / ۱۶۰۳ء میں ہوا اور اختتام جہانگیر کے عہدِ حکومت میں ۱۰۱۵ ہجری / ۱۶۰۶ء میں ہوا۔ اس کی چوتھی جلد ہندوستان کے حکمرانوں سے متعلق ہے۔ ۱۴۔ منتخب التواریخ یا احسن التواریخ: (بہار مخطوطہ؛ ایلیٹ، جلد ۶، ۱۹۵)۔ یہ ہندوستان کی ایک عمومی تاریخ ہے جسے حسن بن محمد الخاکی الشیرازی نے جہانگیر کے عہدِ حکومت کے پانچویں سال (۱۰۱۵ ہجری / ۱۶۱۰ء) میں مکمل کیا۔ ۱۵ یہاں آپ کے متن کا اردو ترجمہ پیش ہے:

۶۔ سنت کبیر (ہندی)، ساہتیہ بھون، پریاگ۔

انگریزی تصانیف (مع مصنفین):

وان کریمر (Von Kremer): دی اورینٹ انڈر دی کیلفس (The Orient under the Caliphs)، مترجم: خدا بخش۔

ایشوری پرساد (Ishwari Prasad): ہسٹری آف دی قرونہ ترکس (History of the Qarauna Turks)۔

سرکار، جے این (Sarkar, J.N.): مغل ایڈمنسٹریشن (Mughal Administration)۔

قانونگو، کے آر (Qanungo, K.R.): شیر شاہ (Sher Shah)۔

سمیتھ، وی اے (Smith, V.A.): اکبر دی گریٹ مغل (Akbar the Great Mogul)۔

ترپاٹھی، آر پی (Tripathi, R.P.): سم اسپیکٹس آف مسلم ایڈمنسٹریشن (Some Aspects of Muslim Administration)۔

تھامس (Thomas): ریونیو ریسورسز آف دی مغل ایمپائر (Revenue Resources of the Moghul Empire)۔

روجر رائٹ (Roger Wright): انڈین مسلم کوائنز (Indian Muslim Coins)۔

ایچ این (H.N.): کیٹلاگ آف کوائنز ان دی انڈین میوزیم، جلد دوم (Catalogue of Coins in the Indian Museum II)۔

وحید حسین (Wahid Husain): ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ڈیورنگ مسلم رول ان انڈیا (Administration of Justice during Muslim Rule in India)۔

محمد اللہ 'عبداللہ (Muhammadullah ʻAbdul): ایڈمنسٹریشن آف جسٹس آف مسلم لاء (Administration of Justice of Muslim Law)۔

آرنلڈ (Arnold): انفلونس آف صوفیز ان دی ڈیولپمنٹ آف اردو لٹریچر، اورنگ آباد، دکن (Influence of Sufis in the development of Urdu Literature. Aurangabad, Deccan)۔ (اردو)، پریچنگ آف اسلام (Preaching of Islam)۔

براؤن (Browne): لٹریری ہسٹری آف پرشیا، جلد دوم (Literary History of Persia, Vol. II)۔

نکلسن (Nicholson): لٹریری ہسٹری آف دی عربس (Literary History of the Arabs)۔

ٹائٹس (Titus): انڈین اسلام (Indian Islam)۔

لیمینز (Lammens): اسلامک بیلیفز اینڈ پریکٹسز (Islamic Beliefs and Practices)۔

ایلیٹ (Elliot): میموئرز آف دی ریسز آف دی نارتھ ویسٹرن پروونسز، ۲ جلدیں (Memoirs of the Races of the North Western Provinces, 2 Vols)۔

میور (Muir): کیلفیٹ — اِٹس رائز، ڈیکلائن اینڈ فال (Caliphate — its Rise, Decline and Fall)۔

(OF THE LODIS

آرنلڈ (Arnold): کیلفیٹ (Caliphate)۔

اغنیدس (Aghnides): محمدن تھیوریز آف فنانس (Mohammaden Theories of Finance)۔

ڈورن (Dorn): مخزنِ افغانی کا انگریزی ترجمہ (Tr of Makhzan-i Afghani)۔

ایلفنسٹن (Elphinstone): ہسٹری آف انڈیا (History of India)۔

ارسکین (Erskine): ہسٹری آف انڈیا، جلد اول (History of India Vol. I)۔

تھامس (Thomas): کرونیکلز آف دی پٹھان کنگز آف دہلی (Chronicles of the Pathan Kings of Delhi)۔

ہیگ (Haig): کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد سوم (Cambridge History of India Vol. III)۔

ایلیٹ (Elliot): ہسٹری آف انڈیا، جلد چہارم تا ہشتم (History of India Vols. IV-VIII)۔

رش بروک ولیمز (Rushbrook-Williams): بابر (Babar)۔

ہولڈچ (Holdich): انڈین بارڈر لینڈ (Indian Borderland)۔

فیر یئر (Ferrier): ہسٹری آف دی افغانس (History of the Afghans)۔

میلیسن (Malleson): ہسٹری آف افغانستان (History of Afghanistan)۔

ایلفنسٹن (Elphinstone): اکاؤنٹ آف دی کنگڈم آف کابل اینڈ اِٹس ڈیپینڈینسیز (Account of the Kingdom of Kabul and its dependencies)۔

لاکوسٹ (Lacoste): اراؤنڈ افغانستان (Around Afghanistan)۔

ٹیٹ (Tate): دی کنگڈم آف افغانستان (The Kingdom of Afghanistan)۔

اسٹین (Stan): فرنٹیر فوک آف دی افغان بارڈر (Frontier-folk of the Afghan Border)۔

ووڈ (Wood): افغانستان اینڈ دی پنجاب (Afghanistan and the Punjab)۔

میک من (Mac Mun): افغانستان، ابواب اول ودوم (Afghanistan, Chs I & II)۔

بیلیو (Bellew): افغانستان (۱۸۶۲ء) (Afghanistan)۔

بیلیو (Bellew): افغانستان اینڈ دی افغانس، ۱۸۷۹ء (Afghanistan and the Afghans 1879)۔

بیلیو (Bellew): ریسز ان افغانستان، ۱۸۸۰ء (Races in Afghanistan 1880)۔

اولیور (Oliver): اَکروس دی بارڈر — افغان اینڈ بلوچ (Across the Border — Afghan and Baloch)۔

بڈولف (Biddulph): ٹرائبز آف دی ہندوکش (Tribes of the Hindukush)۔

پوگسن (Pogson): ہسٹری آف دی بندیلیاز (History of the Bundelas)۔

کتابیات (BIBLIOGRAPHY)۔ تاریخِ فرشتہ، تاریخ ابراہیم شاہی یا گلشنِ ابراہیمی: (اے. ایس. بی مخطوطہ؛ لکھنؤ، بمبئی اور پونا کے لتھو ایڈیشن؛ اردو ترجمہ: نولکشور، حیدر آباد دکن؛ انگریزی ترجمہ بذریعہ بریگز، ایلیٹ، جلد ۶، صفحہ ۲۰۷)۔ اس کے مصنف ابو القاسم محمد ہندو شاہ فرشتہ استر آبادی ہیں، جنہوں نے یہ کتاب بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ کی سرپرستی میں ۱۶۰۹-۱۶۱۰ء / ۱۰۱۸ ہجری کے لگ بھگ لکھی اور کتاب اسی کے نام معنون کی۔ یہ کتاب ہندوستان پر

مسلم حملوں سے شروع ہوتی ہے اور ۱۰۱۵ہجری / ۱۶۰۷ء تک جاری رہتی ہے، جس کے شروع میں ہندو تاریخ کا مختصر حوالہ بھی ہے۔ یہ تصنیف یورپیوں میں قرونِ وسطیٰ کی کسی بھی دوسری ہندوستانی تاریخ سے زیادہ جانی جاتی ہے اور اسے ہندوستان کے ابتدائی مسلم حکمرانوں کے لیے ایک مستند ماخذ کے طور پر بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ فرشتہ علم و فضل اور تاریخی شعور رکھنے والے شخص تھے، لیکن ان کی یہ کتاب صوبائی خاندانوں کے احوال میں بھی نظام الدین کی "طبقات" پر ہی گہرائی سے منحصر ہے۔ چہار گلشن یا اخبار النوادر (بانکی پور مخطوطہ؛ ایلیٹ، VIII، 255) مصنفہ چھترمان (۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء)۔ یہ ابتدائی دور سے لے کر شاہ جہاں ثانی کے عہدِ حکومت کے خاتمے (۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء) تک کی تاریخ ہے۔ ۳۱. سیر المتأخرین (لکھنؤ، کلکتہ ایڈیشن؛ ایلیٹ VIII، ص ۱۹۳) مصنفہ غلام حسین طباطبائی۔ اس میں ہندو ہندوستان کی تاریخ شامل ہے، جو ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۰ء میں مکمل ہوئی اور اسے وارن ہیسٹنگز کے نام معنون کیا گیا۔ اس کتاب کی پہلی جلد، جو کہ تعارفی حصہ ہے، سجان رائے کی "خلاصتہ التواریخ" کا لفظ بہ لفظ اور جملہ بہ جملہ چربہ (نقل) ہے۔ اس کتاب کا ایک اختصار شدہ ایڈیشن منشی عبدالکریم نے ملخص التواریخ کے نام سے شائع کیا تھا۔ ۳۲. بحر المواج (بانکی پور، ایلیٹ جلدVIII، 235) مصنفہ محمد علی خان۔ یہ محمد شاہ کی وفات (۱۷۴۸ء) تک کی تاریخ پر مبنی ہے اور اس میں لودھی سلاطین کے مختصر احوال شامل ہیں۔ جدید تصانیف (فارسی): مرآۃِ آفتاب نما (بانکی پور، اے. ایس. بی. علی گڑھ) مصنفہ عبدالرحمن، جو شاہ نواز خان کے نام سے مشہور ہیں، تصنیف شدہ ۱۸۰۳ء۔ مجملِ ہندی (حبیب گنج مخطوطہ، ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء) مصنفہ سید محمد محسن علی رضوی مشہدی، جو کہ تقریباً فرشتہ (تاریخ فرشتہ) کی ہی نقل ہے۔ گلشنِ ہند (مسلم یونیورسٹی مخطوطہ، ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۵ء) از ایک نامعلوم لکھنؤ کے مصنف۔ مفتاح التواریخ از بیل (Beale)، لیتھو ایڈیشن آگرہ، ۱۸۴۹ء؛ یہ کتاب مادہ تاریخ (Chronograms) کے لیے مفید ہے۔ تاریخ خورشیدِ جہاں، لاہور ۱۸۴۹ء، مصنفہ شیر محمد خان۔ تاریخ سلطانی (لیتھو) مصنفہ سلطان محمد خان درانی۔ خلاصۃ الانساب از حافظ رحمت خان، ۱۱۸۴ھ / ۱۷۷۰ء۔ نسبِ افغانہ از حافظ رحمت خان۔ اردو تصانیف: حیاتِ افغانی (لاہور ۱۸۶۷ء) مصنفہ محمد حیات خان بہادر؛ یہ ایک نہایت عمدہ اور تنقیدی تصنیف ہے۔ تاریخ افغانہ (۲ جلدیں) — شہاب الدین۔ تاریخ ہند — ذکاء اللہ۔ تحفۃ البشتون — مواجی حسین خان۔ صولتِ افغانی — محمد دراز خان۔ نسبِ افغاناں — نواب عبدالسلام خان۔ گلستانِ ہند — راجہ درگا پرساد، اشاعت ۱۸۶۷ء۔ سوانح حیات (بایو گرافیز): اخبار الاخیار — مولانا عبدالحق (حقی) دہلوی، شائع شدہ۔ اولیاء اللہ کا تذکرہ، جو اکبر کے عہد میں لکھا گیا۔ حالاتِ سید سالار مسعود غازی — عبدالرحمن چشتی علوی (جہانگیر کے عہد میں لکھی گئی)، مسلم یونیورسٹی مخطوطہ۔ سید السیر — غلام احمد مشہود رامپوری، مسلم یونیورسٹی مخطوطہ

(۱۸ویں صدی)۔ کبیر صاحب — منوہر لال زتشی، ہندی (اردو) اکیڈمی، الہ آباد۔ کبیر جنم ساکھی — محمد خلیل انصاری۔ کتابیات (BIBLIOGRAPHY)

مرآۃِ سکندری

بنگال کی تاریخ

میلیٹ (Malet)

سندھ کی تاریخ، ترجمہ برائے:

تاریخِ معصومی

گزٹیرز اور انسائیکلوپیڈیا (لغات و معارف)

یو۔ پی۔ ڈسٹرکٹ گزٹیر (ضلعی گزٹیر اترپردیش)

امپیریل گزٹیر

تھورنٹنز گزٹیر (Thornton's Gazetteer)

پنجاب سیٹلمنٹ رپورٹ (رپورٹ بندوبستِ اراضی پنجاب)

ابسٹن — پنجاب سینسس رپورٹ (مردم شماری رپورٹ پنجاب)، ۱۸۸۱ء

بنگال ڈسٹرکٹ گزٹیر (ضلعی گزٹیر بنگال)

این۔ ڈبلیو۔ پی۔ ڈسٹرکٹ گزٹیر (ضلعی گزٹیر شمال مغربی صوبہ)

سی۔ پی۔ ڈسٹرکٹ گزٹیر (ضلعی گزٹیر وسطی صوبہ / سینٹرل پرووِنسز)

میک گریگر — گزٹیر آف افغانستان

انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا (قاموسِ بریٹانیکا)

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (دائرۃ المعارف الاسلامیہ)

انسائیکلوپیڈیا آف انڈیا، بالفور، مدراس، ۴ جلدوں میں۔

انسائیکلوپیڈیا آف اینتھکس اینڈ ریلیجن (معارفِ اخلاقیات و مذاہب)

جرائد (علمی رسائل)

۱. جرنل، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ بریٹن اینڈ آئرلینڈ

جلد ۷ (۴۳-۱۸۴۱ء) صفحہ ۴۲؛ جلد ۲۰ (۱۸۸۸ء)، طرزِ تعمیر (فنِ تعمیر) پر مضامین؛ نیو سیریز جلد ۳ (۱۸۶۷ء) مضمون ۴، نیز صفحہ ۷۴۴ اور اس سے آگے؛ ۱۹۰۰ء صفحہ ۴۸۱؛ ۱۹۲۱ء صفحہ ۱؛ ۱۹۲۸ء بابر کی وفات پر مضمون؛ ۱۹۲۹ء صفحہ ۵۸۳؛ صد سالہ جلد (Centenary Vol) 1923ء۔

۲. جرنل آف بہار اینڈ اڑیسہ ہسٹوریکل ریسرچ سوسائٹی

جلد ۳ (۱۹۱۷ء)، صفحہ ۱۴۱ ۳ اور اس سے آگے؛ جلد ۵ (۱۹۱۹ء) صفحہ ۵۲ اور اس سے آگے؛ جلد ۱۱ (۱۹۲۶ء) صفحہ ۲۰۹ اور اس سے آگے؛ جلد ۱۲ صفحہ ۴۶۴ اور اس سے آگے؛ جلد ۱۴، ۱۵، سادات سلاطین (سید بادشاہوں) پر مضامین؛ جلد ۲۸ (۱۹۴۲ء) جونپور خاندان کے بادشاہ اور ان کے سکے، صفحہ ۲۸۳ اور اس سے آگےُ۔

۳. جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ

جلد ۱۵ (۱۸۴۶ء) صفحہ ۲۱۳ اور اس سے آگے؛ جلد ۴۱ (۱۸۷۲ء) سلطان علاؤ الدین کے مقبرے کا کتبہ؛ جلد ۴۰ (۱۸۷۱ء گکھڑ قبیلہ)؛ ۱۹۷۵ء کی جلد (راورٹی، افغانوں کا آغاز و نسب)؛ جلد ۴۷ (۱۸۷۸ء) صفحہ ۱۸۱؛ جلد ۱۷۱ (۱۹۰۲ء) صفحہ ۱۳۶؛ نئی جلد ۶ (۱۹۱۰ء) صفحہ ۲۳، ۵۶۵، ۶۵۱، ۶۹۱، ۶۹۸ سکوں پر؛ نئی جلد ۱۳ (۱۹۱۷ء) صفحہ ۱۴۷، ۲۶۹؛ نئی جلد ۱۶ (۱۹۲۰ء) صفحہ ۷۷؛ نئی جلد ۱۷ (۱۹۲۱ء) صفحہ ۱۶؛ نئی جلد ۷ (۱۹۱۱ء) صفحہ ۶۹۵؛ نئی جلد ۲۶ (۱۹۳۰ء) مسکوکات کا ضمیمہ (Numismatic Supp)؛ ۱۹۳۴ء جلد ۳۰ مسکوکاتی ضمیمہ؛ ۱۹۳۹ء، مسکوکاتی ضمیمہ، صفحہ ۱۱۹، مالوہ کے سلاطین کے بعض غیر مطبوعہ سکوں پر۔

۴. اپی گرافیا انڈو-موسلیمیکا، کلکتہ (Epigraphia Indo-Moslemica)

سال ۱۰-۱۸۰۹ء، صفحہ ۳۰، ہندوستان کے شائع شدہ کتبات (Inscriptions) کی فہرست۔

جلد ۲۰-۱۹۱۹ء، صفحہ ۱، دہلی میں سلطان سکندر لودھی کے کتبات۔

سال ۲۸-۱۹۲۷ء، صفحہ ۱، ملتان: اس کی مختصر تاریخ اور فارسی و عربی کتبات۔

سال ۳۴-۱۹۳۳ء، صفحہ ۲۷، لودھی اور مغل سلاطین کے عہد کے کچھ فارسی کتبات۔

۵. اسلامک کلچر (Islamic Culture)، حیدرآباد دکن

جلد ۲ (۱۹۲۸ء): قرونِ وسطیٰ کے دوران سماجی اور اقتصادی حالات، صفحہ ۳۶۰ اور اس سے آگے۔

جلد ۸ (۱۹۳۴ء): اسلام کا سیاسی نظریہ، صفحہ ۵۸۸ اور اس سے آگے۔

جلد ۹ (۱۹۳۵ء): خلافت اور بادشاہت، صفحہ ۵۸۰ اور اس سے آگے۔

(فتحِ اسلام سے پہلے ہندوستان میں مسلم آبادیاں، ملتان) صفحہ ۴۹۳ اور اس سے آگے۔

جلد ۱۰ (۱۹۳۶ء): اسلامی نظامِ حکومت کا آغاز، صفحہ ۴۹۲ اور اس سے آگے۔

خلافت اور بادشاہت، صفحات ۹۷، ۲۶۰ اور ۳۹۰۔

جلد ۱۹ (۱۹۴۵ء): سلطنتِ لودھی کے زوال میں ابراہیم لودھی کی ذمہ داری، صفحہ ۳۶۱ اور اس سے آگے۔

۶. انڈین ہسٹوریکل کوارٹرلی (Indian Historical Quarterly)، کلکتہ

جلد ۲ (۱۹۲۶ء): سلطنتِ بہمنیہ کا نظامِ حکومت، صفحہ ۶۹۰ اور اس سے آگے۔

جلد ۷ (۱۹۳۰ء): عہدِ قبل از مغل (مغلوں سے پہلے کے دور) جلد ۷ (۱۹۳۱ء): عہدِ قبل از مغل (مغلوں سے پہلے کے دور) میں سلطنتِ دہلی کا نظامِ حکومت، صفحہ ۴۱۔ جلد ۸ (۱۹۳۲ء): مغلوں کی فتوحات کی نوعیت، صفحہ ۲۷۹ اور اس سے آگے۔ جلد ۱۱ (۱۹۳۵ء): تیرہویں صدی میں بادشاہت اور امرا (اشرافیہ)، صفحہ ۲۲۳ اور اس سے آگے۔ جلد ۱۳ (۱۹۳۷ء): صفحہ ۴۳۲، ہندوستان میں اسلامی بادشاہت۔ جلد ۱۶ (۱۹۴۰ء): شیر شاہی پرگنے اور ان کے انتظامی افسران، صفحہ ۱۶۶ اور اس سے آگے۔ ۷. انڈین کلچر (Indian Culture)، کلکتہ جلد ۱: خاندانِ غلاماں کے تحت وزارت اور بادشاہت، صفحہ ۶۵۵ اور اس سے آگے۔ ۸. انڈین ہسٹوریکل ریکارڈز کمیشن، کارروائی (Proceedings) میسور، ۱۹۴۱ء، صفحہ ۱۰۸ اور اس سے آگے: تاریخِ الفی کے کچھ ہندوستانی مجموعے۔ ادے پور، ۱۹۴۴ء، صفحہ ۱۷-۱۹: بہار میں قانون گو کا عہدہ۔ اندور، ۱۹۴۶ء، صفحہ ۱۹-۲۰: برنی کا مسلم بادشاہت کا نظریہ۔ ۹. انڈین ہسٹری کانگریس کی کارروائی (Proceedings) کلکتہ، ۱۹۳۹ء، صفحہ ۱۲۷: قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان میں ہندو۔ کلکتہ، ۱۹۳۹ء، صفحہ ۲۶۰: شری چیتنیا کے اپنے ہم عصر مصلحین (اصلاح پسندوں) کے ساتھ تعلقات۔ الٰہ آباد، ۱۹۳۸ء، صفحہ ۳۰۸: سلطان سکندر لودھی کا کردار و سیرت۔ الٰہ آباد، ۱۹۳۸ء، صفحہ ۲۱۲: میواڑ کے رانا سانگا۔ حیدرآباد (دکن)، ۱۹۴۱ء، صفحہ ۳۲۲: ابتدائی دورِ سلطنت کی شاہی مجالس۔ کتابیات (Bibliography) حیدرآباد (دکن)، صفحہ ۳۶۴: روشنائیاں (روشنیا تحریک کے پیروکار)۔ حیدرآباد (دکن)، صفحہ ۳۷۷: مخزنِ افغانی کے علی گڑھ کے دو خطی نسخے (مخطوطات)۔ علی گڑھ، ۱۹۴۳ء، صفحہ ۲۹۳: روہیلوں کا آغاز و نسب۔ علی گڑھ، ۱۹۴۳ء، صفحہ ۳۹۷: سلطان سکندر لودھی کی تخت نشینی کے مقام پر ایک تحریر/نوٹ۔ علی گڑھ، ۱۹۴۳ء، صفحہ ۳۹۲: شیروانی (قبیلہ) اور تاریخ میں ان کا کردار۔ مدراس، ۱۹۴۴ء، صفحہ ۲۸۷: لودھی سلاطین کے عہدِ حکومت میں 'کول' (موجودہ علی گڑھ کا پرانا نام)۔ اناملائی، ۱۹۴۵ء، صفحہ ۱۴۶: تاریخِ میواڑ پر چند پہلو (اندرونی معلومات)۔ پٹنہ، ۱۹۴۶ء، صفحہ ۲۶۶: ڈاکٹر پی۔ سرن کا

صدارتی خطبہ۔ پٹنہ، ۱۹۴۶ء، صفحہ ۲۴۲: ریوا کا بگھیلا خاندان۔ پٹنہ، ۱۹۴۶ء، صفحہ ۲۴۵: سلطان حسین شاہ شرقی — ایک جائزہ / تخمینہ۔ ۱۰. مسلم ریویو (Muslim Review)، کلکتہ جلد ا: سلطان سکندر لودھی کا ایک فیصلہ / عدل۔ ۱۱. اپی گرافیا انڈیکا (Epigraphia Indica) جلد ۲ (۱۸۹۳ء): صوبہ دہلی کے اسلامی / محمدی کتبات۔ ۱۲. جرنل آف انڈین ہسٹری، مدراس جلد ۱۳، حصہ ا، اپریل ۱۹۳۴ء: سلاطینِ مغلیہ اعظم کا شاہی خزانہ، صفحہ ۱۵۹ اور اس سے آگے۔ جلد ۱۹، اگست ۱۹۳۵ء: مغلوں کا عسکری نظام، صفحہ ۲۰۵۔ جلد ۱۹، اگست ۱۹۳۵: (امپیریل ٹریژری آف دی گریٹ مغلز / عظیم مغلوں کا شاہی خزانہ)۔ جلد ۱۵، اپریل ۱۹۳۶: (ہندو ریلیجئس موومنٹس ان میڈیول ڈکن / قرونِ وسطیٰ کے دکن میں ہندو مذہبی تحریکیں)، صفحہ ۱۰۳ وغیرہ۔ مدراس، جلد ۲۴، ۱۹۳۵، صفحہ ۹۶: (اوریجن آف دی سینٹرل گورنمنٹ انڈر دی ٹرکش سلاطین آف دہلی / دہلی کے ترکی سلاطین کے تحت مرکزی حکومت کا آغاز)۔ ایضاً، ۱۹۳۷، جلد ۲۶، صفحہ ۱۵۱: (انفلوئنس آف اسلامک ٹریڈیشنز آن دی سلطنت آف دہلی / دہلی کی سلطنت پر اسلامی روایات کے اثرات)۔ ایضاً، ۱۹۳۸، جلد ۱۷، صفحہ ۳۲۵ وغیرہ: (سلطان بہلول لودھی؛ ان کی جائے وفات اور ان کے عہدِ حکومت کا دورانیہ)۔ تریویندرم، جلد ۲۷، ۱۹۴۸، صفحہ ۲۲۳: (سم مائنر ڈائنسٹیز آف ناردرن انڈیا / شمالی ہندوستان کے کچھ چھوٹے شاہی خاندان)۔ ۱۳. ایشیاٹک ریسرچز (Asiatic Researches) جلد ۲، صفحہ ۶۹: (ڈسکرپشن آف افغانس فرام دی جیوز / یہودیوں کی طرف سے افغانوں کا احوال)۔ جلد ۱۱، صفحہ ۳۶۷: (آن دی روشنیاز / روشنیا تحریک کے بارے میں)۔ ۱۴. انڈین اینٹیکویری جرنل (Indian Antiquary Journal) جلد ۴۱، ۱۹۱۲، صفحہ ۱۳: (اوریجن آف دی بھکتی اسکول / بھکتی مکتبۂ فکر کا آغاز)۔ ۱۵. نقشہ جات (Maps) رینلز بنگال اٹلس (Rennel's Bengal Atlas)۔ امپیریل اٹلس آف انڈیا، سرویئر جنرل آف انڈیا، کلکتہ۔ صفحہ ۲۷۹: کتابیات (BIBLIOGRAPHY) امپیریل گزٹیر، جلد ۲۶ (اٹلس)۔ ایلیٹ کی 'میموائرز آف دی ریسز آف این ڈبلیو پی' (Memoirs of the Races of N.W.P) میں شامل نقشے۔ جے آر ایس بی کلکتہ (J.R.S.B. Calcutta) میں شامل نقشے: جلد ۱۳ (۱۸۴۴)، صفحہ ۱۷۱ جلد ۵۳ (1884a)، صفحہ ۲۱۵ ۱۸۸۵a، صفحہ ۱۴۵ جلد ۵۸ b (1890)، صفحہ ۱۳۷ جلد ۶۱ (۱۸۹۰)، صفحہ ۱۷۴ اور ۴۸۰۔ ڈبلیو ہیگ (W. Haig): (کمپاریٹو ٹیبلز آف دی محمدن اینڈ کرسچن ڈیٹس / اسلامی اور عیسوی تواریخ کے تقابلی گوشوارے)۔ ضمیمہ (APPENDIX) افغانوں اور پٹھانوں کا آغاز (Origin of the Afghans and the Pathans) یہ موضوع اتنا وسیع اور ہمہ جہت ہے کہ یہاں چند صفحات میں اس کے ساتھ صحیح معنوں میں انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ مستشرقین (مغربی ماہرینِ شرقیات) کی آراء اور

افغانوں کے اپنے دعوے اس حد تک متضاد ہیں کہ اس نکتے پر کوئی بھی ایسا نتیجہ، جو ان کی وقت کی آزمائی ہوئی قدیم ترین روایات کے خلاف ہو، نہ صرف مسترد کر دیا جائے گا بلکہ اس پر سخت ناراضگی کا اظہار بھی ہو گا۔ جس طرح راجپوت سورج، چاند یا آگ سے اپنے نسب پر یقین رکھتے ہیں، اسی طرح تقریباً ہر افغان اور پٹھان خود کو بنی اسرائیل (اسرائیلی) مانتا ہے۔ وہ اس معاملے میں کس حد تک حساس اور زور دینے والے ہیں- اس کا اندازہ رامپور کے نواب عبد السلام خان کی کتاب 'نسبِ افغانہ' کے صفحات سے لگایا جا سکتا ہے۔ نواب صاحب نے ایک شاندار لائبریری قائم کی تھی- جس میں پٹھانوں کی تاریخ اور ادب کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا اور انہوں نے یہ تمام ذخیرہ حکومتِ افغانستان کے نام وقف کر دیا تھا (کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کا نسلی تعلق صرف وہاں کے لوگوں سے ہے)۔ خوش قسمتی سے یہ تحفہ ملک میں بچہ سقا کی طرف سے تخت پر ناجائز قبضے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بدامنی اور ہنگاموں کے باعث اپنی منزل تک نہ پہنچ سکا۔ یہ تمام ذخیرہ اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ انہوں نے اپنی پوری قوت اور اصرار کے ساتھ بارہا یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ افغان دراصل بنی اسرائیل ہیں۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ افغان بنی اسرائیل (اسرائیل کی اولاد) ہیں۔ بہر حال، یہ موضوع انتہائی دلچسپ ہے اور راجپوتوں کے نسب سے متعلق روایتی قصے کہانیوں سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ اس مسئلے کا متنازع پہلو اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب ہم یہ بات ذہن میں رکھتے ہیں کہ شاید ہی کوئی سے دو یورپی اسکالرز اس پر ایک جیسی رائے رکھتے ہوں۔ کچھ کا خیال ہے کہ افغان بنی اسرائیل ہیں، کچھ انہیں ایرانی اور ترک سمجھتے ہیں، کچھ کے نزدیک وہ کاکیشیائی، جارجیائی یا آرمینیائی ہیں؛ ابنِ خلدون نے ان کا نسب کلمیک (Kalmūks) قبیلے سے جوڑا ہے؛ کچھ ماہرین یونانی مورخین کی پیروی کرتے ہوئے انہیں اسی دھرتی کے مقامی باشندے قرار دیتے ہیں، کچھ کا ماننا ہے کہ وہ ان ہندوستانی آباد کاروں کی اولاد ہیں جو گندھارا میں آکر بس گئے تھے؛ کچھ کا دعویٰ ہے کہ وہ سکندرِ اعظم کے پیچھے رہ جانے والے یونانی سپاہیوں کی اولاد ہیں؛ فرشتہ نے 'مطلع الانوار' کی پیروی کرتے ہوئے ان کی شناخت ان قبطیوں (Copts) سے کی ہے جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف بغاوت کی تھی اور فرعون کا ساتھ دیا تھا جس کے نتیجے میں انہیں جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا، جبکہ ان کے البانوی (Albanian) نسل سے ہونے کے حامیوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ ان کے آغاز اور نسب کے بارے میں پیش کیے جانے والے نظریات کو (ان نظریات کو منہا کر کے جن کی سنجیدگی سے وکالت نہیں کی گئی) سائنسی بنیادوں پر درج ذیل طریقے سے ترتیب دیا جا سکتا ہے: مقامی آغاز کے حق میں: (ڈورن، ٹیٹ / Dorn, Tate) غیر ملکی نسب کے طور پر: جیسے عبرانی، ہندوستانی یا ایرانی۔ مخلوط نسب کے طور پر: جیسے ترکو-ایرانی یا انڈو-ایرانی (ہیگ /

Haig)۔ ترک، ایرانی اور ہندوستانی مخلوط نسل۔ جہاں تک ممکن ہو سکے گا میں اس کا تجزیہ کروں گا۔ (حاشیہ): ڈورن کا ترجمہ 'مخزن'، صفحہ ۷۱ پر نوٹس؛ ایم رابن (M. Raffin) ایشیا کے البانویوں (Albanians of Asia) سے ان کے آغاز کے پر جوش حامی تھے۔ دیکھیے پیریئر، ہسٹری آف دی افغانس (History of the Afghans)، صفحہ ۲-۱۔ مختلف نظریات کو تاریخی طور پر اور بغیر کسی تعصب کے (بیان کیا ہے)۔ لفظ 'افغانستان'، جس کا مطلب افغانوں کی سرزمین ہے، نسبتاً حال ہی کی ایجاد ہے اور یہ اٹھارویں صدی کے وسط میں اس وقت استعمال میں آیا جب احمد شاہ درانی کے ماتحت افغان، افغانستان میں غالب قوم بن گئے۔ یہ لفظ غیر ملکیوں نے افغانوں کی سرزمین کو ظاہر کرنے کے لیے وضع کیا تھا لیکن یہ اپنے معنی کے لحاظ سے گمراہ کن ہے۔ کیونکہ افغان ان بڑی اقوام میں سے محض ایک ہیں جو اس ملک میں آباد ہیں —جبکہ دیگر دو (بڑی اقوام) تاجک یا فارسی اور ترک یا تاتاری ہیں۔ افغان بذاتِ خود اپنے ملک کا نام کبھی 'افغانستان' نہیں لیں گے بلکہ وہ خود کو کابل، غزنی یا جلال آباد کا رہائشی کہیں گے، یا پھر پشتون یا پختون کہیں گے، یعنی وہ لوگ جو پشتو یا پختو زبان بولتے ہیں، اور وہ خود کو اس یا اس قبیلے کے رکن کے طور پر الگ پہچنوائیں گے۔ ہندوستان میں، لفظ 'افغان' اور 'پٹھان' بلا تفریق ایک ایسے طبقے کے لیے استعمال ہوتے ہیں جو پشتو بولتا ہو۔ حال ہی میں، افغنستان میں افغانوں اور پٹھانوں کے درمیان ایک فرق روا رکھا جا رہا ہے۔ پہلا لفظ (افغان) درانی نسل کے لوگوں کے لیے مخصوص ہے جن سے صرف یہودی اصل (نسل) منسوب کی جاتی ہے، اور دوسرا لفظ (پٹھان) ان لوگوں کے لیے ہے جو پشتو بولتے ہیں لیکن وہ مخلوط نسل سے ہیں۔ یہ فرق نیا ہے اور علمی یا تعلیمی حد تک ہی دلچسپی کا حامل ہے، اور اس کی وجہ اس اعلیٰ مقام کا غرور ہے جو درانیوں نے افغانستان میں ایک حکمران قوم کے طور پر حاصل کیا ہے۔ پشتو بولنے والے لوگ خود کو قندھاری اور پشاور کی بولیوں میں 'پشتانہ' (پشتون کی جمع) یا 'پختانہ' (پختون کی جمع) کہتے ہیں۔ ا۔ بیلو، افغانستان کی اقوام، ص ۵۶-۵۷۔ بالترتیب بولیاں ہیں۔ ان کا ملک جسے وہ اپنی گھریلو اصطلاح (مقامی زبان) میں 'پشتونخوا' یا 'پختونخوا' کہتے ہیں، دراصل 'روہ' کا ملک ہے، جس کی قطعی سرحد اتنی مبہم ہے کہ اس کی واضح تعریف ممکن نہیں۔ پشتو اور مغربی پنجابی میں 'روہ' کا مطلب 'کوہ' یعنی پہاڑ ہے (جس سے لفظ 'روہیلا' نکلا ہے، یعنی پہاڑی باشندہ) اور حقیقت میں اس سے مراد ایک پہاڑی ملک ہے جو بیلو اور دیگر مؤرخین کے مطابق سلیمان اور سفید کوہ کے پہاڑی سلسلوں کے تمام علاقوں پر مشتمل تھا، جو شمال کی طرف سوات اور پنجکوڑہ دریاؤں کے منبع سے لے کر نیچے جلال آباد تک پھیلا ہوا تھا۔ جنوب میں یہ کاکڑ علاقے پر مشتمل تھا جس میں برطانوی بلوچستان کے پشین اور شال کے اضلاع اور دریائے سندھ تک بوری وادی شامل تھی۔ اس کی مشرقی حد دریائے سندھ سے ملتی تھی، اور مغربی حد دریائے ہیلمند سے، جس میں غزنی کے جنوب میں

اراخوشیہ (Arachosia) اور زابل (مغربی افغانستان) شامل تھے۔ پشتو اور پختو بولنے والے لوگوں کے درمیان حدِ فاصل کوہاٹ میں خٹک علاقے کی شمالی سرحد اور ضلع پشاور کا جنوب مشرقی حصہ ہے۔ اس کے شمال میں پختو بولنے والے اور جنوب میں پشتو بولنے والے آباد ہیں۔ اس بحث سے پہلے کہ آیا افغانوں اور پٹھاناں کے درمیان کوئی فرق تسلیم کیا جا سکتا ہے، آیئے لفظ 'افغان' اور 'پٹھان' کے مختلف ماخذ پر بحث کرتے ہیں۔ نعمت اللہ اور دیگر پٹھان مؤرخین کے خیال میں لفظ 'افغان' کی ابتدا 'افغانہ' سے ہوئی ہے، جو طالوت (شاہِ ساؤل) کے پوتے تھے۔ نواب عبدالسلام نے اسے فریدوں کے زمانے کے ایک مشہور پہلوان 'اوغان' سے منسوب کیا ہے۔ ا۔ بیلو، افغانستان کی اقوام، ص ۶۰؛ ابٹسن، پنجاب کی مردم شماری رپورٹ، ۱۸۸۱ء، بعض مؤرخین کے مطابق یہ لفظ 'فغاں' (آہ و بکا / فریاد) سے نکلا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب قندھار اور کابل کے افغان، جو ہندوستانی سرحد پر اپنے ان بھائیوں کی مدد کے لیے گئے تھے جو اس وقت لاہور کے راجہ جے پال کے خلاف اپنا دفاع کر رہے تھے، اپنے گھروں کو لوٹے تو ان کے متجسس رشتہ داروں نے خطرے میں گھرے ہوئے بھائیوں کے بارے میں پوچھا۔ اس پر انہوں نے جواب دیا: "ان کے بارے میں مزید مت پوچھو، تمہیں بتانے کے لیے وہاں 'فغاں' (آہ و بکا) کے سوا کچھ نہیں ہے۔" بہت سے مستشرقین (مغربی ماہرینِ شرقیات) کے خیال میں لفظ 'پٹھان' کی ابتدا 'پکٹیانز' (Pictyans) سے ہوئی ہے، جنہیں ہیروڈوٹس (Herodotus) نے 'پکٹیایا' (Pictyaea) کے علاقے میں آباد دیکھا تھا۔ گریئرسن نے ٹوڈ (Tod) کی پیروی کرتے ہوئے اس کا ماخذ ہندوستان کے شہروں میں سے ایک شہر 'پیٹھان' (سنسکرت: پرتشٹھانا) میں تلاش کیا۔ فرشتہ نے اس کی وجہ ان کی 'پٹھنا' (Pathna) میں آباد کاری کو قرار دیا، اگرچہ اپنے محلِ وقوع اور آواز کے اعتبار سے 'پٹنہ' (Patna) اس کے لیے زیادہ مناسب جگہ ہوتی۔ دیگر لوگ اسے ہندی لفظ "پٹھان" (ہانکنا یا بھگانا) سے جوڑتے ہیں، کیونکہ انہوں نے وہاں کے مقامی باشندوں کو بھگا دیا تھا اور ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا؛ بعض کے نزدیک یہ عربی لفظ "فاتحان" (فتح کرنے والے) سے ہے؛ کچھ کے نزدیک یہ سلیمان کے پہاڑی سلسلے میں ان کے مسکن کی وجہ سے 'پشتہ' (ٹیلہ یا پہاڑی) سے ہے؛ بعض اسے قیس عبدالرشید کے بیٹے 'بطن' سے جوڑتے ہیں؛ کچھ کے نزدیک یہ 'پشت' سے ہے جو غور میں ایک جگہ کا نام مانا جاتا ہے؛ اور بعض کے نزدیک یہ "پٹنا" (اکھیڑ پھینکنا) سے ہے، جو سندھ ساگر دوآب میں اب بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے، کیونکہ انہوں نے اصل باشندوں کو بے دخل کر دیا تھا۔ مذکورہ بالا تمام دلائل محض آراء ہیں اور تاریخی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ لفظ 'پٹھان' اصل میں پشتون یا پختون ہی سے نکلا ہے۔ ا۔ حوالہ: حیاتِ افغانی، ص ۱۰۹۔ ۲۔ ایضاً (وہی کتاب)، ص ۱۰۵؛ بیلو، افغانستان کی اقوام۔

پشتون یا پختون ہی سے نکلا ہے، جس کی بگڑی ہوئی ہندوستانی شکل 'پٹھان' ہے۔ در حقیقت یہ نَامکَرَن (نام رکھنے کا طریقہ) خالصتاً ہندوستانی ہے اور یہ ان تمام اہل مغرب کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندوستان آئے تھے۔ ہندوستان کے کسی بھی فارسی مؤرخ اور نہ ہی بابر نے اپنی تزک (یادداشتوں) میں لفظ 'پٹھان' استعمال کیا ہے۔ پنجاب کی طرف عام بول چال میں انہیں 'روملا' (لفظ روہ سے) اور 'راشا' (جو پشتو میں خیر مقدم یا مروت کا ایک مختصر جملہ ہے) کہا جاتا ہے۔ شمالی ہندوستان سے لے کر بنگال تک، شلوار قمیص اور پاؤں میں چپل پہنے، ہاتھ میں ایک لمبی، موٹی اور گانٹھ دار لاٹھی لیے، کوئی اجنبی زبان یا عجیب و غریب لہجے میں ہندوستانی (اردو/ہندی) بولنے والے کسی بھی کڑیل اور لحیم شحیم شخص کو 'خان صاحب' کہہ دیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں مستقل آباد ہو جانے والے افغانوں کا عمومی لقب بھی یہی ہے۔ شاید اسی غلط فہمی کی وجہ سے مغلوں کی آمد سے قبل ہندوستان کے تمام (مسلم) خاندانوں کو 'پٹھان' قرار دے دیا گیا تھا۔ صحیح معنوں میں، یہ نام ان پشتو بولنے والے لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ہندوستان کی سرزمین پر آئے، اور اس کا اطلاق اس قوم پر ہوتا ہے جو افغانوں کے ساتھ بنی اسرائیل کی اولاد کے طور پر ایک مشترکہ نسل کا دعویٰ کرتی ہے۔ اگرچہ درانی افغان اس بات کو تسلیم نہیں کرتے، لیکن ہندوستانی پٹھان خود کو مغرب (افغانستان) میں رہنے والے اپنے بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ مہذب اور باثقافت قرار دیتے ہیں۔

'مخزنِ افغانی' کے مصنف، نعمت اللہ پہلے مؤرخ تھے جنہوں نے افغانوں کے لیے یہودی نسل کا دعویٰ کیا، جسے انہوں نے ایک باقاعدہ تیار شدہ شجرہ نسب کے ذریعے ثابت کیا، جسے وہ 'انتہائی قابلِ اعتماد کارندوں' کے ذریعے افغانستان سے منگوائے تھے؛ اس کی وجہ جہانگیر کے دربار میں ایرانی سفیر کا افغانوں کی اصل و نسل کے بارے میں کیا گیا ایک انتہائی تضحیک آمیز اور نازیبا تبصرہ تھا۔

ضمیمہ

افغانوں اور پٹھانوں کا آغاز و ارتقا (اصل نسل)

یہ اتنا وسیع اور بھرپور موضوع ہے کہ یہاں چند صفحات میں اس کے ساتھ ٹھیک طرح سے انصاف نہیں کیا جاسکتا۔ مستشرقین (مشرقی علوم کے ماہرین) کی آراء اور افغانوں کے اپنے دعوے اس قدر متضاد ہیں کہ اس نکتے پر کوئی بھی ایسا نتیجہ، جو مؤخر الذکر (یعنی افغانوں) کی دیرینہ اور معتبر روایات کے خلاف ہو نہ صرف مسترد کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس پر ناراضگی کا اظہار بھی ہو گا۔ جس طرح راجپوت سورج، چاند یا آگ سے اپنے نسب (پیدائش) پر یقین رکھتے ہیں۔ اسی طرح تقریباً ہر افغان اور پٹھان خود کو بنی اسرائیل (اسرائیلی) مانتا ہے۔ وہ اس نکتے پر کتنے حساس اور بضد ہیں - اس کا اندازہ رام پور کے نواب عبدالسلام خان کی کتاب 'نسبِ افغانہ' کے صفحات سے لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ایک شاندار لائبریری جمع کی تھی جس میں پٹھانوں کی تاریخ اور ادب کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا اور انہوں نے یہ تمام ذخیرہ حکومتِ افغانستان کو اس سوچ کے ساتھ وقف کر دیا تھا کہ ان کا نسلی تعلق صرف وہاں کے لوگوں کے ساتھ ہے۔ خوش قسمتی سے یہ تحفہ بچہ سقہ کے غصبِ تخت (حکومت پر زبردستی قبضے) کی وجہ سے ملک میں پیدا ہونے والی بدامنی کے باعث اپنی منزل تک نہ پہنچ سکا۔ یہ تمام ذخیرہ اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ انہوں نے اپنی پوری قوت اور اصرار کے ساتھ بار بار یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پٹھان / افغان بنی اسرائیل کی اولاد ہیں۔ بہرحال یہ موضوع انتہائی دلچسپ ہے اور راجپوتوں کے افسانوی آغاز و ارتقا سے بہت گہری مماثلت پیش کرتا ہے۔

اس مسئلے کا متنازعہ پہلو اس وقت اور بڑھ جاتا ہے - جب ہم یہ بات ذہن میں رکھتے ہیں کہ شاید ہی کوئی دو یورپی اسکالرز (ماہرین) اس بارے میں ایک جیسی رائے رکھتے ہوں۔ کچھ کا خیال ہے کہ افغان بنی اسرائیل کی اولاد ہیں، کچھ انہیں ایرانی اور ترک مانتے ہیں - کچھ کا کہنا ہے کہ وہ قفقازی (کوقافی)، جارجیائی یا آرمینیائی ہیں؛ ابنِ خلدون نے ان کا شجرۂ نسب قالموق (کلمیک) قبیلے سے جوڑا؛ کچھ ماہرین

یونانی مورخین کی پیروی کرتے ہوئے انہیں اسی دھرتی کے مقامی باشندے قرار دیتے ہیں- کچھ کا خیال ہے کہ وہ گندھارا میں آباد ہونے والے ہندوستانی نوآبادکاروں کی اولاد ہیں- کچھ کا ماننا ہے کہ وہ سکندرِ اعظم کے چھوڑے ہوئے یونانی سپاہیوں کی نسل سے ہیں- فرشتہ نے 'مطلع الانوار' کی پیروی کرتے ہوئے ان کی شناخت ان قبطیوں سے کی ہے جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف بغاوت کی تھی اور فرعون کا ساتھ دیا تھا جس کے نتیجے میں انہیں جلاوطنی جھیلنی پڑی، جبکہ ان کے البانوی نسل سے ہونے کے حامیوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ ان کے آغاز (اصل نسل) کے بارے میں نظریات کو—ان نظریات کو منہا کر کے جن کی سنجیدگی سے وکالت نہیں کی گئی—سائنسی بنیادوں پر درج ذیل طریقے سے ترتیب دیا جا سکتا ہے:

(۱) ان کے مقامی (اسی دھرتی کے) ہونے کے حق میں (ڈورن، ٹیٹ)؛ (۲) غیر ملکی نسل جیسے عبرانی، ہندوستانی یا ایرانی؛ (۳) مخلوط نسل جیسے ترک-توران یا ہند-ایران (ہیگ)؛ (۴) ترک، ایرانی اور ہندوستانی سب کا ملا جلا امتزاج۔ میں جہاں تک ممکن ہو سکے گا تجزیہ کروں گا...

مخزن کا ڈورن ترجمہ، صفحہ ۷۱ پر نوٹس؛ ایم رفین "ایشیائی البانویوں" سے ان کے آغاز کے بہت بڑے حامی تھے؛ دیکھیے پیریئر، ہسٹری آف دی افغانز، صفحہ ۱-۲۔

بالترتیب بولیاں (لہجے) ہیں۔ ان کا ملک جسے وہ اپنے گھریلو روزمرہ میں 'پشتونخوا' یا 'پختونخوا' کہتے ہیں، دراصل 'روہ' کا علاقہ ہے، جس کی درست سرحدیں اتنی مبہم ہیں کہ ان کا واضح تعین کرنا ممکن نہیں۔ پشتو اور مغربی پنجابی میں 'روہ' کا مطلب 'کوہ' یعنی پہاڑ ہے (جس سے لفظ 'روہیلا' نکلا ہے، یعنی پہاڑی باشندہ)۔ درحقیقت اس سے مراد ایک پہاڑی علاقہ ہے جو بیلیو اور دیگر ماہرین کے مطابق سلیمان اور سفید کوہ کے پہاڑی سلسلوں کے پورے علاقے پر مشتمل تھا، جو شمال کی طرف سوات اور پنجکوڑہ دریاؤں کے بالائی حصوں سے لے کر جلال آباد تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے جنوب میں کاکڑ کا علاقہ شامل تھا جس میں برطانوی بلوچستان کے پشین اور شال کے اضلاع اور دریائے سندھ تک بوری کی وادی آتی تھی۔ اس

کی مشرقی سرحد دریائے سندھ سے ملتی تھی، جبکہ مغربی سرحد دریائے ہلمند سے ملتی تھی جس میں غزنی کے جنوب تک اراخوشیہ (ارغنداب) اور زابل (مغربی افغانستان) شامل تھے۔ پشتو اور پختو بولنے والے لوگوں کے درمیان حدِ فاصل کوہاٹ میں خٹک کے علاقے کی شمالی سرحد اور ضلع پشاور کا جنوب مشرقی حصہ ہے۔اس حد کے شمال میں پختو بولنے والے رہتے ہیں،اور جنوب میں پشتو بولنے والے۔

اس بحث سے پہلے کہ کیا افغانوں اور پٹھانوں کے درمیان کوئی فرق تسلیم کیا جاسکتا ہے، آیئے لفظ 'افغان' اور 'پٹھان' کے مختلف ماخذات (اشتقاق) پر بحث کرتے ہیں۔ نعمت اللہ اور دیگر پٹھان مورخین کے نزدیک لفظ 'افغان' کی اصل 'افغانہ' ہے، جو طالوت (شاہِ ساؤل) کا پوتا تھا۔ نواب عبدالسلام نے اسے فریدون کے دور کے ایک مشہور پہلوان 'اوغان' سے منسوب کیا ہے۔

ا۔بیلیو، ریسز ان افغانستان (افغانستان کی اقوام)، صفحہ ٦٠؛ ابٹسن، پنجاب مردم شماری رپورٹ، ١٨٨١ء، صفحہ ١٦٦۔

کچھ ماہرین کے مطابق یہ لفظ 'فغاں' (آہ وبکا یانالہ وفریاد) سے نکلا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب قندھار اور کابل کے افغان—جو ہندوستان کی سرحد پر اپنے ان بھائیوں کی مدد کے لیے گئے تھے-جو لاہور کے راجہ جے پال کے خلاف اپنا دفاع کر رہے تھے—واپس اپنے گھروں کو لوٹے تو ان کے متجسس رشتہ داروں نے خطرے میں گھرے ہوئے بھائیوں کا حال پوچھا۔اس پر انہوں نے جواب دیا: "ان کے بارے میں مزید مت پوچھو، وہاں 'فغاں' (آہ وزاری) کے سوا بتانے کو کچھ نہیں ہے۔"

بہت سے مستشرقین (مشرقی علوم کے ماہرین) کا خیال ہے کہ لفظ 'پٹھان' کی اصل 'پکٹیانز' (Pictyans) سے ہے، جن کے بارے میں ہیروڈوٹس (یونانی مورخ) نے ذکر کیا تھا کہ وہ 'پکٹیایا' (Pictyaea) کے علاقے میں رہتے تھے۔ گریئرسن نے ٹوڈ کی پیروی کرتے ہوئے اس کی اصل ہندوستان کے ایک شہر 'پیٹھان' (سنسکرت: پرتشٹھانا) میں تلاش کی۔

فرشتہ نے اسے 'پٹھنا' میں ان کی آبادکاری کی وجہ سے پٹھان کہا، اگرچہ اپنے محلِ وقوع اور آواز کے اعتبار سے 'پٹنہ' اس کے لیے زیادہ موزوں جگہ ہوتی۔ دوسروں کے نزدیک یہ ہندی لفظ "پٹھان" (بھگانا یا ہنکانا) سے ہے، کیونکہ انہوں نے وہاں کے مقامی باشندوں کو نکال باہر کیا (بھگا دیا) اور ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا؛ کچھ کے نزدیک یہ عربی لفظ "فاتحان" (فتح کرنے والے) سے ہے؛ کچھ کے نزدیک یہ سلیمان کے پہاڑوں میں ان کے مسکن کی وجہ سے 'پشتہ' (ٹیلہ یا پہاڑی) سے نکلا ہے؛ کچھ اسے قیس عبدالرشید کے بیٹے 'بطن' (یا بیٹن) سے منسوب کرتے ہیں؛ کچھ کے نزدیک یہ 'پشت' سے ہے جو غور میں ایک جگہ کا نام مانا جاتا ہے؛ جبکہ کچھ اسے "پٹنا" سے جوڑتے ہیں جس کا مطلب 'جڑ سے اکھاڑنا' ہے اور یہ لفظ اب بھی سندھ ساگر دوآب میں استعمال ہوتا ہے، کیونکہ انہوں نے اصل باشندوں کو ان کی جگہوں سے بے دخل کر دیا تھا۔ مذکورہ بالا تمام دلائل محض آراء ہیں اور تاریخی کسوٹی پر پورا نہیں اترتے۔ دراصل لفظ 'پٹھان' کی اصل 'پشتون' یا 'پختون' سے ہے...

ا۔ حوالہ: حیاتِ افغانی، صفحہ ۱۰۹۔

۲۔ ایضاً (وہی کتاب)، صفحہ ۱۰۵؛ بیلیو، ریسز ان افغانستان (افغانستان کی اقوام)۔

تون (پشتون یا پختون) ہے جس کی بگڑی ہوئی ہندوستانی شکل 'پٹھان' ہے۔ درحقیقت یہ نَام مَسکن (نام رکھنے کا طریقہ) خالصتاً ہندوستانی ہے اور یہ ان تمام اہلِ مغرب (مغربی علاقوں کے لوگوں) کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندوستان آئے تھے۔ ہندوستان کے کسی بھی فارسی مورخ اور نہ ہی بابر نے اپنی یادداشتوں (تزکِ بابری) میں لفظ 'پٹھان' استعمال کیا ہے۔ پنجاب کی طرف عام بول چال میں انہیں 'روحلا' (روہ سے) اور 'راشا' (پشتو میں خیر مقدم یا مروت کا ایک مختصر جملہ) کہا جاتا ہے۔ شمالی ہندوستان سے لے کر بنگال تک، شلوار قمیص (گھیر دار پاجامہ) پہنے، پاؤں میں چپل، ہاتھ میں لمبی، موٹی اور گانٹھ دار لاٹھی لیے، اور کوئی اجنبی زبان یا عجیب لہجے میں ہندوستانی بولنے والا ہر کڑیل اور تندرست شخص 'خان صاحب' کہلاتا ہے۔ ہندوستان میں آباد ہونے والے افغانوں کا عمومی لقب بھی

یہی ہے۔ شاید اسی غلط فہمی کی وجہ سے مغلوں کی آمد سے قبل ہندوستان کے تمام (مسلمان) شاہی خاندانوں کو 'پٹھان' قرار دے دیا گیا تھا۔

اگر صحیح طور پر دیکھا جائے تو یہ نام ان پشتو بولنے والے لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ہندوستان کی سرزمین پر آئے، اور اس کا اطلاق اس قوم پر ہوتا ہے جو افغانوں کے ساتھ بنی اسرائیل کی اولاد کے طور پر مشترکہ نسل کا دعویٰ کرتی ہے۔ اگرچہ درانی افغان اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتے، لیکن ہندوستانی پٹھان خود کو مغرب میں رہنے والے اپنے رشتہ داروں کے مقابلے میں زیادہ مہذب اور باثقافت قرار دیتے ہیں۔

مخزنِ افغانی کے مصنف، نعمت اللہ وہ پہلے مورخ تھے جنہوں نے ایک بہترین ترتیب شدہ شجرۂ نسب کے ذریعے افغانوں کے یہودی نسل ہونے کا دعویٰ کیا، جسے وہ 'انتہائی قابلِ اعتماد نمائندوں' کے ذریعے افغانستان سے لائے تھے۔ اس کی وجہ جہانگیر کے دربار میں موجود ایرانی سفیر کی جانب سے افغانوں کے آغاز (اصل نسل) کے بارے میں کی جانے والی ایک انتہائی سخت اور توہین آمیز گفتگو بنی... جس میں اس نے افغانوں کو دیووں (جنوں) کی اولاد قرار دیا تھا۔ نعمت اللہ کے مطابق، افغان طالوت (شاہِ ساؤل) بن قیس کی نسل سے ہیں

-جو یعقوب (علیہ السلام) کی چوتھی نسل میں سے تھے۔

حوالہ: حیاتِ افغانی،

کہا جاتا ہے کہ ساؤل نے اپنے بڑھاپے میں سلطنت داؤد (علیہ السلام) کے حق میں چھوڑ دی اور کافر باغیوں کے خلاف لڑنے چلے گئے۔ انہوں نے اپنی دو بیویاں بھی جو امید سے تھیں -داؤد (علیہ السلام) کی دیکھ بھال میں دے دیں۔

یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ساؤل لڑتے ہوئے شہید ہو گئے - لیکن ان کی دونوں بیویوں نے، جیسا کہ انہوں نے پیشگوئی کی تھی - ایک ہی دن دو بیٹوں کو جنم دیا۔ ایک کا نام ارمیاہ (Arkhiyah) اور دوسرے کا نام

ارمیا (Armiyah) رکھا گیا۔ جب وہ بڑے ہوئے تو داؤد (علیہ السلام) نے ارمیاہ کو اپنی فوج کا سپہ سالار اور ارمیا کو اپنا وزیرِ اعظم بنا دیا۔ ارمیاہ کا انتقال ہوا تو انہوں نے 'آصف' نامی بیٹا چھوڑا اور ارمیا کا 'افغان' نامی بیٹا تھا۔

سلیمان (علیہ السلام) کے دورِ حکومت میں، جو داؤد (علیہ السلام) کے بعد آیا، آصف کو ان کے والد کی جگہ سپہ سالار اور افغان کو وزیرِ اعظم بنایا گیا۔ سلیمان (علیہ السلام) نے افغان کو یروشلم (بیت المقدس) کی عمارتوں، خاص طور پر وہاں کی مرکزی ہیکل (ہیکلِ سلیمانی) کی نگرانی پر مامور کیا۔ افغان ۴۰ بیٹوں کے باپ بنے - ان کی نسل اتنی حیرت انگیز تیزی سے بڑھی کہ انہوں نے شام اور فلسطین میں ایک غالب پوزیشن حاصل کرلی۔

بعد ازاں جب بابل کے بادشاہ بخت نصر (Nebuchadnezzar) نے فلسطین پر حملہ کیا اور یروشلم کو تباہ کیا (۵۸۶ قبل مسیح) تو وہ افغان کی نسل سے تعلق رکھنے والے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کو قیدی بنا کرلے گیا- اور انہیں میڈیا اور خراسان میں پراگندہ (صحرا نشین) کر دیا۔ بعد میں ان بارہ قبیلوں میں سے دو تو اپنے گھروں کو لوٹ گئے لیکن باقی دس قبیلوں نے مشرق کی طرف اپنی آوارہ گردی جاری رکھی اور غور کے پہاڑی علاقے میں آباد ہوگئے۔

پیغمبرِ اسلام محمد ﷺ نے کفر کے خلاف جنگ چھیڑی تو ان کے (افغانوں کے) رشتہ داروں میں سے ایک، خالد بن ولیدؓ (یعنی ایک اسرائیلی) اسلام کے کٹر مخالف رہنے کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کی جنگوں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان ہی خالدؓ نے غور سے اپنے رشتہ داروں کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔ اس کے نتیجے میں ۹ ہجری میں قیس (کیش) کی قیادت میں غور کے افغانوں کا ایک وفد مدینہ گیا اور اسلام قبول کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے قیس کو 'عبد الرشید' کا اسلامی نام عطا کیا۔

یہ عبد الرشید رسول اللہ ﷺ کے مقرب صحابی بنے اور فتحِ مکہ میں آپ ﷺ کی مدد کی، جہاں انہوں نے ۷۰ مکہ والوں کو ہلاک کر کے نام پیدا کیا۔ اس سے رسول اللہ ﷺ بہت خوش ہوئے اور اسلام کے لیے ان کی ناگزیر خدمات کے اعتراف میں انہیں 'بطن' کا لقب عطا کیا۔ جس کا مطلب نعمت اللہ کے مطابق عربی یا عبرانی میں 'کشتی کا پیندا یا بنیادی تختہ' ہے، اور ساتھ ہی 'ملک' (سردار) کا خطاب بھی دیا۔

جب یہ قیس عبد الرشید غور پہنچے تو انہوں نے اپنے ہم وطنوں میں اسلام پھیلانے میں مدد کی اور ۴۰ ہجری میں اپنی زندگی کے ۸۹ ویں سال میں وفات پائی۔ نعمت اللہ کا دعویٰ ہے کہ قیس طالوت سے ۳۷ ویں، ابراہیم (علیہ السلام) سے ۴۵ ویں اور آدم (علیہ السلام) سے ۶۳ ویں پشت پر ہیں۔ عبد الرشید نے خالد بن ولیدؓ کی صاحبزادی سارہ سے (جن سے انہوں نے شادی کی تھی) تین بیٹے چھوڑے، یعنی سڑبن، بیٹ (یا بطن) اور غرغشت، جن سے تمام پٹھان نسلیں چلی ہیں۔ نعمت اللہ کی فراہم کردہ اس فہرست کو محمد حیات خان نے اپنی کتاب 'حیاتِ افغانی' میں ایک معقول شکل میں پیش کیا ہے، جو میری نظر میں اب تک اس پیچیدہ تاریخ پر بہترین تصنیف ہے۔ ایک جدید پٹھان مؤرخ نے جنہوں نے حال ہی میں ایک کتاب لکھی۔ انتہائی عرق ریزی سے (شجرے کی) اس مفقود کڑی کو تلاش کیا۔ یعنی عبد الرشید کا حضرت آدمؑ تک کا نسبی تعلق فراہم کیا۔ عبد الرشید کی وفات کے بعد ان کی اولاد کو کوہِ سلیمان میں دیکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ بیان نہیں کی گئی۔ یہ روایت ہے کہ خلیفہ عبد الملک کے عہدِ حکومت میں حجاج بن یوسف کے ہاتھوں غور کی فتح کے بعد وہاں کے شاہی خاندان کا ایک شہزادہ، شاہ حسین غور سے فرار ہوا اور کوہِ سلیمان میں عبد الرشید کے بیٹے شیخ بیٹ (بطن) کے ہاں پناہ لی۔ میزبان نے ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور ان کے ساتھ اتنی شفقت اور مروت کا سلوک کیا کہ بیٹ کے بیٹے انہیں بھائی کہہ کر پکارنے لگے۔ بیٹ کی اہلیہ نے اپنے شوہر کو آمادہ کیا کہ وہ اس لڑکی کی شادی اس نوجوان سے کر دیں۔ ابتدا میں شیخ بیٹ نے ایک نامعلوم اور عامیانہ نسل کے اجنبی سے یہ رشتہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر شہزادے نے احتجاجاً کہا کہ وہ شاہی نسل سے ہے اور اپنی انگوٹھی پیش کرتے ہوئے درخواست کی کہ غور میں اس کے بارے

میں تحقیقات کروالی جائیں۔ چنانچہ بیٹ کے ایک کارندے کاغدور کو اس دعوے کی تصدیق کے لیے غور لایا گیا۔ واپسی پر اس نے شیخ بیٹ سے کہا کہ وہ سچ صرف اس شرط پر بتائے گا کہ اس کی شادی ان کی (دوسری) بیٹی بی بی ماہی سے کر دی جائے۔ (تصدیق کے بعد) شاہ حسین نے پہلے بی بی متو سے اور بعد میں بی بی ماہی سے شادی کر لی۔ وقت گزرنے کے ساتھ بی بی متو نے ایک بیٹے کو جنم دیا جس کا نام 'غل زوئے' رکھا گیا۔

بی بی متو کی وفات کے بعد۔

کچھ عرصے بعد بی بی ماہی نے ایک بیٹے کو جنم دیا جس کا نام سرواں رکھا گیا۔ (اس دوران) بی بی متو ایک دوسرے بیٹے کی ماں بن چکی تھیں جس کا نام ابراہیم تھا۔ یہ روایت ہے کہ جب شیخ بیٹ گرمیوں کے دوران اپنے پہاڑی مسکن پر منتقل ہوئے—جیسا کہ ہر افغان اور بلوچ سرحدوں پر کرتا ہے—تو انہوں نے اپنے پوتوں/نواسوں کی ذہانت کا امتحان لینے کے لیے اپنی اہلیہ سے روٹی پکانے کو کہا۔ ان کی اہلیہ نے تندور میں روٹیاں تیار کیں- جس کی آگ معجزانہ طور پر ۶-۷ ماہ بعد بھی روشن (زندہ) پائی گئی تھی۔ جب بیٹ نے کھانا کھانے کی خواہش ظاہر کی تو ابراہیم تیزی سے تندور کی طرف بھاگے اور بیٹ کے لیے گرم گرم روٹیاں لے آئے۔ لڑکے کی اس دانشمندی اور پھرتی نے بیٹ کو بہت خوش کیا، اور انہوں نے ابراہیم سے مخاطب ہو کر کہا: "ابراہیم لوئے دے" (ابراہیم تم بڑے ہو)۔ اس واقعے کے بعد سے ابراہیم کو "لودھی" کہا جانے لگا اور وہ آگے چل کر لودھی افغانوں کے جدِامجد بنے۔ یہ (بھی دعویٰ کیا جاتا ہے) کہ پٹھانوں یعنی قیس عبدالرشید کی اولاد نے سندھ، ملتان اور سیستان کی فتح میں عربوں کی مدد کی تھی، اور جب غوریوں کے تحت پہلا 'قومی خاندان' قائم ہوا تو انہوں نے اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ اپنے یہودی اصل (نسل) کے حق میں پٹھانوں کے دیگر ذیلی دعوے درج ذیل ہیں: یہ کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے افغانوں نے حبشہ کے بادشاہ ابرہہ کی اس وقت مدد کی تھی جب اس نے غور سے لائے گئے ہاتھیوں کے ساتھ مکہ کا محاصرہ کیا تھا۔ یہ کہ عربوں کے درمیان افغانوں کو 'سلیمانی' کہا جاتا ہے، جو کہ حضرت سلیمانؑ

کی نسل سے ان کے تعلق کے اعتراف میں ہے۔ یہ کہ نادر شاہ کی ہندوستان سے واپسی کے موقع پر، یوسف زئیوں نے اسے عبرانی زبان میں لکھے ہوئے صحائف اور مقدس کتابیں پیش کی تھیں۔ یہ کہ پشتو زبان شیاطین (جنوں) نے حضرت داؤدؑ کو سکھائی تھی تا کہ وہ ان معاملات میں غور و فکر کر سکیں جن میں رازداری درکار ہو۔ یہ کہ پٹھانوں میں کثرت سے پائے جانے والے یہودی ذاتی نام اور مقامات کے نام، جیسے داؤد، یوسف، سلیمان، یعقوب، اسرائیل، دشتِ لوط، تختِ سلیمان اور قلعہ یہودی، ان کے یہودی نسل ہونے کا ثبوت ہیں۔ یہ کہ افغان اور پٹھان یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں، اور پھر بھی خود کو بنی اسرائیل کہلانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ کہ صرف یہودی قوم کو ہی محمد ﷺ کی آمد کی بشارت دی گئی تھی، لہٰذا جو لوگ غور سے مدینہ گئے تھے - وہ لازمی طور پر یہودی ہی رہے ہوں گے۔ یہ کہ اگر وہ یہودیوں کی اولاد نہیں ہیں، تو پھر (بنی اسرائیل کے) وہ دس گمشدہ قبیلے کہاں گئے؟ یہ کہ ان کے پاس اپنی اصل اور شاخوں کے بارے میں ایسے شجرہ جاتی ثبوت موجود ہیں جو نسل در نسل زبانی منتقل ہوتے رہے ہیں، اور وہ کسی بھی تحریری تاریخ کی طرح مستند ہیں۔ تاسف کے ساتھ، جب ان دعووں کا تاریخی طور پر جائزہ لیا جائے تو یہ تنقید کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ، اگر افغانوں کے شجرہ نسب اور ان کی اصل کو سچ مان بھی لیا جائے، تب بھی طالوت (ساؤل) جن کا نسب یعقوبؑ سے ملتا تھا، وہ یہودی نہیں تھے۔ پروفیسر ڈاسن کے مطابق، ساؤل کا تعلق 'بن یامین' کے قبیلے سے تھا۔ عہد نامہ قدیم (تورات) میں طالوت کے بیٹوں کے طور پر ارمیاہ (Arkhiyah) اور ارمیا (Armiyah) کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ساؤل کے چار بیٹے تو (دشمنوں سے) معرکے میں مارے گئے تھے — ضمیمہ (APPENDIX)- کافروں کے ساتھ معرکے میں ان کے ہمراہ ہلاک ہو گئے تھے۔ داؤد (علیہ السلام) نے جب ساؤل کی اولاد کا احسان چکانا چاہا، تو انہوں نے بڑی مشکل سے ساؤل کے واحد زندہ بچ جانے والے لنگڑے بیٹے کے ایک بیٹے کو تلاش کیا جس کا نام یوناسم تھا۔ داؤد (علیہ السلام) کے سپہ سالار کا نام یوآب (Y'ad) ابن صرویا (Saniya) تھا۔ بنی اسرائیل کے معززین میں ارمیاہ (Arkhiyah) اور ارمیا (Armiyah) نامی

شخصیتوں کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ مزید بر آں سلیمان (علیہ السلام) کا 'افغان' نامی کوئی سپہ سالار نہیں تھا، جس سے نعمت اللہ اور دیگر مؤرخین اپنی قوم کے نام کا سراغ لگاتے ہیں۔ سلیمان (علیہ السلام) کے ہاتھوں یوآب کے قتل کے بعد، بنایاہ (Banaya) ابن یہویادع (Yahuda) سپہ سالار بنے تھے۔ بائبل کی 'کتاب السلاطین' (Book of Kings) میں جہاں یروشلم کی تعمیر کا احوال دیا گیا ہے، وہاں تعمیراتی کاموں کے نگران کے طور پر 'افغان' کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اگر افغانوں نے اتنی بڑی عددی قوت حاصل کرلی ہوتی، تو دیگر اسرائیلی قبیلوں کے ساتھ ان کا ذکر ضرور ہونا چاہیے تھا۔ اگر افغان بنی اسرائیل کے ان دس گمشدہ قبیلوں کی اولاد ہیں جنہیں بخت نصر نے منتشر کر دیا تھا، تو ان کے نسب کا سراغ محض ایک فرد یعنی قیس عبدالرشید سے لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ عبدالرشید محض ایک افسانوی شخصیت ہیں۔ اگر انہوں نے اتنا اہم کردار ادا کیا ہوتا جتنا کہ ان سے منسوب ہے، یا اگر وہ رسول اللہ ﷺ کے مقرب صحابی ہوتے، تو سیرتِ نبوی ﷺ کی کتابوں میں ان کا ذکر ضرور ہوتا یا وہ روایات میں زندہ رہتے۔ یہ کہنا ایک انتہائی کمزور دلیل ہے کہ ان کا نام اس لیے شامل ہونے سے رہ گیا کیونکہ احادیث و روایات کی جمع و تدوین کا آغاز عباسی خلفاء کے دور میں ہوا تھا۔ مزید یہ کہ، عربی یا عبرانی کی کسی بھی لغت میں 'بطن' یا 'پٹھان' کا لفظ موجود نہیں ہے جس کے معنی کشتی کا پیندا یا پتوار ۔۔۔ (۱) حوالہ: حیاتِ افغانی، ص ۱۰۸۔

میرا نہیں خیال کہ افغانستان کے پہاڑوں میں ایسی کوئی چیز (یہودی آثار) موجود ہے - ان کا نادر شاہ کو عبرانی زبان میں لکھے ہوئے صحائف پیش کرنا - پشتو زبان کے آغاز کی کہانی اور دیگر دعوے بھی اسی طرح لغو (بے بنیاد) ہیں۔ انہیں 'سلیمانی' حضرت سلیمانؑ کی نسل سے ہونے کے اعتراف میں نہیں کہا جاتا، بلکہ کوہِ سلیمان (سلیمان کے پہاڑوں) میں ان کی رہائش اور قیام کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ مقامات اور افراد کے ناموں میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے - یہ خالصتاً اسلامی نام ہیں۔ ان کا شجرہ نسب من گھڑت ہے۔ یہاں تک کہ بیلو (Bellew) اور تھورنبرن (Thornburn) بھی اس کے من گھڑت ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔ ٹیٹ (Tate) کا خیال ہے کہ یہ شجرہ نسب پندرہویں صدی میں اس وقت تیار کیا گیا

تھا جب ہندوستان پر ان کے ایک قومی خاندان (لودھی سلطنت) کی حکومت تھی۔ یہ بات بالکل ممکن ہے کہ یہودی نسل کا یہ دعویٰ سیستان پر عربوں کے غلبے کے دور میں کیا گیا ہو - جس کی سرحدیں تب ویسی نہیں تھیں جیسی اب ہیں اور اس میں یقیناً افغانستان کا ایک بڑا حصہ شامل رہا ہو گا۔ پٹھانوں نے یہ کہانی صرف اس لیے وضع کی تا کہ وہ سامی نسل ہونے یا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنے تعلق کے دعوے پیش کر کے عربوں سے اچھے سلوک کے حقدار بن سکیں، کیونکہ امویوں کے دور میں ایرانیوں اور غیر عربوں کو ایک ادنیٰ مقام پر دھکیل دیا گیا تھا اور انہیں 'موالی' (آزاد کردہ غلام / غیر عرب مسلم) سمجھا جاتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ جو شجرہ نسب دو تین ہزار سال تک زبانی منتقل ہوتا رہا ہو، اس میں غلطیوں اور لایعنی باتوں کا بھرپور ہونا لازمی ہے۔ اپنے مشاہدات کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے، تاریخی طور پر ان کے اسرائیلی (یہودی) نسل سے ہونے میں اب تک کوئی سچائی نہیں ہے اور قیس عبدالرشید زیادہ سے زیادہ ایک افسانوی ہیرو ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ بالکل ویسا ہی من گھڑت ہے جیسا کہ بلوچوں کا یہ دعویٰ کہ وہ امیر حمزہؓ کی اولاد ہیں۔ لیکن افغانوں کی جسمانی بناوٹ، رہن سہن اور رسم و رواج سے متعلق کچھ اور ایسی باتیں بھی ہیں جنہیں خود ان لوگوں نے پیش کیا ہے اور یورپی لکھاریوں نے بھی ان کے یہودی نسل ہونے کے حق میں ان کی تائید کی ہے۔ یہودیوں کی طرح افغانوں کے چہرے بھی بھاری اور نمایاں ہوتے ہیں - بھوئیں گھنی، ناک عقابی (طوطے کی طرح مڑی ہوئی) اور کبھی کبھار داڑھی سرخ ہوتی ہے۔ عورتیں یہودیوں کی طرح خوبصورت اور سرخ و سفید رنگت والی ہوتی ہیں اور سیاہ لباس پسند کرتی ہیں۔ ان میں بڑی تعداد میں چوڑے یا گول سر والے (brachy-cephalic) لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان کا قومی لباس ڈھیلی ڈھالی قمیص کے ساتھ گھیر دار شلوار اور پاؤں میں چپل پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کی سود خوری کی عادت۔ ان کا قومی مزاج اور عادتیں، جس کے لیے میں بیلو کی کتاب 'افغانستان کی اقوام' کے صفحہ ۶۰ کا حوالہ دیتا ہوں، جس کا ذکر میلسن نے (اپنی کتاب افغانستان میں)، ابٹسن نے 'پنجاب کی مردم شماری رپورٹ ۱۸۸۱ء' (صفحہ ۲۰۰) اور بالفور نے 'انڈین انسائیکلوپیڈیا' (جلد ۴، صفحہ ۴۵۲) میں کیا ہے۔ منگنی اور شادی

کے درمیان کسی فرق کو نہ ماننا (یعنی منگنی کو ہی شادی کی طرح پکا سمجھنا)۔ یہودیوں کی طرح ایک رسم کے تحت چھوٹے بھائیوں کا اپنے بڑے بھائی کی بیوہ سے شادی کرنا، جسے قانون جیسی حیثیت حاصل ہے۔ اپنے ہی قبیلے یا خاندان کے اندر شادی کرنے کا رواج؛ کسی غیر مرد سے بیٹی کی شادی کرنا باعثِ ننگ و عار (بے عزتی) سمجھا جاتا ہے۔ یہودیوں کے 'عیدِ فصح' (Pass-Over) نامی تہوار کو منانا، جسے وہ 'عیدِ فسخ' کہتے ہیں۔ کسی مصیبت یا بلا کو ٹالنے کے لیے بھیڑ یا بکری کی قربانی دینا اور اس کے خون کو دروازوں پر لگانا۔ جائداد کی وقت فوقتاً (میعاد کے بعد) تقسیم۔ اولیاء اللہ کے مزارات اور بزرگوں کے مقبروں کے لیے انتہائی گہری عقیدت۔ ہونے والے سسر کی خدمت کرنے کا رواج (جیسے حضرت یعقوبؑ نے شادی سے پہلے اپنے سسر کے ریوڑ سات سال تک چرائے تھے)۔ ان کا یہ عقیدہ کہ قیامت کے دن ظالم شخص اپنے سر پر جلتا ہوا تندور اٹھائے ہوئے اٹھے گا۔ ایک رسم جو اب ختم ہو رہی ہے - جس میں گناہوں کا بوجھ ایک نوجوان بچھڑے پر ڈال کر اسے ویرانے کی طرف ہانک دیا جاتا ہے۔ میٹھی روٹی (ملیدے یا حلوے) کے ساتھ فاتحہ خوانی کا رواج۔ زناکاروں اور گستاخوں (مذہب کی توہین کرنے والوں) کو سنگسار (رجم) کرنے کا رواج۔ چوڑے یا گول سر اور اونچی ناک کا ہونا ان کے یہودی نسل ہونے کا حتمی ثبوت نہیں ہو سکتا - اور الجفالوی (Ujfalvy) کے مطابق یہ خصوصیات کشن (Kushana) بادشاہوں کے سکوں پر بنے ان کے چہروں کے مہروں میں بھی نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں۔ قربانی کے جانور کا خون دروازوں پر لگانا مسلمانوں میں ایک عام رواج ہے، قطع نظر اس کے کہ ان کا پس منظر یہودی ہے یا نہیں؛ میں نے خود بنگال کے بہت سے گھروں میں، بشمول اپنے گھر کے، یہ رواج دیکھا ہے۔ لیکن ایک دلیل ایسی ہے - جس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ وہ جو زبان بولتے ہیں، یعنی پشتو، اسے زبانوں کے ایرانی گروہ کی ایک شاخ مانا جاتا ہے۔ یہ ایک مخلوط زبان ہے - جو جدید فارسی، پہلوی، قدیم ژند (Zend) اور پراکرت پر مشتمل ہے، جبکہ مذہبی معاملات میں اس میں عربی شامل ہے۔ الفنسٹن نے اس میں ۲۱۸ غیر ملکی الفاظ کا سراغ لگایا جو فارسی، سنسکرت، ہندوستانی، عبرانی، بابلی — یونانی اور جارجیائی (زبانوں سے لیے گئے ہیں)۔ محمد حیات

خان نے اس میں چند پنجابی الفاظ بھی پائے ہیں۔ چنانچہ ہند-ایرانی خاندان سے تعلق رکھنے والی زبان کسی سامی قوم کی زبان نہیں ہو سکتی۔ پٹھانوں اور یہاں تک کہ نام نہاد خالص افغانوں کا یہ استدلال کہ وہ دوسری اقوام کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے اپنی عبرانی زبان بھول گئے، متبادل اور قائل کرنے والا معلوم نہیں ہوتا۔ پٹھان خود کہتے ہیں کہ انہوں نے گروہوں کی شکل میں ہجرت کی تھی۔ لہٰذا ان کے لیے باپ، ماں اور بھائی جیسے عام الفاظ بھول جانے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ یہ کہنا کہ ہندوستان میں پٹھان، ہندی یا فارسی بولنے والوں کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے پشتو بھول گئے، ان کے عبرانی زبان بھول جانے سے کوئی مطابقت یا مشابہت نہیں رکھتا۔ جس وقت افغانوں نے ہندوستان میں ایک قومی بادشاہت قائم کی، اس وقت پشتو محض ایک بول چال کی زبان تھی، جس کی صرف ایک ہی تحریری کتاب موجود تھی۔ یعنی ۱۴۱۷ء میں شیخ ملی کی لکھی ہوئی 'تاریخِ یوسف زئی'۔ مزید بر آں، ان کے ہاں اور پٹھانوں میں بھی حالیہ دور تک تحریر اور دربار کی زبان فارسی ہی تھی۔ اب بھی پشتو، صاحبِ ادب زبان ہونے کے باوجود، مروت یا شائستہ گفتگو کے اظہار کے معاملے میں اتنی مالامال نہیں ہے۔ اگر پٹھان یہودیوں کی اولاد ہوتے، تو ان میں ایک غلام بنائی گئی قوم کی عادات اور خصوصیات پیدا ہو جاتیں۔ لیکن وہ اس کے بالکل برعکس ہیں؛ وہ نڈر، جنگجو، جفاکش اور آزادی پسند ہیں۔ (۱) حیاتِ افغانی۔ (۲) پشتو میں: پلار (باپ)؛ مور (ماں)؛ ورور (بھائی)۔ (۳) حوالہ: حیاتِ افغانی، ص ۱۱۵۔ ضمیمہ (APPENDIX - 297) اب اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ وہ اصل میں کون ہیں، ہیروڈوٹس کا 'پکٹیان' (Pictyean) قوم کا ذکر کرنا جو 'پکٹی کا' (Pictyca) میں آباد تھی اور چار شاخوں میں تقسیم تھی: اپورتے (جن کی شناخت افریدی کے طور پر کی گئی ہے)، ستیاگودان (خٹک)، دادیکے (دادی) اور گندھاریو (گندھاری)، تو یہ چیز انہیں اسی دھرتی کے سپوت (مقامی باشندے) ثابت کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ 'پکٹیان' کا تعلق کس نسل سے تھا۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ جدید افغانستان کے خطے پر طویل عرصے تک مقدونیائیوں (یونانیوں) کا غلبہ رہا- موریہ خاندان کے تحت ہندوستانیوں کا اثر رہا جنھوں نے اپنے پیچھے بہت سی بدھ مت کی نشانیاں

چھوڑی ہیں، پارتھیوں کا اور بعد میں آٹھویں صدی عیسوی تک ساکا قوم کا تسلط رہا- چنانچہ افغان اور پٹھان ترک-ایرانی نسل کی ایک مخلوط قوم ہیں، جس میں ہندوستانی خون کی بھی ایک بڑی آمیزش ہے۔بی بی متو کے ساتھ شاہ حسین کی کہانی اور خواتین کی شاخ کے ذریعے ان کی اصل کا دعویٰ، پٹھان قبیلوں میں سب سے بڑے قبیلے یعنی غلجیوں کی مخلوط نسل ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔ لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ہر پشتو بولنے والا شخص افغان نہیں ہے- اگرچہ ہر افغان پشتو بولنے والا ضرور ہے۔پٹھانوں کا یہ ملغوبہ (مجموعہ) دراصل ایک ہی زبان بولنے والے، ایک ہی مذہب پر عمل کرنے والے اور کچھ مشترکہ سماجی رواج رکھنے والے لوگوں کے گروہ کا ایک عمومی نام ہے-اس حیثیت سے یہ خون کے لحاظ سے نہیں بلکہ زبان کے لحاظ سے ایک قوم ہے۔کچھ قبیلے الحاق، وابستگی اور طرزِ عمل کے مشترکہ ضابطے پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے افغان بنے ہیں۔ چنانچہ غلجی ایک مخلوط قوم ہیں جس میں ترک عنصر کا غلبہ ہے، اور غلجی— مانا جاتا ہے کہ یہ لفظ 'خلچی' (Rhilchi) سے نکلا ہے، جو تلوار باز کے لیے ایک ترکی مترادف ہے، اور یہ خود 'خلج' (تلوار) سے ماخوذ ہے۔ ہزارہ قوم پیدائشی طور پر تاتاری ہے، جو مغربی ہندوکش میں بلخ، ہرات اور قندھار کے درمیان پائی جاتی ہے، اور یہ سادہ سی حقیقت کہ پٹھانوں میں کچھ سید قبائل بھی موجود ہیں، حتمی طور پر ان کی مخلوط نسل (مختلف اقوام کا ملاپ) ہونے کو ثابت کرتی ہے۔ اگر افغانوں اور پٹھانوں کا عبرانی (یہودی) نسل سے ہونا تاریخی طور پر ثابت نہیں ہوتا، تو 'خالص افغانوں' یعنی درانیوں کے اس دعوے کو تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ (ہی صرف) یہودیوں کی اولاد ہیں۔ (۱) کابل اور قندھار میں غلجیوں (Ghilzais) کا سرکاری تلفظ 'غلجی' (Ghaleji) ہے۔(۲) اشترانی (Ushtarani) ایک سید قبیلہ ہے جو شیرانی قبیلے سے منسلک ہے۔

☆☆☆





Nadia Umber lodhi

Nadia Umber Lodhi is a multi-talented Pakistani author, journalist, poetess, short-story writer, translator , novelist and critic.She authored seven books. Based in Islamabad, She is a strong voice in contemporary Urdu literature and serves as the resident editor for the British-Pakistani newspaper Khabrain Manchester UK.

Dr Abdul Halim

Abdul Halim1905–1972) was Historian and musicologist. He Earned his MA from Dhaka University in 1927 and a PhD from Aligarh University in 1938 under Sir Jadunath Sarkar. He returned to Dhaka University as Professor and Head of History in 1948. Dr Abdul Halim was also recognised a scholar on classical music. His Short History of Indo-Pak Music is an important contribution to the history of music.

Dr A Halim

مترجم

نادیہ عنبر لودھی

Nadia Ambar Lodhi